بہارِ نَو

مجموعہ خطبات و مقالات

پرویز

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) ۲۵ بی گلبرگ ۲ . لاہور

جُملہ حقوق محفوظ

کتاب ———— بہارِ نو
مصنّف ———— پرویزؒ
ایڈیشن ———— دوسرا ۱۹۹۶ء بلا ترمیم
ناشر ———— طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)
۲۵۔بی گلبرگ II۔ لاہور ۱۱
طابع ———— خالد منصور نسیم
مطبع ———— النّور پرنٹرز و پبلشرز
۲/۳ فیصل نگر ملتان روڈ۔ لاہور
صفحات ————
قیمت ————

فہرست مشمولات

۱ —	یورپ کا واویلا	۱
۲ —	مثالی مملکت	۲۶
۳ —	قائدِ اعظمؒ اور اسلامک آئیڈیالوجی	۴۵
۴ —	قائدِ اعظمؒ کا پاکستان	۵۹
۵ —	پاکستان کس نے بنایا ؟	۷۴
۶ —	جنگ اور انسان	۹۷
۷ —	بنیادی حقوقِ انسانیّت اور قرآن	۱۲۱
۸ —	ہم میں کیریکٹر کیوں نہیں	۱۴۷
۹ —	وحدتِ ملّت	۱۷۲
۱۰ —	اولیاءُ اللہ کون ہیں	۱۹۹
۱۱ —	قیامتِ موجود	۲۱۱
	(دین اور مذہب کی کشمکش)	
۱۲ —	حضرت مسیحؑ کی انقلاب آفریں تعلیم	۲۳۶
۱۳ —	حضور رسالت مآبؐ کی کہانی، خدائے برتر کی زبانی	۲۴۳
۱۴ —	اسلامی مملکت کے سربراہ کی معاشی ذمّہ داریاں	۲۶۶
۱۵ —	اسلامی آئین کے بنیادی اصول	۲۹۲

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ

یورپ کا واویلا

طلوعِ اسلام کنونشن کی ایک تقریر

(مئی ۱۹۶۱ء)

دبا رکھا ہے اس کو زخمہ ور کی تیز دستی نے
بہت نیچے سُروں میں ہے ابھی یورپ کا واویلا

جب یورپ میں انسانی شعور نے آنکھ کھولی تو اُس نے دیکھا کہ زندگی کے ہر شعبہ پر ایک مذہب مسلّط ہے جسے عیسائیت کہا جاتا ہے۔ (واضح رہے کہ یہ مذہب وہ نہیں تھا جو اللہ کی طرف سے حضرت عیسیٰؑ کو ملا تھا۔ یہ وہ مذہب تھا جسے بعد میں انسانوں نے خود وضع کر کے اس کی نسبت حضرت عیسیٰؑ کی طرف کر دی تھی) یہ مذہب علم و بصیرت کا دشمن، عقل و فکر کا حریف اور سائنٹفک ریسرچ کے راستے میں سب سے بڑی روک تھا۔ دنیا سے نفرت اور ہر مادّی علائق سے قطع تعلّق، اس کی تعلیم کے بنیادی ستون تھے۔

عیسائیت سے بغاوت

ظاہر ہے کہ اس قسم کا مذہب اُس وقت تک تو چل سکتا ہے، جبتک انسان علم و عقل سے کام نہ لے۔ لیکن جب وہ عقل و بصیرت سے کام لینے لگے، اور زندگی کے میدان میں آگے بڑھنا چاہے تو پھر وہ ایسے مذہب کی راہ نمائی کبھی قبول نہیں کر سکتا۔ اس ضمن میں مغرب کا مشہور مفکّر، وہائٹ ہیڈ، اپنی کتاب (ADVENTURES OF IDEAS)

میں رقمطراز ہے کہ

انجیل میں جس قسم کا اخلاقی ضابطہ دیا گیا ہے اُسے اگر موجودہ معاشرہ میں نافذ کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ فوری موت کے سوا کچھ نہ ہو گا۔

اور تہذیب کا مؤرخ (DORSEY) اپنی کتاب (CIVILIZATION) میں لکھتا ہے:۔

آج لاکھوں انسانوں کے نزدیک عیسائیت شکست خوردوں کا مذہب ہے۔ وہ اس مذہب کی قبولیت سے اعترافِ شکست کرتے ہیں۔ یہاں کوئی شے قابلِ اطمینان نہیں۔ اس میں اطمینان کی آرزو باطل، اور آرزوؤں کی تکمیل گناہ ہے۔ یہ اندازِ نگاہ، صحیح اور تندرست زندگی کو ناممکن بنا دیتا ہے۔ اس سے انسانیت تباہ ہو جاتی ہے۔

شعور کی بیداری کے بعد اس قسم کے مذہب کے خلاف ردِّ عمل لازمی تھا۔ یہ ردِّ عمل ہوا اور اسی شدّت کے ساتھ ہوا جس شدّت سے اس سے پہلے ان پر مذہب مسلّط تھا۔ لیکن جیسا کہ غصّے اور انتقام کے جذبات کے تابع ہوا کرتا ہے، ان لوگوں سے یہ غلطی ہوئی کہ ان کا ردِّ عمل عیسائیت کے بجائے خود نفسِ مذہب کے خلاف اُبھرا ـــــــ حقیقت یہ ہے کہ اس باب میں وہ ایک حد تک بقی بھی پہنچے

ردِّ عمل

ان کے سامنے عیسائیت کے سوا کوئی مذہب تھا ہی نہیں۔ اور اگر کہیں تھا بھی تو وہ عیسائیت سے چنداں مختلف نہیں تھا۔ بہرحال مذہب کے خلاف ان کی طرف سے شدید ردِّ عمل ہوا اور انہوں نے ہر اس چیز سے انکار کر دیا جسے مذہب کی طرف منسوب کیا جاتا تھا ـــــــ خدا کا انکار، مستقل اقدار کا انکار، انسانی ذات کا انکار، مکافاتِ عمل کا اِنکار، حیاتِ اخروی کا انکار ـــــــ مذہب کے بجائے جو نظریاتِ زندگی انہوں نے مرتب یا اختیار کئے ان کا ملخّص یہ تھا کہ

مادی نظریۂ حیات

(۱)۔ کائنات کسی نہ کسی طرح از خود وجود میں آ گئی ہے اور اب وہ اندھی فطرت کے قوانین کے مطابق خود بخود مصروفِ عمل ہے۔

۲۔ انسان دوسرے حیوانات ہی کی بڑھی ہوئی شکل ہے۔ اس کی زندگی بس یہی طبیعی زندگی ہے۔ یہ حیوانات کی طرح کھاتا پیتا، افزائشِ نسل کرتا اور پھر مر جاتا ہے۔ موت سے اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

۳۔ زندگی کے تمام مسائل کا حل، عقلِ انسانی کی رُو سے کیا جا سکتا ہے اور سوسائٹی کے قوانین و ضوابط ہی اس کی آزادی اور پابندی کے حدود متعیّن کرتے ہیں۔

اِس نظریۂ زندگی کا نام، مادّی تصوّرِ حیات (MATERIALISTIC CONCEPT OF LIFE) ہے۔ چنانچہ اس نظریہ کے ایک امام، ہیکل (ERNST HAECKEL) نے لکھا ہے کہ

"ہم دنیا کے متعلّق صحیح علم اور اس کے اہم مسائل کا صحیح حل صرف عقل کی رُو سے دریافت کر سکتے ہیں۔ عقل، انسان کے لئے نعمتِ عظمیٰ ہے۔ یہی وہ خصوصیّت ہے جو اُسے حیوانات سے ممتاز کرتی ہے۔ وحی یا معتقدات کا تصوّر، دانستہ یا نادانستہ یکسر فریب پر مبنی ہے۔"

(RIDDLE OF THE UNIVERSE)

اور مارکس نے کہا کہ

"مذہب سے وہی انسان وابستہ رہ سکتا ہے، جو یا تو ابھی تک اپنے مقامِ انسانیت سے بے خبر ہے، یا جس نے اس مقام کو پاکر پھر سے کھو دیا ہے۔ مذہب مظلوموں کی سسکیاں، ایک پتھر کی دنیا کا قلب اور ان حوادث کی روح ہے جن میں روحانیت کا نام نہیں۔ مذہب کی فنا میں حقیقی انسانی مسرّت کا راز پنہاں ہے۔ اخلاقیات، مذہب، مابعد الطبیعیات اور دیگر تصوّرات، سب کے سب حقیقی آزادی کے دشمن ہیں۔ ان کی کوئی تاریخ نہیں۔ تاریخ صرف مادّی انسان کی ہے۔"

تاریخ کا مشہور نقّاد اور مبصّر سپنگلر (SPENGLER) لکھتا ہے کہ ایک چیز ہوتی ہے تصوّرِ حیات یا روحِ زندگی اور دوسری چیز ہوتی ہے وہ مادّی پیکر جن میں اس تصوّر کی نمود ہوتی ہے۔ اس تصوّر یا روح کو کلچر کہا جاتا ہے اور اس کے مادّی مظاہر کو تہذیب۔ اس بناء پر کہا جا سکتا ہے کہ یورپ کا کلچر، مادّی تصوّرِ حیات تھا اور جس طرح یہ تصوّر ان کی تمدّنی، معاشی، معاشرتی، سیاسی اخلاقی زندگی میں نمودار ہوا، اس کا نام تہذیبِ مغرب ہے۔

تہذیبِ مغرب

چونکہ اقوامِ مغرب نے سائنٹفک ریسرچ سے فطرت کی قوتوں کو مسخّر کر لیا تھا، اس لئے دنیا کی تمام دیگر اقوام پر انہیں سیاسی تغلّب حاصل ہو گیا اور چونکہ محکوم قوم کو حاکم قوم کی ہر ادا میں شانِ محبوبیّت نظر آیا کرتی ہے، اس لئے ان کی دیکھا دیکھی ان اقوام نے بھی اسی تہذیب کو اپنا لیا جسے یورپ نے اختیار کیا تھا۔ بیسویں صدی کا آغاز، دنیا میں اسی تہذیب کی حکمرانی کے منشور سے ہوا۔ اُس وقت ہر طرف سے اس کی تعریف و توصیف کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ ہر گوشہ سے اس کی حمد و ستائش کے قصیدے سنائی دیتے تھے۔ ہر قوم اس کی نقّالی میں فخر محسوس کرتی تھی۔ یوں دکھائی دیتا تھا جیسے ابنِ آدم نے پھر سے اُس فردوسِ گم گشتہ کو پا لیا ہو جس کی

تلاش میں وہ صدیوں سے مارا مارا پھر رہا تھا۔

سوال یہ ہے کہ اس پچاس ساٹھ سال کے عملی تجربے نے اس تہذیب کے متعلق یورپ کے انسان کو کس نتیجہ پر پہنچایا ہے؟ کیا اسے وہ انفرادی اطمینان اور اجتماعی سکون نصیب ہو گیا ہے جس کے لئے اس نے

اس تہذیب کا ماحصل؟

اس تہذیب کو اختیار کیا تھا؛ کیا وہ واقعی آج پہلے سے زیادہ سکھی ہے؛ کیا اُسے وہ فردوسِ گم گشتہ مل گیا ہے جس کا خضرِ راہ اس نے اس نظریۂ زندگی کو سمجھا تھا؟ آیئے! اس سوال کا جواب، خود یورپ کے مفکرّین اور مدبّرین کی زبان سے سُنیں کہ بہتر اور معتبر شہادت، اس باب میں اور کس کی ہو سکتی ہے؟

مغرب کا ایک مفکّر، ڈاکٹر میسن (J.W.T. MASON) اپنی کتاب (CREATIVE FREEDOM) میں لکھتا ہے:۔

"ہم نے زندگی کی ابتدا، سائنس کی کاریگری سے کی، اس وثوق کے ساتھ کہ مادی کامرانیاں زندگی کے عقدوں کو حل کر دیں گی لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہم غلطی پر تھے۔ زندگی کے مسائل اتنے آسان نہیں۔"

سائنس کی تباہ کاریاں

پروفیسر جوڈ (C.E.M. JOAD) کہتا ہے کہ

"اس زمانہ میں مشین نے انسان کو بے پناہ قوّت دے دی ہے اور اس قوّت سے وہ تعمیر و تخریب کے بے حد و حساب کام لے سکتا ہے۔ وہ چاہے تو سمندر کو پھاڑ ڈالے اور پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر دے۔ آسمان اس کے سامنے گرد اور کائنات سرنگوں ہے۔ لیکن اتنی قوّت پا کر بھی وہ سُکھی نہیں ہوا، اور دُکھی ہو گیا ہے۔ آج مشین کی طاقت انسان کو مطمئن کرنے کا کام نہیں دے رہی، بلکہ اُلٹا اسے تباہ و برباد کر رہی ہے۔"

اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کے متعلق برٹرینڈ رسل لکھتا ہے کہ

ہماری موجودہ مشکل یہ ہے کہ ہم نے خارجی قوّتوں کو تو بے حساب انداز سے مسخّر کر لیا ہے، لیکن ان قوتوں کو قطعاً مسخّر نہیں کیا جو خود ہمارے اندر ہیں۔

(AUTHORITY AND THE INDIVIDUAL)

ڈاکٹر ولیم برینڈ (WILLIAM BREND) اس نکتہ کی وضاحت ان الفاظ میں کرتا ہے:۔

"انسان ابھی اس مقام سے بہت دُور ہے کہ وہ سیکھ لے کہ وہ اپنے آپ پر کس طرح حکومت کر سکتا ہے۔ انسان ہر جگہ پریشانی اور بے یقینی کے عالم میں پھر رہا ہے۔ قدیمی اقدار و عقائد ختم ہو چکے ہیں اور ان کی جگہ کسی اور چیز نے نہیں لی۔ دنیا کے بیشتر حصے پر تعمیری قوتوں کے بجائے تخریبی قوتیں چھا چکی ہیں اور انسان نے جو کچھ صدیوں سے حاصل کیا تھا وہ سب ختم ہو رہا ہے۔ انسان نے اپنے طبیعی ماحول پر اچھا خاصہ قابو پا لیا ہے۔ لیکن اس نے اپنے جذباتی ماحول پر قابو پانا ابھی نہیں سیکھا۔ (FOUNDATIONS OF HUMAN CONFLICTS)

اس کی وجہ!

اس کی وجہ ظاہر ہے۔ جب انسان کے سامنے بلند مستقل اقدار نہ ہوں، جب کوئی غیر متبدل اصول اس کی آزادی اور پابندی کے حدود متعین نہ کریں، جب زندگی کا مقصد صرف مادی مفاد اور طبیعی لذات کا حصول رہ جائے تو انسان اپنے حیوانی جذبات کے تابع زندگی بسر کرے گا۔ یہ جذبات تین بڑی بڑی شقوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔ یعنی جذبۂ تحفّظِ خویش، جذبۂ تغلّب اور جذبۂ افزائشِ نسل۔ جب ہر فرد کا مطمحِ نگاہ اپنے ان جذبات کی تسکین ہو تو انسان کی اجتماعی زندگی میں جس قدر تصادم و تزاحم واقع ہوگا اس کی زندہ شہادت موجودہ انسانی معاشرہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انسانی عقل و فکر اس کی راہ نمائی کرے گی اور اسے اس کے جذبات کی تسکین میں بے زمام نہیں ہونے دے گی۔ لیکن یہ غلط ہے۔ عقل، انسان کے اندر ایک قوّت ہے جس کا کام انسانی جذبات کے تقاضوں کے لئے جواز کے دلائل بہم پہنچانا اور انہیں بروئے کار لانے کے لئے تدابیر سجھانا ہے۔ ——— چنانچہ

تنہا عقل کی پوزیشن

(H.G. WARREN) کی (DICTIONARY OF PSYCHOLOGY) میں عقل (RATIONALISM) کی تعریف (DEFINITION) یہ لکھی ہے:-

"عقل اس ذہنی عمل کا نام ہے جو اس کام یا رائے کے لئے خوش آیند دلائل تراشے جو درحقیقت کسی اور ہی جذبہ کے ماتحت پیدا ہوا ہو، خواہ اُس شخص کو جس کی عقل یہ کچھ کر رہی ہے اس کا احساس تک بھی نہ ہو کہ اس کام کا جذبۂ محرکہ کچھ اور ہے اور یہ دلائل محض عقل کی فسوں سازی ہے۔"

پروفیسر جوڈ اس باب میں لکھتا ہے:-

"عقل اس قوّت کا نام ہے جس سے ہم اپنے آپ کو دھوکا دے سکتے ہیں کہ جس بات کو ہم صحیح ماننا چاہتے ہیں وہ درحقیقت صحیح ہے۔ لہٰذا عقل جذبات کی لونڈی ہے اور ان کے ماتحت اسی طرح چلتی ہے جس طرح کتّے کے پاؤں اس کی ناک (سونگھنے کی قوّت) کے پیچھے چلتے ہیں۔"

پروفیسر آئن سٹائن ہمارے دور کا سب سے بڑا ریاضی دان سائنٹسٹ تصوّر کیا جاتا ہے۔ اس نے اپنی عمر کے آخری حصّے میں ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام ہی (OUT OF MY LATER DAYS) تھا۔ وہ اس کتاب میں لکھتا ہے:۔

"ہم نے تلخ تجارب کے بعد یہ سیکھا ہے کہ معاشرتی زندگی کی گتھیاں تنہا عقل کی رُو سے نہیں سُلجھ سکتیں۔ سائنس کی تحقیقات اکثر اوقات نوعِ انسانی کے لئے بڑی مہلک ثابت ہوئی ہیں۔ ان سے انسان کو طبیعی زندگی میں آرام اور عشرت تو ضرور مل گئے لیکن اس کی داخلی دُنیا میں عجیب قسم کا کرب واضطراب پیدا ہو گیا جس سے وہ اپنے ٹیکنیکل ماحول کا غلام بن کر رہ گیا اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ اُسے خود اپنی تباہی کے لئے بڑے بڑے سامان مل گئے۔ اس لئے ہمیں تنہا عقل کو اپنا خدا نہیں بنا لینا چاہیئے۔ اس خدا کے عضلات (MUSCLES) تو بہت مضبوط ہیں لیکن اس کی ذات (PERSONALITY) نہیں ہے۔ عقل ذرائع واسباب پر تو خوب نگاہ رکھتی ہے لیکن مقاصد واقدار کی طرف سے بالکل اندھی ہوتی ہے۔"

یہ ہے (وحی کے بغیر) وہ عقل جسے تہذیبِ مغرب نے اپنا امام بنایا تھا۔ اس کا جو نتیجہ نکلا، اس کے متعلق (DORSEY) لکھتا ہے کہ

"ہماری موجودہ تہذیب، اپنے قومی، معاشی، عائلی، اخلاقی، مذہبی اور ذہنی نظام کے ہر شعبے میں حماقت، جہالت، فریب اور ظلم کا مستقل مظاہرہ ہے۔"

اس دورِ تہذیب وتمدّن اور قدیم عہدِ جہالت وبربریّت میں جو فرق ہے اسے (ALDOUS HUXLEY) کے الفاظ میں سنیئے، وہ لکھتا ہے:۔

"اس باب میں دورِ جاہلیت اور عہدِ حاضر میں بس فرق یہ ہے کہ ہم کھلے ہوئے تشدّد کی دنیا سے فریب کاری

؎ جب عقل وحی کی روشنی میں چلتی ہے تو اس سے کس قدر تعمیری کام سرانجام پاتے ہیں اس کے متعلق بعد میں لکھا جائے گا۔

کی دنیا کی طرف بڑھتے چلے آرہے ہیں۔"　(ENDS AND MEANS)

یعنی عہدِ جاہلیت کا وحشی انسان جو کچھ کھلے بندوں کرتا تھا، ہمارے زمانے کا مہذّب انسان وہی کچھ عقلِ حیلہ جُو کی فریب کاریوں کے پردے میں کرتا ہے۔ علّامہ اقبالؒ کے الفاظ ہیں :۔

جہانِ مغرب کے بتکدوں میں کلیساؤں میں مدرسوں میں
ہوس کی خونریزیاں چھپاتی ہے عقلِ عیّار کی نمائش!

افراد کی بیکلی

یہ تو ہے اس تہذیب کے ہاتھوں انسانی معاشرہ کی حالت۔ اس نے افراد کے ساتھ کیا کیا ہے، اس کا نقشہ اس سے بھی بھیانک اور ہولناک ہے۔ آپ نے ڈاکٹر ینگ (JUNG) کا نام سنا ہوگا۔ وہ عصرِ حاضر کا مشہور علم النفس کا ماہر ہے۔ اس نے اپنی عمر بچوں اور نوجوانوں کی نفسیات کے مطالعہ میں گزاری ہے۔ وہ اپنی مدت العمر کے تجربے کے بعد دورِ حاضر کے انسان کے متعلق جس نتیجہ پر پہنچا ہے اسے اس نے اپنی کتاب (MODERN MAN IN SEARCH OF SOUL) میں ان الفاظ میں قلمبند کیا ہے :۔

"عصرِ حاضر کا انسان مفلوج انسان ہے۔ اندھے حوادث کے مقابلہ میں خوف سے ہراساں یعنی ان حوادث کے مقابلہ میں ہراساں جن پر وہ اپنے دور کی سیاسی اور معاشی تدابیر کے زور پر قابو نہیں پاسکتا۔ یہ تو ہے اس کی خارجی حالت۔ اور اگر وہ اس خارجی دنیا سے ہٹ کر اپنی داخلی دنیا کی طرف جھانکتا ہے تو وہاں اُسے باہر سے بھی زیادہ تاریکیاں دکھائی دیتی ہیں۔"

اقبالؒ نے مدت ہوئی عہدِ حاضر کے انسان کی قلبی کیفیت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا تھا۔

عشق ناپید و خرد می گزدش صورتِ مار　　عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کر نہ سکا!
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا　　اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا!
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا　　زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا!

امریکہ کی حالت

یورپ میں اس تہذیب پر بڑھاپے کے آثار شروع ہو گئے ہیں۔ لیکن امریکہ میں یہ ہنوز اپنے شباب پر ہے۔ وہاں یہ کس قسم کی نسل پیدا کر رہی ہے اس کے متعلق وہاں کے مشہور اہلِ قلم (MUMFORD LEWIS) کا بیان ملاحظہ فرمایئے۔ وہ اپنی کتاب (FAITH FOR LIVING) میں لکھتا ہے :۔

" امریکہ میں ہم نے ایک نئی نسل پیدا کی ہے۔ عمدہ توانائی، خوبصورت جسم، لیکن دل بالکل خالی۔ وہ نسل جس کے سامنے زندگی کا کوئی مقصد ہی نہیں۔ یہ نوجوان، یہ مہذّب وحشی حیوانوں کی سطح پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کبھی دھوپ میں کھڑے آفتابی غسل کر رہے ہیں۔ کبھی بیکار جنسی میلان کی تحریک پر ناچنے لگ جاتے ہیں۔ یہ لوگ کھاتے ہیں، پیتے ہیں، شادی کرتے ہیں، بچّے پیدا کرتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ ایسی زندگی جی کر جو اگر کامیاب ہے تو زیادہ سے زیادہ حیوانی لذتیں حاصل کرنے کی' اور اگر ناکام ہے تو حسد، خوف، اور پریشانی کی حیوانی سطح کی لذتوں کے سوا، انہیں ہر طرح کی زندگی سے نفرت ہے۔ انہیں ان لذّتوں سے محروم کر دیجئے تو ان کے لئے جینا وبالِ دوش ہو جائے۔"

نیشنلزم کی تباہ کاریاں

تہذیبِ مغرب کا سب سے بڑا مایہ ناز کارنامہ اس کا سیاسی نظام سمجھا جاتا ہے۔ اس نظام کی بنیاد نیشنلزم پر ہے اور اندازِ حکومت جمہوریت۔ نیشنلزم کا جذبۂ محرکہ حیوانات کی (HERD-INSTINCT) ہے جس کی رُو سے ہر حیوان محسوس کرتا ہے کہ اگر وہ تنہا رہے گا تو غیر محفوظ ہوگا اور گلّے کے ساتھ رہے گا تو خطرات سے مامون ہوگا۔ اسی جذبہ کے ماتحت انسانی افراد نیشن کا جزو بن کر رہتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر نیشنلزم کی عمارت بھی جذبۂ تحفّظِ خویش پر استوار ہوتی ہے۔ اس جذبہ کے تحت جس قسم کا تصادم افراد میں ہوتا ہے اسی قسم کا اقوام میں ہوتا ہے۔ یعنی اب افراد کی جگہ اقوام ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتی ہیں۔ لندن یونیورسٹی کا پروفیسر الفریڈ کوبن اس ضمن میں لکھتا ہے:۔

" قومیّت پرستی کا احساس نفرت سے پیدا ہوتا ہے اور عداوت پر پرورش پاتا ہے۔ ایک قوم کو اپنی ہستی کا احساس ہی اس وقت ہوتا ہے جب وہ کسی دوسری قوم سے متصادم ہو۔ پھر ان اقوام کا جذبۂ عداوت و پیکار اپنی قومی وحدت کی تکمیل پر ہی ختم نہیں ہو جاتا۔ جونہی کوئی قوم اپنے حقِ خود مختاری کو مستحکم کر لیتی ہے تو وہ ان اقوام کا گلا دبانا شروع کر دیتی ہے، جو اپنے لئے حقِ خود مختاری کی مدّعی ہوں۔"

(THE CRISIS OF CIVILISATION)

تاریخِ قومیّت کا عالم (FREDRICK HERTS) اپنی کتاب (NATIONALITY IN HISTORY AND POLITICS) میں لکھتا ہے:۔

"تاریخ بتاتی ہے کہ مختلف اقوام میں باہمی لڑائیوں کا سبب اس کے سوا شاید ہی کچھ اور ہو کہ یہ قومیں انسانوں کی مختلف جماعتیں تھیں جنہوں نے اپنے اپنے نام الگ رکھ لئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ (مثلاً) ایک انگریز کے دل میں کسی فرانسیسی، ہسپانوی یا اطالوی کا نام نفرت اور حقارت کا خیال پیدا کر دیتا ہے۔"

برٹرینڈ رسل اس باب میں لکھتا ہے:۔

"ہمارے زمانہ میں جو چیز معاشرتی روابط کو قومی حدود سے آگے بڑھانے میں مانع ہے، وہ نیشنلزم ہے۔ اس لئے نیشنلزم نوعِ انسانی کی تباہی کے لئے سب سے بڑی قوت ہے۔ پھر تماشا یہ ہے کہ ہر شخص محسوس کرتا ہے کہ دوسرے ملکوں کی نیشنلزم بڑی خراب چیز ہے، لیکن اس کے اپنے وطن کی نیشنلزم بہت اچھی ہے۔" (THE HOPE FOR A CHANGING WORLD)

آلڈس ہکسلے اس مسلک کے متعلق لکھتا ہے:۔

"نیشنلزم ایک بت پرستانہ اور مشرکانہ مذہب کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ ایسا مذہب جو فساد اور تفریقِ انسانیت کے لئے ایسا طاقتور ہے کہ کوئی توحید پرست مذہب فلاح و وحدتِ انسانیت کے مقصد کے حصول کے لئے اس مذہب کا مقابلہ نہیں کر سکتا[1]۔"

یہ ہے نیشنلزم کا وہ مسلک جسے مغرب نے یہ کہہ کر اختیار کیا تھا کہ اس سے نوعِ انسانی کی سیاسی اور تمدنی زندگی کے مسائل حل ہو جائیں گے۔ اس خرابی کی بنیادی وجہ بھی وہی مادی تصورِ حیات ہے جس کی رُو سے کوئی قوم مستقل اقدار یا غیر متبدّل اصولوں کی پابند نہیں ہوتی

اخلاقی اصولوں سے بے اعتنائی

(MY COUNTRY RIGHT OR WRONG) ہر قوم پرست کا عقیدہ ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ اپنے ملک یا اپنی قوم کے مفاد کے تحفظ کے لئے کسی قاعدے اور قانون یا ضابطہ اور اصول کی پروا نہیں کرتا۔ اسی بناء پر (WALPOLE) نے کہا تھا کہ

---

[1] اپنے وطن کی حفاظت اور چیز ہے اور نیشنلزم بطور مسلک اور چیز۔ قرآنِ کریم مستقل اقدارِ انسانیت کی حفاظت کے لئے وطن کی حفاظت ضروری قرار دیتا ہے، لیکن انسانیت سے نفرت کے لئے نہیں۔

"نیک آدمی کسی بڑی سلطنت کو بچا نہیں سکتے۔ اس لئے کہ سلطنتوں کو بچانے کے لئے جس حد تک چلے جانا بعض اوقات ضروری ہو جاتا ہے۔ نیک آدمی وہاں تک نہیں جا سکتے۔"

اِس حقیقت کو اٹلی کے مدبر (CAVOUR) نے سمٹا کر ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ

"اگر ہم اپنی ذات کے لئے وہی کچھ کریں جو ہم نے مملکت کے لئے کیا ہے تو ہم کتنے بڑے شیاطین کہلائیں۔"

اب رہا جمہوری طرزِ حکومت، سو مغربی جمہوریّت کے معنی یہ ہیں کہ ایک قوم کو حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ جس قسم کا جی چاہے قانون بنا لے۔ ان کے اوپر کوئی اور اقتدار نہیں ہوتا۔ نہ ہی وہ اپنے حقِ قانون سازی میں اپنے بنائے ہوئے قواعد و ضوابط کے سوا کسی اور حدود و قیود کی پابند ہوتی ہے۔ اس طرزِ حکومت کا نتیجہ کیا ہے، اس کے متعلق کیمبرج یونیورسٹی کا پروفیسر (A.C. EWING) اپنی کتاب

مغربی جمہوریّت کی فساد انگیزیاں

(THE INDIVIDUAL, THE STATE AND WORLD GOVERNMENT)

میں لکھتا ہے کہ

"اگر روسو، عہدِ حاضر میں جمہوری نظام کے عملی تجربہ سے پہلے اپنی کتاب نہ لکھتا تو وہ نظامِ جمہوریّت کے متعلق کبھی ایسی خوش فہمی سے کام نہ لیتا۔"

یہ اِس لئے کہ مشہور اطالوی مدبّر میزینی (MEZZINE) کے الفاظ میں:-

"اگر انسانوں کے اوپر کوئی اقتدارِ اعلیٰ نہ ہو تو پھر کونسی چیز ایسی رہ جاتی ہے جو ہمیں طاقتور افراد کے تغلّب سے محفوظ رکھ سکے۔"

ظاہر ہے کہ جس نظام کی بنیاد ہی مفادِ خویش کے تحفّظ اور مصلحت بینی کے مسلک پر ہو اور جس میں حق و صداقت کو اپنے فیصلوں کے پرکھنے کا معیار نہ قرار دیا جائے، وہ نظام کبھی دیر پا نہیں ہو سکتا۔ اس باب میں تہذیب کا مشہور مؤرّخ (BRIFFAULT) اپنی شہرۂ آفاق تصنیف (THE MAKING OF HUMANITY) میں لکھتا ہے:-

"انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کا کوئی نظام جس کی بنیاد باطل اصولوں پر ہو کبھی قائم نہیں رہ سکتا، خواہ اس باطل نظام کو کیسے ہی حسنِ تدبیر اور دانش مندی سے کیوں نہ چلایا جائے۔ اس کی بنیادی کمزوری، خارجی

نظم و ضبط اور ادھر اُدھر کی جزئی مرمت سے کبھی رفع نہیں ہو سکتی۔"
اقبالؒ کے الفاظ میں :۔

تدبّر کی فسوں سازی سے قائم رہ نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہو

جہاں تک معاشی نظام کا تعلق ہے، مغرب کے مشینی دور (نظامِ کارخانہ داری) نے اس باب میں اس قدر تباہی پیدا کی ہے کہ اس سے انسانیت کی روح کانپ اٹھتی ہے اس نظام کی بنیاد کس تصوّر پر ہے؟ اس کے متعلق (BRIC GILL) اپنی مشہور کتاب (MONEY AND MORALS) میں لکھتا ہے کہ

نظامِ کارخانہ داری

"ہمیں کارخانوں میں انسانوں کی ضرورت نہیں، مشینیں ان سے کہیں بہتر ہیں۔ ان کی ایجاد سے انسانی محنت میں بڑی بچت ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ہمیں مشین کو نہیں انسان کو ختم کرنا چاہیئے۔ یہ انسان، جنہیں ہم دنیا سے مٹا دینے کے خواہش مند ہیں، وہ انسان ہیں جو کارخانوں میں کام کرتے ہیں، نہ کہ وہ انسان جو گلی محلوں میں بستے ہیں۔ یہ انسان تو ہمارے ساتھی ہیں، ہمارے دوست ہیں، کیونکہ ہمارا مال خریدتے ہیں۔ آجکل سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ چیزوں کے پیدا کرنے میں انسانی محنت میں کس طرح زیادہ سے زیادہ بچت کی جائے۔ اور ان چیزوں کے استعمال کرنے والوں کی تعداد میں کس طرح زیادہ سے زیادہ اضافہ کیا جائے اور ان کے خریدنے کی قوّت کو بڑھایا جائے۔ یہی ہمارا بنیادی مسئلہ ہے۔ جڑ بھی یہی ہے اور شاخ بھی یہی۔"

بعض لوگوں نے یہ سمجھا کہ یہ ساری خرابی نظامِ سرمایہ داری کی ہے اور اشتراکی نظام (کمیونزم) اس کا حل ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ نظامِ سرمایہ داری انسانیت کے لئے پیامِ مرگ ہے، لیکن کمیونزم اس کا حل کس طرح پیش کر سکتی تھی؛ خرابی کی اصل بنیاد یہ تصوّر ہے کہ انسان کے اوپر کوئی مستقل اقدار نہیں جن کی پابندی اس پر لازم ہو۔ کمیونزم کی ساری عمارت اسی بنیاد پر استوار ہوتی ہے۔ لینن اپنی ایک تقریر میں نوجوانوں کو مخاطب کرتا ہوا کہتا ہے :۔

کمیونزم کی خرابیاں

"ہم ان تمام اخلاقی حدود و شرائط کی مذمت کرتے ہیں جو کسی مافوق الفطرت عقیدہ کا نتیجہ ہوں۔ ہمارے خیال میں اخلاق کا نظریہ ہمیشہ پارٹی کے مفاد کی جنگ کے تابع رہنا چاہیئے۔ ہر وہ حربہ جو قدیم غاصبانہ نظامِ معاشرت کے خلاف اور مزدوروں کی تنظیم کی تائید میں استعمال کرنا ضروری سمجھا جائے عین اخلاق

ہے۔ اشتراکیوں کا اخلاق و شریعت تو صرف اس قدر ہے کہ ڈکٹیٹر کی قوت کا استحکام کس صورت ہیں ہو سکتا ہے۔ اس کے خلاف جو کچھ ہے سب ناجائز ہے۔ چنانچہ پارٹی کے مفاد کی خاطر جرائم کا ارتکاب دروغ بافی، فریب دہی عین حق و صداقت ہے۔ نہیں! بلکہ دشمنوں کے خلاف کذب و افترا ہی بعض ..... اوقات سب سے اہم حربے ہوتے ہیں۔"

یہ فریب دہی اور دروغ بافی دشمنوں کے خلاف ہی نہیں، بلکہ عند الضرورت خود اپنی جماعت کے خلاف بھی انہی حربوں سے کام لیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ (GOLANCZ) اپنی کتاب (OUR THREATENED VALUES) میں لکھتا ہے کہ (DR. G. LUCKUE) سے پوچھا گیا کہ کیا اشتراکی لیڈروں کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ اپنی جماعت کے افراد سے بھی فریب دہی سے کام لیں؛ اس نے جواب میں کہا کہ

" اشتراکی اخلاق کی رُو سے یہ فریضہ سب سے اہم ہے کہ اسے تسلیم کیا جائے کہ عند الضرورت بددیانتی اور بے ایمانی سے کام لیا جا سکتا ہے۔ یہ سب سے بڑی قربانی تھی جس کا ہم سے انقلاب نے مطالبہ کیا تھا۔"

لہٰذا سوال نہ نظامِ سرمایہ داری کا ہے نہ اشتراکیت کا نہ جمہوری نظامِ حکومت کا نہ ڈکٹیٹر شپ کا۔ اصل سوال ہے اس تہذیب کا جو مادّی تصوّرِ حیات کی پیداوار ہے اور جس کا شکار تمام اقوامِ مغرب اور ان کی دیکھا دیکھی دیگر اقوامِ عالم ہو چکی ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ مادی تصوّرِ حیات کی پیدا کردہ مصیبتوں اور پریشانیوں کا ستایا ہوا، مغربی انسان

یورپ کا موجودہ ردِّ عمل

اب اپنے لئے کس قسم کی زندگی کی تلاش میں ہے؟ آپ جب ان تصوّرات و احساسات اور خیالات پر غور کریں گے جو گذشتہ پچاس سال کے تلخ تجربہ کے بعد یورپ کے مفکّرین و مدبّرین کے دل میں پیدا ہو رہے ہیں تو یہ حقیقت آپ کے سامنے آجائے گی کہ اب ان کے سامنے جس قسم کی زندگی کے دُھندلے سے نقوش اُبھر رہے ہیں وہ وہی ہے جسے آج سے چودہ سو سال پہلے قرآنِ کریم نے نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود اور امن و سکون کا ضامن قرار دیا تھا۔ قرآنِ کریم نے کہا تھا کہ مادی تصوّرِ حیات باطل ہے۔ انسان کی طبیعی زندگی بے شک انہی قوانین کے تابع ہے جن کے تابع دیگر حیوانات کی زندگی ہے۔ لیکن انسان میں ایک شے اور بھی ہے جو کسی حیوان میں نہیں۔ یہ شے انسان کی ذات (HUMAN PERSONALITY)

اِنسانی ذات کا اقرار

ہے۔ انسانی جسم ہر آن بدلتا ہے۔ لیکن انسانی ذات تغیّر نا آشنا ہے۔ مشہور پولش مفکر، بار دیو (NICHOLES BERDYEAU) اس باب میں لکھتا ہے:۔

"دنیا میں جس قدر تغیّرات رونما ہوتے ہیں ان کے متعلق انسان کا اندازِ نگاہ دوہرا ہونا چاہیئے۔ زندگی تغیّرات کا نام ہے اور جدّت کے بغیر زندگی کچھ نہیں۔ لیکن صرف تغیّر کا تصوّر فریب انگیز ہے۔ تشخصِ خویش کے لئے تغیّر اور جدّت کی بھی ضرورت ہے۔ لیکن اس میں ایک ایسی شے بھی ہے جو مستقل اور تغیّر ناآشنا ہے۔ لہٰذا اپنی نشوونما میں انسان کو خود اپنے آپ سے فریب دہی نہیں کرنی چاہیئے۔ یعنی اس مستقل شے کو کبھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیئے جو اسے ابدی طور پر ملی ہے۔ زندگی کے لئے یہ چیز نہایت ضروری ہے کہ تغیّرات کے اس پیہم عمل سے جس سے جدّت نمودار ہوتی ہے ذات کے ثبات کا امتزاج کیا جائے۔" (THE DIVINE AND HUMAN)

قرآن نے کہا تھا کہ اگر انسانی ذات کی مناسب نشوونما ہو جائے تو انسان کو حیاتِ جاوید حاصل ہو جاتی ہے۔

حیات بعد الممات

انسان کی طبیعی موت سے انسانی ذات نہیں مرتی۔ یہی وہ بنیادی تصوّر ہے، جس پر دین کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔ مشہور روسی مفکّر اوسپنسکی (P.D. OUSPENSKY) اپنی کتاب (IN SEARCH OF THE MIRACULOUS) میں اپنے استاد گرجیف کے الفاظ میں لکھتا ہے:۔

"اگر انسان ہر آن بدلتا رہے، اگر اس میں کوئی ایسی شے نہ ہو جو خارجی تغیّرات سے متاثر نہ ہو، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس میں کوئی ایسی چیز نہیں جو موت کا مقابلہ کر سکے۔ عام حالات میں ہم ہر آن مرتے رہتے ہیں لیکن اگر انسان اپنے اندر مستقل انا کو نشوونما دے لے تو یہ تغیّرات سے غیر متاثر رہ سکتا ہے اور اس طرح طبیعی جسم کی موت کے بعد بھی زندہ رہ سکتا ہے۔"

قرآنِ کریم نے کہا تھا کہ جس طرح انسان کی طبیعی زندگی کی نشوونما کے لئے قوانین مقرر ہیں، اسی طرح اس کی ذات کی نشوونما کے لئے بھی اُصول متعیّن ہیں۔ انہیں مستقل اقدار کہا جاتا ہے۔ یہ اقدار نہ ہر فرد کی ذاتی پیدا کردہ ہوتی ہیں، نہ انہیں اِنسان مل کر باہمی مشورہ سے طے کرتے ہیں۔ ان کا ایک مطلق معیار (ABSOLUTE STANDARD) ہے جو کسی کے لئے نہیں بدلتا۔ جب انسان کے کسی طبیعی تقاضے اور مستقل قدر میں (TIE) پڑ جائے تو

اخلاقی اقدار

مستقل قدر کے تحفّظ کے لئے جسمانی تقاضے کو قربان کر دینا، کیریکٹر یا اخلاق کہا جاتا ہے مغرب کے مادّی تصوّرِ حیات نے ان تمام اُصولوں کا مذاق اڑایا، لیکن اب دیکھئے کہ وہیں کے مفکّر اس باب میں کیا کہتے ہیں۔ راشڈل (RASHDAL HASTINGE) اپنی کتاب (THE THEORY OF GOOD AND EVIL) میں لکھتا ہے:۔

"اخلاقیات سے مفہوم ہی یہ ہے کہ دُنیا میں اقدار کے لئے ایک مطلق معیار ہے جو ہر انسان کے لئے یکساں ہے۔ یہ اقدار مستقل ہیں۔ مستقل اقدار کے یہ معنی نہیں کہ ہر شخص خود فیصلہ کرے کہ مستقل قدر کیا ہے انہیں عالمگیر ہونا چاہیئے، جنہیں ہر شخص تسلیم کرے اور اس کا معترف ہو۔"

قرآن نے کہا تھا یہ مستقل اقدار، عقلِ انسانی وضع نہیں کر سکتی۔ یہ انسان کو وحی کے ذریعہ ملتی ہیں۔ مادی نظریۂ حیات، عقلِ انسانی سے ماوراء کسی سرچشمۂ علم کا قائل نہیں تھا۔ اب دیکھئے کہ مغرب کے مفکّرین اس باب میں کس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ آئن سٹائن اپنی کتاب (OUT OF MY LATER DAYS) میں، جس کا حوالہ پہلے بھی دیا جا چکا ہے، لکھتا ہے:۔

وحی کی ضرورت

"سائنس صرف یہ بتا سکتی ہے کہ کیا ہے۔ وہ یہ نہیں بتا سکتی کہ کیا ہونا چاہیئے۔ اس لئے اقدار کا متعین کرنا اس کے دائرے سے باہر ہے۔ سائنس کے علمبرداروں نے اکثر اوقات اس امر کی کوشش کی ہے کہ وہ سائنس کی رُو سے اقدار کے متعلق قطعی فیصلہ نافذ کر دیں (یہ ان کی غلطی ہے جس کی وجہ سے) وہ مذہب کے خلاف محاذ قائم کر بیٹھتے ہیں۔ سائنس کے نزدیک بس ایک "شئے" ہوتی ہے۔ اس کی دنیا میں آرزو، اقدار، خیر و شر، نصب العینِ حیات کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ سائنس نہ تو اقدار متعین کر سکتی ہے اور نہ ہی انہیں انسانی سینے کے اندر داخل کر سکتی۔"

آگے چل کر یہ سائنس دان لکھتا ہے:۔

"یہ اقدار تجربات کے بعد وضع نہیں کی جاتیں۔ یہ مقتدر ہستیوں کی وساطت سے بذریعہ وحی ملتی ہیں۔ ان کی بنیادیں عقل پر نہیں ہوتیں۔ لیکن وہ تجربہ کی کسوٹی پر بالکل پوری اترتی ہیں۔ اس لئے کہ صداقت کہتے ہی اُسے ہیں جو تجربہ سے درست ثابت ہو۔"

شہرۂ آفاق کتاب (AN ESSAY ON MAN) کا مصنّف پروفیسر (ERNST CASSIRER) لکھتا ہے:۔

"یہ حقیقت کہ دنیا میں عقل بڑی مبہم چیز ہے اور اس کے فیصلے یوں ہی تسلیم کر لینے کے قابل نہیں ہو سکتے، انسان کو کبھی معلوم نہ ہو سکتی اگر اس کی طرف وحی کی روشنی نہ آتی۔ وحی نے ہی آکر اُسے اس حقیقت سے آگاہ کیا عقل اس قابل ہی نہیں کہ وہ صداقت اور حکمت کی طرف راہنمائی کر سکے۔"

مادّی نظریۂ حیات کے ماتحت، اوّل تو خدا کی ہستی سے یکسر انکار ہی کر دیا جاتا ہے لیکن اگر اسے مانا بھی جاتا ہے تو صرف اس حد تک کہ خارجی کائنات میں اس کے وضع کردہ قوانین نافذ ہیں۔ جہاں تک انسانوں کی دنیا کا تعلق ہے اس میں اس کے قوانین کا کوئی عمل دخل نہیں۔ قرآن نے کہا تھا کہ خدا کی ہستی پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ یہ تسلیم کیا جائے کہ انسان کو اس کی طرف سے راہنمائی ملتی ہے ——— ایڈنگٹن ہمارے دَور کا بہت بڑا عالمِ طبیعیات گزرا ہے، وہ اپنی کتاب (SCIENCE AND THE UNSEEN WORLD) میں لکھتا ہے:-

"اصل سوال خدا کی ہستی کا نہیں بلکہ اس امر کا یقین ہے کہ خدا بذریعہ وحی انسانوں کی راہ نمائی کرتا ہے۔"

یہ صاحبِ وحی ہستیاں کس قسم کی ہوتی ہیں، اس کے متعلق بارڈیو لکھتا ہے:-

"نبوّت خدائی الہام پر مبنی ہوتی ہے۔ صاحبِ وحی، دنیا اور انسان کے مقدّرات اور مستقبل کے متعلق خدا کی آواز سنتا ہے۔ حاملِ وحی اپنے آپ کو دنیا میں تنہا پاتا ہے۔ وہ جن قوموں کو تباہی سے بچانے کی کوشش کرتا ہے وہ اسے پتھر مارتی ہیں لیکن بایں ہمہ وہ انہیں چھوڑ کر الگ نہیں ہو جاتا۔ یہ وحی اکتسابی نہیں ہوتی جسے ارتقائی مدارج سے حاصل کیا جا سکے۔ یہ تو ایک داخلی شے ہے۔ ایک پیغمبر کی وحی ہندوستان اور یونان کے صوفیوں کے کشف سے بالکل منفرد ہوتی ہے۔"

ان ہستیوں پر ایمان، انسان کی منزلِ مقصود کے لئے خضرِ راہ بنتا ہے اور یہی ہے وہ "ایمان" جس کے فقدان سے یورپ کا نوجوان اس قدر پریشان ہے اور جس کی تلاش میں آج وہ مارا مارا پھر رہا ہے۔ ڈاکٹر ینگ جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، اس باب میں لکھتا ہے:-

ایمان کا فقدان

میں نے اپنی زندگی کے نصفِ آخر میں جس قدر مریضوں کا تجزیۂ نفس کیا ان میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا جسے زندگی کے مسائل کے لئے مذہبی زاویۂ نگاہ کی تلاش نہ ہو۔ ان میں سے ہر ایک کی بیماری کی وجہ یہ تھی کہ اس نے اس "شے" کو ضائع کر دیا تھا جو "زندہ مذہب" انسان کو مہیّا کرتا ہے۔ ان کا علاج اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انہیں پھر سے وہی "شے" دے دی جاتی جو اُن سے گم ہو چکی تھی۔ یہی اُن کی دوا تھی ——— ایمان، اُمید، محبت، نگہِ خود بین۔

ایمان کس بات پر؟ خود اپنی ذات پر؛ مستقل اقدار پر؛ ان اقدار کے سرچشمہ، ذاتِ خداوندی پر؛ اس کی طرف سے عطا کردہ وحی پر۔ اور انسانی ذات کے حیاتِ جاوید حاصل کر لینے پر۔ قرآن نے یہی ایمان کے اجزاء بتائے ہیں۔ یہ ایمان، انسان اور کائنات اور انسان اور انسان کے دوسرے انسانوں کے ساتھ صحیح تعلقات اُستوار کرنے کے علاوہ ان تضادات کو بھی رفع کر دیتا ہے جو خود انسان کی اپنی ذات میں جذبات اور عقل اور عقل اور بلند اقدار کی کش مکش سے رونما ہوتے رہتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ انسان کی پریشانی کا اصل سبب اس کے یہی داخلی تضادات ہوتے ہیں۔

داخلی تضادات کا حل

میبسن اس ضمن میں لکھتا ہے کہ

"اخلاق صرف اس ضابطہ کا نام نہیں جو انسان اور انسان کے درمیان تعلقات کو صحیح معیار کے مطابق طے کرتا ہے، بلکہ اس میں وہ ضابطہ بھی شامل ہے جس کی رُو سے انسان کے خود اپنی ذات کے ساتھ تعلقات بھی صحیح خطوط پر متشکل رہتے ہیں۔"

برگساں کہتا ہے کہ انسان کو جب یہ داخلی توافق حاصل نہ ہو، معاشرت میں کبھی وحدت اور توافق پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے:

"جو توازن ہمیں سطح پر نظر آتا ہے، اس سے کہیں گہرا اور حقیقی توازن انسان کی اپنی ذات کے اندر ہونا چاہیئے۔ جن معاہدات کے متعلق ہم سمجھتے ہیں کہ ان کی رُو سے معاشرہ کا ایک فرد دوسرے فرد کے ساتھ مربوط ہو جاتا ہے، ان کا پہلا کام یہ ہونا چاہیئے کہ وہ خود ہمیں ہماری ذات کے ساتھ مربوط کر دیں۔"

(THE TWO SOURCES OF MORALITY AND RELIGION)

نیٹشے نے اس باب میں ایک عجیب بات کہی ہے، وہ کہتا ہے کہ

"جو برائی تم نے میرے ساتھ کی ہے اُسے تو میں معاف کر دوں گا۔ لیکن جو برائی تم نے اپنے ساتھ کی ہے؛ اُسے کون معاف کرے گا؟"

قرآن ایسی تعلیم دیتا ہے جس سے انسان، نہ دوسرے انسان کے ساتھ برائی کرے اور نہ ہی اپنی ذات کے خلاف۔ اسی سے انسان کے خارجی اور داخلی تضادات میں توافق پیدا ہوتا ہے۔

یورپ کس قسم کا مذہب چاہتا ہے

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ یورپ کو اب پھر مذہب کی تلاش ہے لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کس قسم کے مذہب کا متلاشی ہے؟

ظاہر ہے کہ وہ مذہب عیسائیت تو ہو نہیں سکتا۔ اس لئے کہ عیسائیت ہی سے بھاگ کر تو اس نے مادّی نظریۂ حیات اختیار کیا تھا۔ مغربی مفکّرین کو اس کا تو علم نہیں کہ وہ مذہب کون سا ہے جس کی انہیں تلاش ہے۔ البتہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ جو مذہب ان کے تقاضوں کو پورا کر سکتا ہے اسے کس قسم کا ہونا چاہیئے۔ دیکھئے کہ ان کے یہ تقاضے کیا ہیں اور اُسے کونسا مذہب پورا کر سکتا ہے!

جو سائنس کی تکذیب نہ کرے

اوسپنسکی کہتا ہے کہ:

"جو مذہب سائنس کی تکذیب کرے اور جو سائنس مذہب کی تکذیب کرے وہ دونوں باطل ہوتے ہیں"

یعنی سچا مذہب وہ ہے کہ سائنس کے انکشافات اس کی صداقت کی دلیل بنتے جائیں ــــــ ــــــ ــــــ قرآنِ کریم اپنی صداقت کے ثبوت میں کہتا ہے:۔ سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (۵۳/۴۱) "ہم لوگوں کو خارجی کائنات اور خود ان کی داخلی زندگی میں اپنی نشانیاں دکھاتے جائیں گے تا آنکہ یہ ان پر واضح ہو جائے کہ یہ واقعی حق ہے"۔

"خارجی کائنات کی نشانیاں" سائنس کے انکشافات کے سوا اور کیا ہیں؟ یہی وجہ ہے کہ قرآن کائنات پر غور کرنے کی بار بار تاکید کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ: إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ۔ "یہ حقیقت ہے کہ ارض و سما کی تخلیق میں اور رات دن کی گردش میں صاحبانِ عقل و بصیرت کے لئے بڑی بڑی نشانیاں ہیں"۔ یعنی ان لوگوں کے لئے الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ۔ جو کھڑے، بیٹھے، لیٹے، ہر وقت قوانینِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں اور کائنات کی تخلیق پر غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ: رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَٰذَا بَاطِلًا۔ (۱۸۹/۳ — ۱۹۰) اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے اس سلسلۂ کائنات کو یوں ہی رائگاں نہیں بنایا۔ یہاں کی ہر چیز ایک مقصد کے لئے بنائی گئی ہے۔ آپ غور کیجئے کہ کیا سائنٹفک ریسرچ کا منتہیٰ یہی نہیں جسے قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے اور جسے مومنین کا فریضہ اور شعارِ زندگی قرار دیا ہے۔

ہکسلے اس باب میں لکھتا ہے کہ:۔

ناترقی یافتہ مذہب انسانی ترقی کی راہ میں سنگِ گراں بن کر حائل ہو جاتا ہے لیکن ترقی یافتہ

مذہب متضاد انسانی قویٰ میں وحدت پیدا کر کے ان میں سے ہر قوت کے لئے اختیار و استعمال کا میدان پیدا کر دیتا ہے۔"

قرآنِ کریم انسانی ترقی کے میدان کی وسعت کے متعلق کہتا ہے: وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ـــــ (۴۵/۱۳) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے، خدا نے اس سب کو تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے۔ تم اٹھو اور ان سے کام لو۔

یورپ کو جس مذہب کی تلاش ہے اس کے لئے وہ دوسری شرط یہ عائد کرتا ہے کہ اُسے عقل و بصیرت کا دشمن نہیں ہونا چاہیئے۔

عقل و بصیرت کا دشمن نہ ہو

مغرب کے نامور مفکر لاک (LOCKE) نے اس تقاضے کو چند الفاظ میں بڑی خوبصورتی سے سمٹا دیا ہے جب وہ کہتا ہے کہ:-

"جو شخص وحی کے لئے جگہ بنانے کی خاطر عقل و بصیرت کو باہر نکال دیتا ہے وہ وحی اور عقل دونوں کے چراغ گُل کر دیتا ہے۔" (ESSAYS-BOOK IV)

ڈاکٹر آٹو (OTTO) اس ضمن میں لکھتا ہے:-

"جب تک کوئی مذہب عقل و بصیرت کے عناصر اپنے اندر رکھتا ہے وہ تعصب اور توہم پرستانہ باطنیت کی پست سطح پر گرنے سے محفوظ رہتا ہے۔ یہی مذہب ہے جو انسانیت کا مذہب بن سکنے کا اہل ہوتا ہے۔" (THE IDEA OF THE HOLY)

قرآنِ کریم، بدترین خلائق اُن انسانوں کو قرار دیتا ہے جو عقل و بصیرت سے کام نہیں لیتے۔ وہ کہتا ہے کہ: اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ۔ (۸/۲۲) "اللہ کے نزدیک تمام ذی حیات مخلوق میں بدتر وہ انسان ہیں جو بہرے گونگے بن کر زندگی گزار دیتے ہیں اور عقل و فکر سے کام نہیں لیتے۔" وہ ایسے لوگوں کو جہنمی قرار دیتا ہے۔ سورۂ اعراف میں ہے: وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ۔ "اور بہت سے مہذب اور غیر مہذب انسان تو محض جہنم کا ایندھن بننے کے لئے ہی ہوتے ہیں۔" یہ وہ لوگ ہیں۔ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا۔ "وہ دل رکھتے ہیں لیکن اس سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے۔" وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا۔ "اُن کی آنکھیں تو ہوتی ہیں لیکن وہ ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔" وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا۔ "ان کے کان بھی ہوتے ہیں لیکن وہ ان سے سننے کا کام

نہیں لیتے۔" أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ۔ "یہ بظاہر انسان نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت یہ حیوانوں کے مانند ہیں۔ بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔" أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ (۷/۱۷۹) اس لئے کہ وہ علم وحقیقت سے بے خبر رہتے ہیں۔"

اس مذہب کے متعلق مغربی مفکرین بھی کہتے ہیں کہ اسے اندھی تقلید سے نہ مانا جائے۔ بلکہ انسان اسے

اندھی تقلید نہ ہو

خود سوچ سمجھ کر اختیار کرے۔ وہائٹ ہیڈ اس ضمن میں کہتا ہے کہ "یہ قطعاً ناکافی ہے کہ انسان صرف یہ دیکھے کہ سابقہ زمانے میں کیا کچھ ہوتا رہا اور کس طرح ہوتا رہا ہے اور خود بھی اسی طرح کرتا چلا جائے۔ اس اسلوبِ زندگی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زندگی جامد بن کر رہ جاتی ہے۔"

راشڈل اس باب میں لکھتا ہے کہ۔

"کیا ہم یہ سمجھیں کہ اخلاقی امور میں غور و فکر، گناہِ عظیم ہے؟ کیا ہم اسے تسلیم کر لیں کہ انسان کو آنکھیں بند کئے ان قواعد و ضوابط کی پابندی کئے جانا چاہیئے جنہیں وہ اپنے گرد و پیش دیکھتا ہے۔ اگر ہم ایک ثانیہ کے لئے بھی غور کریں تو یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ ان سوالات کا جواب یکسر نفی میں ہے۔ اخلاقی تعلیم کا بنیادی اصول یہ ہے کہ انسان خود سوچے۔ جو انسان خود نہ سوچے بلکہ زندگی کی تمام جزئیات میں دوسروں کی تقلید کرتا چلا جائے۔ اس کے متعلق سمجھ لو کہ وہ ایسا انسان ہے، جس میں کیریکٹر ہی نہیں۔ بریڈلے نے کیا خوب کہا ہے کہ "جو شخص اپنے ماحول سے بہتر بننے کی خواہش کرتا ہے سمجھ لو کہ وہ حیاتِ جاوداں کی دہلیز پہ کھڑا ہو گیا۔"

قرآنِ کریم، اندھی تقلید کو انسانیت کا بدترین جرم قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ: وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا۔ "جب ان سے کہا جاتا ہے کہ وہ وحیِ خداوندی کا اتباع کریں تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ نہیں! ہم تو اسی مسلک پر چلتے جائیں گے جس پر ہم نے اپنے اسلاف کو پایا ہے۔" اس پر قرآن کہتا ہے کہ: أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ (۲/۱۷۰) "خواہ ان کے آباؤ اجداد نہ کچھ سوجھ بوجھ رکھتے ہوں اور نہ ہی صحیح راستے پر چلتے ہوں۔" یہ پھر بھی انہیں کی پیروی کرتے جائیں گے۔

وہ وحی پر بلا سوچے سمجھے ایمان لانے کی اجازت نہیں دیتا۔ چنانچہ وہ مومنین کی خصوصیت یہ بتاتا

ہے کہ: اَلَّذِیْنَ اِذَا ذُکِّرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ یَخِرُّوْا عَلَیْهَا صُمًّا وَّ عُمْیَانًا۔ (۲۵/۷۳)
"یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان کے سامنے ان کے رب کی آیات بھی پیش کی جاتی ہیں تو وہ ان پر بھی بہرے اور اندھے بن کر نہیں گر پڑتے۔" وہ غور و فکر سے کام لیتے ہیں اور علم و بصیرت کی بنا پر انہیں تسلیم کرتے ہیں۔

اصول غیر متبدّل ہوں

اس مذہب کے متعلق وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کے اصول غیر متبدّل ہونے چاہئیں۔ لیکن ان اصولوں کی جزئیات زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ بدلتی رہنی چاہیئے۔

وہائٹ ہیڈ اس ضمن میں لکھتا ہے کہ:۔

"زندگی کو مستقل طور پر ایک ہی قالب میں مقیّد رکھنا ناممکن ہے۔ اس لئے مذہب کو بھی سائنس کی طرح بدلتے ہوئے تقاضوں کا لحاظ رکھنا پڑے گا۔ اس کے اصول ابدی ہوسکتے ہیں" لیکن ان اصولوں کی تعبیرات تو حالات کے ساتھ بدلتی رہیں گی۔

(SCIENCE AND THE MODERN WORLD)

پروفیسر (CASSIRER) لکھتا ہے:۔

"قدیم الایّام کا مذہبی تصوّر انسانی آزادی کے لئے کوئی گنجائش نہیں رکھتا۔ وہ انسانی اعمال کے لئے ہی نہیں بلکہ انسانی جذبات تک کے لئے جامد اور ناقابلِ تغیّر قوانین مقرر کرتا ہے۔ اس سے انسانی زندگی ایک مستقل بوجھ کے نیچے دبی رہتی ہے۔ وہ قدم قدم پر "یہ کرو۔ یہ نہ کرو" کی زنجیروں میں جکڑی رہتی ہے۔"

قرآنِ کریم انسانی اعمال و جذبات کے لئے بڑا وسیع میدان کھلا رہتا ہے۔ اس نے صرف چند احکام اور قوانین دیئے ہیں۔ باقی معاملات کے لئے وہ صرف حدود (BOUNDARY LINES) مقرر کرتا ہے جن کے اندر رہتے ہوئے ہر زمانے کے انسان اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق اپنے لئے آپ جزئیات متعیّن کرتے ہیں۔ اس کی یہ حدود غیر متبدّل رہتی ہیں اور ان کے اندر مرتّب کردہ ضوابط، زمانے کے تقاضوں کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ وہ اپنے اصولوں کے متعلق کہتا ہے: وَتَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ صِدْقًا وَّعَدْلًا۔ لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِهٖ (۶/۱۱۶) "تیرے رب کے کلمات صدق و عدل کے ساتھ مکمل ہو گئے انہیں کوئی بدلنے والا نہیں"۔
جہاں تک ان اصولوں کی روشنی میں طے کئے جانے والے ضوابط کا تعلق ہے، وہ جماعتِ مومنین کے متعلق

کہتا ہے: وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸) " ان کے معاملات باہمی مشورہ سے طے پاتے ہیں"۔ اس طرح غیر متبدّل اور بدلنے والے عناصر کے امتزاج سے انسانی زندگی ترقی کرتے آگے بڑھتی چلی جائے گی۔ قرآن کی رُو سے زندگی ایک جوئے رواں ہے جسے ہر آن متحرک رہنا اور آگے بڑھتے چلے جانا چاہیئے۔ وہ زندگی کے رُک جانے کے مقام کو جہنّم کہتا ہے۔

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ یورپ نے اپنے سیاسی نظام کی بنیاد نیشنلزم اور جمہوریّت پر رکھی تھی اور اب وہ ان دونوں کے ہاتھوں بُری طرح تنگ آچکا ہے۔ قرآنِ کریم نے نیشنلزم کی جگہ عالمگیر انسانیّت کا نظام تجویز کیا ہے۔ یعنی ایسا نظام جس میں تمام نوعِ انسانی کو ایک عالمگیر برادری کے افراد تصوّر کیا جائے۔

عالمگیر انسانیّت کا قیام

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً (۲/۲۱۳) اس کا بنیادی اصول ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دنیا میں ثبات و دوام صرف اسی نظام کو حاصل ہو سکتا ہے جو کسی ایک پارٹی، ایک گروہ، ایک نسل، ایک قوم کے لئے نہیں بلکہ تمام نوعِ انسانی کے لئے یکساں طور پر منفعت بخش ہو۔ اس کا ارشاد ہے کہ: وَ اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ (۱۳/۱۷) اس قسم کے عالمگیر نظام کے قیام کے لئے ضروری ہے کہ تمام کرّۂ ارض کو اصولی طور پر ایک اقتدار کے تابع رکھا جائے۔ اس کے نزدیک یہ اقتدار ان مستقل اقدار کے سوا جو خدا نے بذریعہ وحی دی ہیں کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ (اس کی تفصیل ذرا آگے چل کر "جمہوریّت" کے تحت دی جائیگی۔)

اب دیکھیئے کہ اس باب میں مفکّرینِ مغرب کس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ پروفیسر، کوبن اپنی اس کتاب کے آخر میں جس کا ذکر پہلے آچکا ہے لکھتا ہے:۔

" دنیا کے مسائل کا جو حل سامنے آرہا ہے وہ یہی ہے کہ ایک عالمگیر مملکت کی تشکیل کی جائے"۔

یورپ کے مدبّرین نے نیشنلزم کی پیدا کردہ مصیبتوں کا حل "لیگ آف نیشنز" یا متحدہ اقوام جیسے انٹرنیشنل اداروں کے قیام میں سوچا۔ اس سلسلہ میں پولٹیکل سائنس کے ماہر (EMERY REVES) نے ایک مختصر لیکن بڑی جامع اور فکر انگیز کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے (THE ANATOMY OF PEACE) وہ اس میں لکھتا ہے:۔

" ہم انٹرنیشنلزم سے بھی کافی کھیل چکے ہیں۔ جو مسئلہ دنیا کے سامنے پیش ہے، وہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں

جو قوموں کے حل کرنے کا ہو۔ (وہ تو خود قوموں کا پیدا کردہ ہے) وہ مسئلہ یہ ہے کہ نیشنلزم کے نظریئے نے انسانی معاشرہ میں ایک فساد برپا کر دیا ہے۔ لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ خود نیشنلزم خواہ وہ انٹر نیشنلزم ہی کیوں نہ بن جائے، اس کا حل دریافت کر سکے۔ اس مسئلہ کا حل انسانی عالمگیریت ہے۔ یعنی ایک ایسا عقیدہ یا تحریک جس کا مقصد یہ ہو کہ وہ قومیت اور بین الاقوامیت کی سطح سے بلند ہو کر خالص انسانی سطح پر امن قائم کرنا چاہتی ہے۔"

یہی مفکر دوسرے مقام پر لکھتا ہے کہ:-

"کھلے کھلے الفاظ میں، بیسویں صدی کی قیامت خیزیوں کے بعد انسان لامحالہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اس کرۂ ارض کو کسی ایک اقتدار کے تابع لانا ضروری ہے۔ ہمارا فریضہ ہے کہ ہم کسی نہ کسی طرح جمہوری انداز سے اس اقتدارِ واحد کی تشکیل کریں۔ اس کے لئے ان بنیادی اصولوں کا اعلان کرنا چاہیئے جن پر یہ اقتدار متشکل ہوگا۔ اور اس کے بعد لوگوں کو اس کی طرف راغب کرنا چاہیئے تاکہ یہ مقصد خون ریزی کے بغیر حاصل ہو جائے۔ اگر اس اقتدار کا حصول اس طرح ممکن نہ ہوا تو پھر تاریخ کا فولادی ہاتھ مجبور کر دے گا کہ ہم اور خونریزی کریں۔ اور آج سے زیادہ مہلک آلاتِ حرب و ضرب وضع کریں تاکہ سب سے زیادہ طاقتور جماعت باقی دنیا کو مجبور کر کے وحدتِ اقتدار قائم کر لے۔"

اوّل تو یہ ناممکن نظر آتا ہے کہ اور زیادہ مہلک ہتھیاروں سے کسی ایک جماعت کو غلبۂ کلّی حاصل ہو جائے۔ نظر یہی آتا ہے کہ اس سے پوری نسلِ انسانی دنیا سے محو ہو جائے گی۔ لیکن اگر اس طرح کسی ایک جماعت نے واحد اقتدار قائم کر بھی لیا تو اس کی آہنی گرفت میں انسانیت کا جو حشر ہوگا اس کے تصوّر سے روح کانپتی ہے۔ قرآن کے پیش کردہ عالمگیر اقتدار کے معنی یہ ہیں کہ حکومت کسی انسان یا انسانوں کی کسی جماعت کے ہاتھ میں نہ رہے ——— وہ کسی انسان کو اس کا حق ہی نہیں دیتا کہ وہ دوسرے انسانوں پر حکومت کرے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ (جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے) یہ اقتدار ان غیر متبدّل اصولوں کو حاصل ہو جو تمام نوعِ انسانی پر یکساں طور پر نافذ ہوں اور جن میں تغیّر و تبدّل کا کسی کو اختیار نہ ہو۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ۔ (۱۲/۴۰) کے یہی معنی ہیں۔ یہ موقعہ نہیں کہ میں ان اصولوں کو تفصیلی طور پر پیش کروں۔ اس وقت صرف اتنا کہ دینا کافی ہوگا کہ ان اصولوں کے لئے خود مغرب کے مفکّرین اور مدبّرین بے حد مضطرب و

بے تاب ہیں۔

جہاں تک اندازِ حکومت کا تعلق ہے، قرآن کا اصول یہ ہے کہ مملکت کے قانون سازی کے اختیارات غیر مقیّد (UN-RESTRICTED) نہیں۔ وہ صرف ان حدود کے اندر رہتے ہوئے قوانین مرتّب کرسکتی ہے جو وحی کے غیر متبدّل عالمگیر اصول متعیّن کرتے ہیں۔ ان اصولوں میں تغیّر کرنا یا انہیں بدلنا مملکت کے حیطۂ اقتدار سے باہر ہے۔ مغربی تصوّرِ مملکت میں خواہ طرزِ حکومت جمہوری ہو یا آمرانہ ــــــ قانون سازی کے اختیارات مطلق (ABSOLUTE) ہوتے ہیں اور اسی سے وہ تمام خرابیاں پیدا ہوتی ہیں جن سے یورپ اس وقت دوچار ہے۔ میزینی اس باب میں لکھتا ہے:۔

قرآنی جمہوریّت

"اگر ہمارے پاس کوئی ایسا مقدّس اور ناقابلِ تغیّر قانون نہ ہو جو انسانوں کا وضع کردہ نہ ہو، تو ہمارے پاس وہ کونسی میزان رہ جاتی ہے جس سے ہم پرکھ سکیں کہ فلاں کام بافیصلہ عدل پر مبنی ہے یا نہیں۔ خدا کے علاوہ جو حکومت بھی قائم ہو، اس میں نتائج کی حقیقت ایک سی رہتی ہے، خواہ اس کا نام بونا پارٹ رکھ لیں یا انقلاب۔ اگر خدا درمیان میں نہ رہے تو اپنے زمانہ سطوت میں ہر ایک مستبد بن جائے گا۔ یاد رکھئے جب تک کوئی حکومت خدا کے قوانین کے مطابق نہیں چلتی اس کا کوئی حق مسلّم نہیں۔ حکومت تو منشائے خداوندی کو رائج اور نافذ کرنے کے لئے ہے۔ اگر وہ اپنے اس فریضہ کی سرانجام دہی میں قاصر ہے تو تمہارا یہ حق ہی نہیں بلکہ فریضہ ہے کہ تم ایسی حکومت کو بدل ڈالو۔" (C.F. INTERPRETTERS OF MAN)

قرآنِ کریم، حکومت کو قوانینِ خداوندی کے نافذ اور مستقل اقدار کے رائج کرنے کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ اس کا واضح ارشاد ہے کہ: وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ۔ (۵/۴۴) "جو خدا کے نازل کردہ قوانین کے مطابق حکومت نہیں کرتے تو یہی لوگ ہیں جنہیں کافر کہا جاتا ہے۔" البتہ، جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے، ان قوانین کی جزئیات مرتّب کرنے اور ان کے نفاذ کے لئے اسباب و ذرائع اختیار کرنے کا کام نمائندگانِ ملّت کے باہمی مشورہ سے ہوگا۔ اس حد تک یہ حکومت جمہوری ہوگی۔

یوں تو مادّی نظریۂ حیات نے زندگی کے ہر شعبہ میں فساد پیدا کیا ہے۔ لیکن معاشی گوشے میں

اس کی تباہیاں بڑی انسانیت سوز ثابت ہوئی ہیں۔ عیسائیت کے اس عقیدہ نے کہ غریبوں کی بادشاہت آسمان میں ہے، زمین پر نہیں، رزق کے تمام سرچشموں کو بے محابا "دنیاداروں" کے سپرد کر دیا۔ اس سے...... وہاں کے نظامِ سرمایہ داری کو بڑی تقویت ملی۔ اس کا ردِّعمل کمیونزم کی شکل میں رونما ہوا۔ کمیونزم میں ایک چیز ہے اس کا معاشی نظام (ECONOMIC ORDER) اور دوسری چیز ہے، وہ فلسفۂ زندگی، جس پر اس معاشی نظام کی عمارت استوار ہے۔ اس کے معاشی نظام کے

معاشی نظام

بعض اجزا قرآن کے معاشی نظام سے ملتے جلتے ہیں (قرآنی نظام سرمایہ داری کا شدید دشمن ہے) لیکن اس کا فلسفۂ زندگی جو مادی تصوّرِ حیات کی شدید ترین شکل کا مظہر ہے، قرآنی تصوّرِ زندگی کی نقیض ہے اس لئے اسلام کے نزدیک یکسر ناقابلِ قبول۔ کمیونزم کا بنیادی اصول یہ ہے کہ "جو کچھ...... معاشی نقطۂ نگاہ سے اچھا ہے، وہی اخلاقی نقطۂ نگاہ سے اچھا ہے (WHAT IS ECONOMICALLY GOOD IS MORALLY GOOD) کمیونزم کے معاشی نظام کی بنیاد اس نظریہ پر ہے کہ "ہر شخص زیادہ سے زیادہ محنت کرے اور اس میں سے صرف اپنی ضروریات کے مطابق لے۔" قرآن کا بھی یہی نظریہ ہے۔ لیکن کمیونزم کے فلسفہ کی رُو سے اس سوال کا جواب کسی کو نہیں مل سکتا کہ ایک شخص زیادہ سے زیادہ کما کر کم از کم اپنے لئے کیوں رکھے، اور باقی سب دوسروں کو کیوں دے دے؟ اس کا اطمینان بخش جواب صرف قرآنی تصوّرِ حیات کی رُو سے مل سکتا ہے۔ اس تصوّر کی رُو سے جس طرح انسانی جسم کی پرورش ہر اُس شے سے ہوتی ہے جسے کوئی فرد خود استعمال کرے۔ اس کی ذات کی نشوونما اس سے ہوتی ہے جسے وہ دوسروں کی پرورش کے لئے دے۔ اور چونکہ ذات کی نشوونما بلند ترین مقصدِ زندگی ہے، اس لئے اس تصوّر پر ایمان رکھنے والا انسان کوشش کریگا کہ وہ زیادہ سے زیادہ کمائے اور پھر زیادہ سے زیادہ دوسروں کی نشوونما کے لئے دیدے۔ یوں وہ مقصد، جو کمیونزم آہنی پردوں کے پیچھے استبداد کے ڈنڈے سے حاصل کرنے کی ناکام کوشش کرتی ہے، قرآنی نظام میں از خود، بطیبِ خاطر، حاصل ہوتا چلا جاتا ہے۔

پروفیسر (HAWTREY) نے لکھا ہے:-

"جو چیز ایک معاشی نظام کو دوسرے معاشی نظام سے ممیّز کرتی ہے، یہ ہے کہ اس نظام میں وہ جذبۂ محرکہ کیا ہے جس سے وہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ کام کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔"

کمیونزم کا مادی نظریۂ حیات، اس مقصد کے لئے کوئی جذبۂ محرکہ پیدا نہیں کر سکتا۔ اس کے برعکس، قرآنی نظریۂ حیات ایسا مستحکم جذبۂ محرکہ عطا کرتا ہے جو کبھی ٹھنڈا نہیں پڑ سکتا۔ (جو احباب اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہوں، وہ میری کتاب "نظامِ ربوبیت" کا مطالعہ فرمائیں)۔ مغرب نے اپنے نظامِ سرمایہ داری کو بھی آزما کر دیکھ لیا اور کمیونزم کی تباہ کاریاں بھی دنیا کے سامنے آگئیں۔ اب دنیا کو ایک ایسے معاشی نظام کی تلاش ہے، جس میں نہ نظامِ سرمایہ داری باقی رہے اور نہ کمیونزم۔ اور جس سے روٹی کا مسئلہ فرد کی انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے حل ہو جائے۔ یہ نظام قرآن کے علاوہ اور کہیں نہیں مل سکتا۔

برادرانِ عزیز! آپ نے دیکھ لیا کہ مغرب نے جو تصورِ حیات اختیار کیا تھا، اس کے تباہ کن نتائج سے وہ کس قدر ہراساں و پریشان ہے اور اب کس طرح جدید نظام کی تلاش میں مضطرب و سرگرداں۔ یہ نظام اسے قرآن کے سوا کہیں سے نہیں مل سکتا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ قرآن کا نام لینے والی قومیں زندگی کی دوڑ میں اقوامِ مغرب سے بھی پیچھے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ آگے بڑھنے والی قومیں کبھی ان قوموں کی بات کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا کرتیں جو خود ان کی دست نگر ہوں۔ مسلمانوں کے لئے خود عزت کا مقام حاصل کرنے اور دنیا کو موجودہ جہنم سے نجات دلانے کا ایک ہی طریقہ ہے، اور وہ یہ کہ کسی ایک خطۂ زمین میں قرآنی نظام کو عملاً رائج کر کے اس کے انسانیت ساز نتائج سامنے لائے جائیں۔ ان نتائج کو دیکھ کر دنیا خود بخود اس کی طرف لپک کر آئے گی، اور اس طرح جنت سے نکلا ہوا آدم، اپنے فردوسِ گم گشتہ کو پھر سے پالیگا۔

میری آرزو ہے کہ یہ خطہ، پاکستان کی سرزمین ہو۔ یہی طلوعِ اسلام کی تحریک کا مقصد ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

(سنہ ۱۹۶۱ء)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مثالی مملکت

(طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۶۲ء کا خطاب)

"تمام ناکامیوں میں سب سے بڑی ناکامی خود انسان کی ہے۔ اُس انسان کی جو سب سے زیادہ مدنی الطبع حیوان اور سب سے زیادہ عقلمند ہے۔ اور وہ ناکامی یہ ہے کہ یہ اپنے لئے آجتک کوئی ایسا نظام وضع نہیں کر سکا جسے دُور سے بھی، اچھی حکومت کہا جا سکے۔ اُس نے اس باب میں بڑی بڑی کوششیں کی ہیں۔ بہت سی ایسی جو فی الواقعہ محیّر العقول ہیں۔ اور بہت سی ایسی جو بڑی جرأت آزما تھیں۔ لیکن جب اُن کی عملی تنفیذ کا وقت آیا تو نتیجہ حسرت و یاس کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ نظری طور پر حکومت کا خاکہ کھینچ لینا اور بات ہے اور عملی طور پر اُسے نافذ کرنا اور بات۔ نظری طور پر حکومت اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ افرادِ مملکت کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کا ذریعہ ہے اور اربابِ حکومت پبلک کے خادم ہیں لیکن درحقیقت حکومت کا فریضہ، پبلک کی خدمت نہیں، بلکہ سلب و نہب ہو جاتا ہے۔"

یہ الفاظ عہدِ قدیم کے کسی سیاست دان یا مفکر کے نہیں، جو اس نتیجہ پر اُس زمانے میں پہنچا ہو جب انسان نے ہنوز محض دو ایک اسالیبِ حکومت کا تجربہ کیا تھا اور اُسے ان نظامہائے مملکت کا علم نہیں تھا جنہیں انسان نے بعد میں وضع اور اختیار کیا۔ اگر اس کے سامنے، بعد کے وضع کردہ نظام ہوتے تو وہ اس نتیجہ پر نہ پہنچتا۔ یہ الفاظ خود ہمارے زمانے کے ایک ماہرِ سیاست (H.J. MENCKEN) کے ہیں جنہیں اس نے اپنی کتاب (TREATISE ON RIGHT AND WRONG) میں عہدِ قدیم سے لے کر عصرِ حاضر

تک کے تمام نظامہائے حکومت، کا جائزہ لینے کے بعد لکھا ہے۔ اس میں مغرب کا وہ جمہوری نظام بھی

جمہوری نظام

شامل ہے جو اس وقت تک کی فکرِ انسانی کی آخری ایجاد ہے اور جس پر یورپ کو بڑا ناز ہے (یا بڑا ناز تھا)۔ اس، سب سے آخری نظام کے متعلق پروفیسر مینکن لکھتا ہے کہ

"ان مختلف، اسالیبِ حکومت میں سب سے زیادہ ناکام، نظامِ جمہوریّت رہا ہے۔ جمہوری نظام کے اربابِ حل وعقد خوب جانتے ہیں کہ حکومت کی بنیاد معقولیّت پر ہونی چاہیئے۔ لیکن ان کا جذبۂ محرکہ کبھی معقولیّت پسند نہیں ہوتا۔ ان کا کام یہ ہوتا ہے کہ جو عنصر بھی باہر سے زیادہ دباؤ ڈال سکے، اس کا ساتھ دیا جائے۔ چنانچہ اس ہتھکنڈے سے، یہ لوگ ان عناصر کے توسّط سے جو فی الحقیقت پبلک کے دشمن ہوتے ہیں، لامتناہی عرصہ تک برسرِ اقتدار رہتے ہیں۔"

مغرب کے جمہوری نظام کی ناکامی کی اصلی وجہ کیا ہے، اس کے متعلق ہم بعد میں دیکھیں گے۔ سرِ دست، صرف اتنا دیکھئے کہ مؤرّخین اور مفکّرین کی رائے یہ ہے کہ انسان نے اپنی تمدّنی زندگی کے پانچ چھ ہزار سال کے عرصہ میں جس قدر اسالیبِ حکومت وضع کئے ہیں، ان میں ایک بھی کامیاب ثابت نہیں ہوا۔ سب ناکام رہے ہیں۔ میں نے "مؤرّخین اور مفکّرین" اس لئے کہا ہے کہ انسان نے سابقہ نظامہائے حکومت کے ناکام تجارب کے بعد جس جمہوری نظام کو اختیار کیا تھا، اس کے ہاتھوں یورپ کے قریب قریب تمام اربابِ فکر و نظر تنگ آچکے ہیں۔ اور اس کی بجائے کسی بہتر نظام کی تلاش میں مضطرب و بے قرار پھر رہے ہیں (تفصیل ان امور کی میری کتاب "انسان نے کیا سوچا" میں ملے گی)۔

سوال یہ ہے کہ انسان نے، اتنے طول طویل عرصہ میں، اس قدر مختلف اور متنوّع تجربے کئے تو اس کی کیا وجہ تھی کہ ان میں کوئی تجربہ بھی کامیاب ثابت نہ ہوا۔ سب ناکام رہ گئے۔ انسان کی مایوس کن ناکامی کے اسباب و

ناکامی کی وجہ کیا ہے؟

وجوہات کی تفصیل میں جائیں تو نہ معلوم داستان کس قدر طویل ہو جائے۔ لیکن اسے اگر چند لفظوں میں سمیٹنا چاہیں تو اس ناکامی کی بنیادی وجہ یہ سامنے آئے گی، کہ انسان نے جو نظامِ حکومت بھی وضع کیا، اس میں حکومت کا اختیار و اقتدار، انسانوں کے ہاتھ میں تھا۔ مختلف زمانوں میں حکومت کی شکلیں بدلتی رہیں، لیکن روح ہر پیکر میں یہی کارفرما رہی۔ وہ قدیم ترین زمانے کا قبائلی نظام تھا، یا بعد کا شاہنشاہی نظام" وہ مذہبی پیشوائیت کے سہاروں پر قائم شدہ

خداوندی اختیارات (DIVINE RIGHTS) کا حامل نظام تھا، یا خدا کو حدودِ مملکت سے باہر نکال کر، سیکولر انداز کا نظام، وہ عصرِ حاضر کا ڈکٹیٹر شپ کا نظام تھا یا انسانی ذہن کی آخری تصنیف ——— جمہوری نظام، اِن سب میں ایک ہی حقیقت کارفرما رہی اور کارفرما ہے۔ اور وہ یہ کہ ان میں حکومت کا اقتدار انسانوں کے ہاتھ میں تھا ——— وہ ایک انسان ہو یا انسانوں کی جماعت، اس نے قوتِ بازو سے سلطنت حاصل کی ہو یا وہ لوگوں کا منتخب کردہ ہو، اس کا نتیجہ، آلڈس ہکسلے کے الفاظ میں یہ کہ

"تاریخ میں کوئی زمانہ بھی ایسا نہیں گزرا جو یہ بتائے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں قوت و اقتدار آیا ہو ان میں سرکشی نہ پیدا ہو گئی ہو اور ایسا باور کرنے کے لئے کوئی وجہ موجود نہیں کہ جو کچھ پیچھے سے ہوتا چلا آ رہا ہے وہ آج نہیں ہوگا یا آئندہ بھی ایسا ہی نہیں ہوتا رہے گا۔"

(SCIENCE, LIBERTY AND PEACE)

"تشکیلِ انسانیت" کا مصنّف برقو، اس سلسلہ میں لکھتا ہے:۔

نشۂ اقتدار کی بدمستیاں

یہ بیماری لازمی اور لاعلاج ہے۔ ارادے کتنے ہی نیک کیوں نہ ہوں، جب اقتدار ہاتھ میں آجائے تو اس کے مہلک اثرات سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ نشۂ اقتدار وہ بلا ہے جس سے انسانی قلب کی ہر حرکت اُلٹی ہو جاتی ہے۔ ہر شے ٹیڑھی نظر آتی ہے۔ ہر نقطۂ نگاہ باطل ہو جاتا ہے۔ ہر فیصلہ میں ذاتی رجحانات کی رنگ آمیزی ہو جاتی ہے۔ ہر معاملہ میں تعصّب دخیل ہو جاتا ہے۔ تمام ذہنی سکّے، فریب کے ٹیکسال میں ڈھلنے شروع ہو جاتے ہیں۔ پُرفریب اقتدار دل و دماغ پر مستولی ہو جاتا ہے۔"

اسی حقیقت کو ہمارا حکیمِ مشرق ان الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں — سو بار ہوئی حضرتِ انساں کی قبا چاک
تاریخِ امم کا یہ پیامِ ازلی ہے — صاحبِ نظراں! نشۂ قوت ہے خطرناک
اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے — عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

"اسکندر و چنگیز" کی طرف اشارہ کرنے سے یہ مقصود نہیں کہ انسانیت کی یہ تباہیاں، صرف شخصی حکمرانوں کے ہاتھوں سے آئی ہیں۔ جمہوری حکومت میں بھی یہی کچھ ہوتا ہے۔ اس لئے کہ

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام — جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری!

سوال شخصی اور جمہوری حکومت کا نہیں۔

"ایک انسان کا دوسرے انسان پر اقتدار و اختیار خواہ وہ کسی رنگ میں ہو، استبداد ہے۔ طاقتور ہمیشہ کمزور کے حقوق کو غصب کرتا ہے۔ قوّت، عدل و انصاف کو پامال کر دیتی ہے۔ اس لئے ظالم و جابر ہوتی ہے۔ یہ انکشاف آج کا نہیں، بہت قدیمی ہے کہ اقتدارِ مطلق بنیادی طور پر باطل ہے خواہ یہ کسی کے ہاتھ میں بھی کیوں نہ ہو۔ لارڈ ایکٹن نے ٹھیک کہا تھا کہ قوّت انسان کو خراب کر دیتی ہے، اور مطلق قوّت، اسے بالکلیہ خراب کر دیتی ہے۔ نشۂ اقتدار سے انسان میں معقولیّت کے ساتھ سوچنے کی صلاحیّت ہی باقی نہیں رہتی۔ قوّت کسی رنگ میں ہو، اس کے یہی نتائج ہوں گے۔ وہ جاہ و منصب کی ہو یا پنجۂ فولاد کی' دولت کی ہو یا محض ذہنی برتری کی' دفاتری زندگی میں کسی افسر کی ہو یا حاکم کی' کسی پادری کی ہو یا پروہت کی' قوّت بہرحال قوت ہے اور فساد کی جڑ۔ اس کا لازمی نتیجہ ظلم اور بیدادگری ہوتا ہے اور ان سب میں سب سے زیادہ خراب قوّت وہ ہے جو اکثریّت، محض اپنی تعداد کے زور پر، اقلیّت کے خلاف استعمال کرتی ہے۔ (برفو۔ تشکیلِ انسانیّت)

کمیونزم یورپ کے سرمایہ دارانہ جمہوری نظام کے خلاف کمیونزم نے آواز بلند کی تھی اور دنیا کے مزدوروں کو پکار کر کہا تھا کہ "اس لعنت کے خلاف متحدہ طور پر محاذ قائم کر دو۔ اس میں سوائے تمہاری زنجیریں ٹوٹ جانے کے اور کوئی نقصان نہیں ہوگا"۔ جور و استبداد کے ستائے ہوئے انسانوں نے، اس آواز کو نویدِ مسیحا سمجھا اور اس آئینِ نو کو گلے سے لگایا۔ لیکن تجربہ نے جلد ہی بتا دیا کہ کمزوروں کو آزادی اس سے بھی نہیں نصیب ہو سکتی ؎

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا!
طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

لارڈ اسنل اس کی وجہ یہ بتاتا ہے کہ

"حکومتیں انسانوں پر مشتمل ہوتی ہیں اور ہر انسان میں وہ کمزوریاں پائی جاتی ہیں جو نوعِ انسان کا خاصہ ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ قوانین وضع کرتے ہیں اور ملک کی پالیسی کی تشکیل کرتے ہیں"

وہ دوسرے لوگوں سے کسی طرح بھی زیادہ شریف یا زیادہ ہوش مند نہیں ہو سکتے"۔ (THE NEW WORLD)

اس سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ انسان فطرتاً ایسا واقع ہوا ہے کہ وہ کوئی قابلِ اطمینان نظامِ حکومت قائم نہیں کر سکتا۔ لیکن برٹرنڈ رسل اسے انسان کی بدفطرتی پر محمول نہیں کرتا۔ وہ اپنے اسی نظریہ کو دہراتا ہے کہ

"قوت بہرحال قوت ہے اور فساد کی جڑ۔ اس کا لازمی نتیجہ ظلم اور بیدادگری ہوتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ ہر شخص فطرتاً بدواقع ہوا ہے بلکہ اس لئے کہ قوت کا نشہ ہی ایسا ہوتا ہے"۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ انسان اپنے پانچ چھ ہزار سال کے ناکام تجارب کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ جب تک اقتدار انسانوں کے ہاتھ میں رہے گا (خواہ وہ ایک انسان ہو یا انسانوں کی جماعت) دنیا میں اطمینان بخش نظامِ تمدن و مملکت قائم نہیں ہو سکے گا۔ ایسے نظام کے قیام کے لئے اوّلین اور بنیادی شرط یہ ہے کہ حکومت کا اختیار اور اقتدار کسی انسان کے ہاتھ میں نہ رہے۔

سوال یہ ہے کہ جس نتیجہ پر انسان، اتنے طویل المیعاد تجربات اور اس قدر جانکاہ مشقتوں اور جگر پاش مصیبتوں کے بعد پہنچا ہے، جس نتیجہ تک پہنچنے کے لئے اسے اس قدر خون کے دریا بہانے اور آگ کی خندقیں پار کرنی پڑیں، جس کے لئے انسانیت صدیوں تک تڑپتی، پھڑکتی، لٹتی جھلستی اور ذبح ہوتی رہی، کیا یہ آواز اس سے پہلے بھی کہیں سے سنائی دی تھی۔ اور اگر سنائی دی تھی تو اس نے کیا نتیجہ پیدا کیا تھا؟ ہاں! یہ آواز آج سے قریب ڈیڑھ ہزار برس پہلے، عرب کی سرزمین میں، جہاں اس سے پہلے علم و بصیرت کی کرن تک کا گزر نہ ہوا تھا، ایک صحرا نشین ؐ کی زبان سے بلند ہوئی تھی جس نے وحیٔ خداوندی کے

زبانِ وحی کا اعلان

الفاظ میں ساری دنیا کو للکار کر کہا تھا کہ: اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ۔ (۱۲/۴۰)

حکومت کا حق خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں ؎

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

وہ اپنے اس حقِ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهٖٓ اَحَدًا۔ (۱۸/۲۶) اور حقیقت یہ ہے کہ اس حق میں کسی کو شریک کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ معلوم کائنات کی ساری مخلوق میں انسان کا مقام سب سے اونچا ہے۔ جب انسان اس حقِ خداوندی میں شریک نہیں تو اس کے بعد، اس میں اور کون شریک ہو سکتا ہے۔

برگساں نے کہا تھا کہ

"مملکت کا اقتدارِ اعلیٰ، انسانوں پر نہیں بلکہ اشیاء پر ہونا چاہیئے، تاکہ ایک انسان کا دوسرے انسان پر کوئی اقتدار نہ ہو۔"

(THE TWO SOURCES OF MORALITY AND RELIGION)

جہاں تک اشیائے کائنات پر اقتدار کا تعلق ہے، زبانِ وحی نے انسانوں سے کہہ دیا کہ: وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ۔ (۴۵/۱۳) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے، خدا نے سب کو، اپنے قوانین کی زنجیروں میں جکڑ دیا تاکہ انسان، ان سے اپنی مرضی کے مطابق کام لے۔" آدم کے سامنے ملائکہ کے سجدہ ریز ہونے سے مفہوم ہی یہ ہے کہ انسان، کائنات کی ہر قوّت کو مسخّر کر سکتا ہے۔ اس لئے اشیائے کائنات پر انسان کا کلّی اقتدار ہے لیکن جہاں تک خود انسانوں کا تعلّق ہے، خدائے کائنات نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۳/۷۸) کسی انسان کے ...... شایانِ شان نہیں کہ خدا اسے ضابطۂ قوانین؛ ان قوانین کو نافذ کرنے کا اختیار اور نبوّت تک بھی دے دے تو وہ دوسرے انسانوں سے کہے کہ تم خدا کی محکومی کو چھوڑ کر میری محکومی اختیار کرو ——— اسے پھر سُن لیجئے کہ خدا

لیکن انسانوں پر نہیں

نے یہ کہا ہے کہ دنیاوی حکومت کی مسندوں پر براجمان ہو جانے والے تو ایک طرف رہے کسی نبی کو بھی اس کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ انسانوں پر اپنی حکومت چلائے۔ وہ یہی کہے گا کہ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ (۱۹/۳۰) میں خود خدا کا محکوم ہوں ' اس لئے مجھے حقِ حکومت کس طرح حاصل ہو سکتا ہے؛

برادرانِ عزیز! غور کیجئے، اس سے بڑا انقلابی اعلان، کائنات کی فضاؤں میں کہیں اور بھی سنا گیا ہے؟ وہ اعلان جس نے اس تصوّر کو یکسر باطل قرار دے دیا کہ کسی انسان کو دوسرے انسان پر کسی قسم کا اقتدار و اختیار حاصل ہے۔ اس اعلانِ عظیم نے انسانوں کے خود ساختہ ایوانہائے حکومت و سطوت کی بنیادوں تک کو ہلا دیا۔ اور غلامی اور محکومی کی ان تمام زنجیروں کو توڑ کر رکھ دیا جس میں انسانیت صدیوں سے جکڑے چلی آ رہی تھی۔ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ——— (۷/۱۵۷) خواہ یہ زنجیریں، دنیاوی حکمرانوں کے تغلّب و تسلّط نے انسانوں کی گردن میں ڈال رکھی ہوں اور خواہ مذہبی

پیشوائیت نے تقدس و عقیدت کے ہاتھوں، انہیں لوگوں کے دل و دماغ کے گرد لپیٹ ہو۔ اس زلزلہ انگیز اعلانِ حریت نے ان تمام زنجیروں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور انسان کو دنیا میں گردن اٹھا کر چلنے کے قابل بنا دیا۔

خدا کی حکومت سے مفہوم

یہاں سوال یہ سامنے آتا ہے کہ "خدا کی حکومت سے مفہوم کیا ہے"؟ خدا نہ کسی کے سامنے آتا ہے نہ اس کا تختِ حکومت کہیں بچھا ہوا نظر آتا ہے۔ نہ کسی نے اُسے کوئی حکم دیتے دیکھا ہے، نہ اس کی آواز سنی ہے۔ پھر اس کی حکومت کے معنی کیا ہیں؟ کیا اس سے مراد، انسانوں کا، خدا کے نام پر حکومت کرنا ہے؟ کیا اس سے مطلب یہ ہے کہ بعض انسانوں کو خدائی اختیارات حاصل ہوتے ہیں اگر یہی مطلب ہے تو، تاریخ کے اوراق اس پر شاہد ہیں کہ اس سے بڑھ کر انسانی استبداد اور سخت گیری کی مثال کسی اور اندازِ حکومت میں نہیں ملے گی؟ انسان نے جس قدر خدا کا نام لے کر دوسرے انسانوں کو ستایا ہے، شیطان کے حصے میں اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں آیا ہوگا۔ اور تماشا یہ کہ نمرود و فرعون اور ہلاکو اور چنگیز نے اگر انسانوں پر مظالم روا رکھے تو دنیا آج تک اُن کا نام لعنت اور پھٹکار سے لیتی ہے۔ لیکن جن "مقدسین کے طائفہ" نے ان سے کہیں زیادہ انسانیت کے خونِ ناحق سے اپنے ہاتھ رنگے، ان کے مجسمے پرستش گاہوں میں نصب کئے گئے۔ لہٰذا خدا کی حکومت سے یہ مفہوم تو ہو نہیں سکتا۔ وہ قرآن جو کسی نبی تک کو انسانوں پر حکومت کرنے کا حق نہیں دیتا، عام انسانوں کو اختیاراتِ خداوندی استعمال کرنے کا حق کیسے دیگا؟

آپ دیکھئے کہ انسانی اقتدار و اختیار سے مراد کیا ہے؟ انسان دوسرے انسانوں پر کس طرح حکومت کرتا ہے؟ آپ عہدِ قدیم کے بے آئینی کے دور کو چھوڑ دیئے، جب ایک انسان محض قوت کے زور پر

انسانی اقتدار سے مراد

دوسرے انسانوں پر حکومت کرتا تھا۔ ہمارے زمانے میں یہ حکومت "قانون" کے ذریعہ ہوتی ہے۔ جس انسان یا انسانوں کی جماعت کو، قانون سازی کا حق ہوتا ہے زمامِ اقتدار اسی کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ وہ جماعت جو کچھ کرنا چاہتی ہے پہلے اس کے لئے ایک قانون وضع کر لیتی ہے۔ اس کے بعد، اس کا ہر قدم، قانون کے مطابق (LEGEL) ہو جاتا ہے اور ہر حرکت، آئینی (CONSTITUTIONAL) قرار پا جاتی ہے۔ اس کا نام انسانوں کی ڈکشنری میں "مہذب طرزِ حکومت" یا عادلانہ اندازِ مملکت ہے۔ لیکن اگر الفاظ کے ان حسین و جمیل پردوں کو ہٹا کر، اصل حقیقت کو دیکھیں تو آلڈوس ہکسلے کے الفاظ میں :-

اس باب میں دورِ جاہلیت اور عہدِ حاضر میں بس یہ فرق نظر آئے گا کہ ہم کھلے ہوئے تشدد کی دنیا سے فریب کاری کی دنیا کی طرف بڑھتے چلے آرہے ہیں۔ (ENDS AND MEANS)

قانون سازی کا حق

قرآن قانون سازی کا حق کسی انسان، یا انسانوں کی جماعت کو نہیں دیتا۔ وہ قانون کے سرچشمہ اور ماخذ کو اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے۔ وَعِنْدَہٗ اُمُّ الْکِتَابِ (۱۳/۳۹) وہ کہتا ہے کہ انسانی زندگی کے لئے جس قدر قوانین و ضوابط کی ضرورت تھی ان کے اصول و حدود، خدا نے متعین کر دیئے ہیں جن میں تغیر و تبدل کا حق کسی کو حاصل نہیں۔ وَتَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ط لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِہٖ (۶/۱۱۶) اب انسانوں کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ اِن اصولی قوانین کی روشنی میں پیش آمدہ معاملات کا فیصلہ کرتے جائیں۔ خدا نے یہ قوانین، قرآن کریم کے اندر منضبط و محفوظ کر دیئے۔ اور اس کے بعد اور تو اور خود نبی اکرمؐ سے کہہ دیا کہ: فَاحْکُمْ بَیْنَھُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ (۵/۴۸) ان کے معاملات کے فیصلے، انہی قوانین کی روشنی میں کرتے جاؤ۔ اور دوسری طرف یہ اعلان کر دیا کہ

وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)

جو لوگ اس کے مطابق فیصلے نہیں کریں گے جو خدا نے نازل کیا ہے انہیں کافر کہا جائیگا۔

ان اصولی قوانین کو مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کہا جاتا ہے۔ مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے حالات کے مطابق، ان اقدار کو نافذ کرنے کے لئے عملی تدابیر سوچے اور ذرائع و وسائل بہم پہنچائے۔ اس کا "حقِ قانون سازی" صرف اس حد تک محدود ہوگا۔ یہی وہ بنیادی اصولِ مملکت ہے جس کے متعلق پروفیسر جوڈ نے کہا تھا کہ

"اچھی زندگی سے مفہوم یہ ہے کہ انسان مستقل اقدار کو حاصل کر سکے۔ بنابریں میں کہہ سکتا ہوں کہ مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ایسے حالات پیدا کرے جن میں ایک انسان کے لئے مستقل اقدار کا حصول ممکن ہو جائے۔ سوسائٹی کی ترقی کا یہی ایک پیمانہ ہے۔"

(GUIDE TO THE PHILOSOPHY OF MORALS AND POLITICS)

مادّی اقدار

قرآن کریم جب مملکت کو مستقل اقدار کے تحفّظ کا ذریعہ بناتا ہے تو اس سے یہ مطلب نہیں کہ وہ محض اخلاقی اقدار (ETHICAL VALUES) کا تحفّظ چاہتا ہے

اور مادی اقدار (MATERIAL VALUES) سے اسے کچھ سروکار نہیں۔ وہ نظامِ مملکت کو مادی اقدار کے تحفّظ کا بھی ضامن قرار دیتا ہے، اس لئے کہ انسان کی موجودہ سطحِ زندگی پر، اخلاقی اقدار، مادی ذرائع سے ہی بروئے کار آتی ہیں۔ اسی لئے قرآن (SOUND MIND IN A SOUND BODY) ——— توانا جسم میں توانا قلب ——— کے اصول کا قائل ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کا بہم پہنچانا نظامِ مملکت کی ذمہ داری ہے۔ اس کے لئے مملکت، خدا کی طرف سے یہ ذمّہ داری اپنے اوپر لیتی ہے اور افرادِ معاشرہ کو اس کی ضمانت دیتی ہے کہ، نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ (۶/۱۵۲) تمہیں اور تمہاری اولاد کو سامانِ زندگی بہم پہنچانے کی ذمّہ داری ہم پر ہے۔ جب تک مملکت اس فریضۂ خداوندی کو ادا کرتی رہتی ہے، وہ خدا کی حفاظت میں رہتی ہے۔ جب وہ اس سے غافل ہو جاتی ہے، خدا کی ذمّہ داری بھی ختم ہو جاتی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے نبیِ اکرم ؐ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ:-

> اگر کسی بستی میں کوئی ایک شخص بھی اس حالت میں صبح کرے کہ وہ رات بھر بھوکا رہا ہو، تو اُس بستی کے رہنے والوں سے خدا کی حفاظت کی ذمّہ داری ختم ہو جاتی ہے۔

اور اسی عظیم ذمّہ داری کا احساس تھا جس کی بنا پر حضرت عمرؓ نے کہا تھا کہ "اگر دجلہ کے کنارے ایک کتا بھی بھوک سے مر گیا تو خدا کی قسم عمرؓ سے اس کی بھی باز پُرس ہو گی"۔ بنیادی ضروریاتِ زندگی میں روٹی، کپڑا، مکان، علاج، سب کچھ آجاتا ہے۔ اس کے علاوہ مملکت کا فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ افرادِ معاشرہ کی ذہنی اور قلبی صلاحیتوں کی نشوونما کا سامان بہم پہنچائے۔ اس لئے کہ قرآن نے اسلامی مملکت کے فرائض کے ضمن میں یہ بھی کہا ہے کہ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ۔ (۲۲/۴۱) وہ سامانِ نشوونما بہم پہنچاتی ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ (۲۳/۴) وہ لوگوں کی صلاحیتوں کی نشوونما کی تدابیر کرتے ہیں۔ پروفیسر میکیؔ نے کہا تھا کہ نظری طور پر مملکت، افرادِ مملکت کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کا ذریعہ ہے۔ لیکن قرآن نے اس سے بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ نظری طور پر ہی نہیں بلکہ عملی طور پر، مملکت کی ذمّہ داری ہے کہ وہ افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی مہیا کرے۔ اور ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کے سامان و ذرائع بہم پہنچائے۔

یہ مملکت، اس سامانِ پرورش اور اسبابِ نشوونما کو صرف اپنے شہریوں تک محدود نہیں رکھے گی۔ ایسی خدا کے احکام و قوانین کو جاری و ساری کرنے کے لئے وجود میں آتی ہے جو ربّ العٰلمین اور ربّ النّاس ہے۔

تمام انسانوں کی پرورش

یعنی تمام بنی نوعِ انسان کا پرورش کرنے والا۔ اس لئے یہ مملکت، اس باب میں انسان اور انسان میں کوئی فرق نہیں کرے گی۔ اس ضمن میں قوم، ملک، رنگ، نسل، زبان، حتیٰ کہ مذہب تک کا اختلاف بھی کوئی تفریق پیدا نہیں کرے گا۔ اس کے لئے بس "انسان" ہونا کافی ہوگا ــــ وہ کسی ملک کا رہنے والا ہو، کسی قوم کا فرد ہو، کسی نسل سے متعلق ہو، کوئی زبان بولتا ہو اور اس کا مذہب بھی کچھ ہی کیوں نہ ہو؛ یہ مملکت ان سب سے یکساں سلوک کرے گی۔ صرف "یکساں سلوک" ہی نہیں، بلکہ ان سب کی یکساں عزّت کرے گی۔ اس لئے کہ وہ، مستقل اقدار جن کے تحفّظ کے لئے اس مملکت کی تشکیل ہوتی ہے، ان میں بنیادی حیثیّت اس قدر

تکریمِ آدمیّت

کو حاصل ہے کہ۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰) "خدا نے تمام انسانوں کو، محض انسان ہونے کی جہت سے یکساں طور پر واجب التکریم پیدا کیا ہے"۔ ہر انسانی بچّہ پیدائش کے اعتبار سے یکساں عزّت کا مستحق ہے۔ اس عزّت و تکریم کے لئے اس کا آدمی زاد ہونا کافی ہے۔

آدمیّت احترامِ آدمی!

اس مملکت کا منشور ہوگا۔

نیشنلزم

ہمارے زمانے میں، انسانی تباہی کا سب سے بڑا سبب نیشنلزم کا مغربی تصوّر ہے جس نے انسانوں کی برادری کے اس طرح ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہیں کہ ایک انسان، دوسرے انسانوں کے خون کا پیاسا ہو گیا ہے۔ انسان کی، اس سے بڑی حماقت کیا ہوگی کہ وہ نقشے پر ایک لکیر کھینچ لیتا ہے اور پھر اس لکیر کے دوسری طرف بسنے والے، اپنے ہی جیسے انسانوں سے، شدید نفرت اور سخت عداوت دل میں پیدا کر لیتا ہے۔ ہمارے دور کی تاریخ بتاتی ہے کہ[1]

> مختلف اقوام میں باہمی لڑائیوں کا سبب، اس کے سوا شاید ہی کچھ اور ہو کہ انسانوں کی مختلف جماعتوں نے اپنے اپنے نام رکھ لئے تھے۔

(FREDRICK HERTZ: NATIONALITY IN HISTORY AND POLITICS)

---

[1] بعض اقتباسات اس سے پہلے، اس مقالہ میں بھی آچکے ہیں جس کا عنوان ہے "یورپ کا واویلا"۔

یہی وہ نیشنلزم ہے جو برٹرینڈرسل کے الفاظ میں :-

نوعِ انسان کی تباہی کے لئے سب سے بڑی قوت ہے۔ پھر تماشا یہ ہے کہ ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ دوسرے ملکوں کی نیشنلزم بڑی خراب چیز ہے۔ اور اپنے وطن کی نیشنلزم بہت اچھی ہے۔

(THE HOPES FOR A CHANGING WORLD)

اقبالؒ نے آج سے پچاس سال پہلے کہا تھا کہ تہذیب کے آذر نے جس قدر صنم ترشوائے ہیں ؎

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے !
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اقبالؒ نے یہ بات وحی کی عطا کردہ بصیرت کی روشنی میں کہی تھی۔ یورپ کے مفکر، پچاس سال کے تجربے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ

"نیشنلزم ایک بت پرستانہ اور مشرکانہ مذہب کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ ایسا مذہب جو فساد اور تفریقِ انسانیت کے لئے ایسا طاقتور ہے کہ کوئی توحید پرست مذہب، فلاح و وحدتِ انسانیت کے لئے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ نیشنلزم بالکل پاگلوں کا مسلک ہے۔

(A. HUXLEY--THE PRENNIAN PHILOSOPHY)

اسی لئے ؎

اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے ‏ تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے !
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے ‏ کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے !
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

مغرب کے تصورِ قومیت کے مقابلہ میں یہ "قومیتِ اسلام" کیا ہے جس کی طرف اقبالؒ نے اشارہ کیا ہے ؛ اسے

انسانوں کی عالمگیر برادری

سمجھ لینے سے قرآن کی پیش کردہ مثالی مملکت کا واضح تصور سامنے آجاتا ہے۔ قرآن کا اعلان ہے کہ. كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً (۲/۲۱۳) تمام نوعِ انسان ایک عالمگیر برادری ہے۔ اس لئے وہی نظامِ تمدن صحیح اور کامیاب ہو سکتا ہے جو پوری انسانیت کو ایک قوم تصور کر کے قائم کیا جائے۔ جب تک انسان، رنگ، نسل، زبان اور جغرافیائی حدود

کی بنیادوں پر مختلف قوموں میں بٹا رہے گا، دنیا میں امن قائم نہیں ہو سکے گا۔ یورپ نے نیشنلزم کی تباہیوں کا علاج انٹرنیشنلزم میں سوچا لیکن اتنے مختصر سے عرصے میں تجربہ نے ہی یہ حقیقت اس پر واشگاف کر دی کہ اس مصیبت کا یہ حل بھی نہیں۔ اس لئے کہ

> جو مسئلہ دنیا کے سامنے پیش ہے' وہ ایسا مسئلہ نہیں جو قوموں کے حل کرنے کا ہو۔ وہ تو خود قوموں کا پیدا کردہ ہے۔ وہ مسئلہ یہ ہے کہ نیشنلزم کے نظریہ نے انسانی معاشرہ میں ایک فساد برپا کر دیا ہے۔ لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ خود نیشنلزم، خواہ وہ انٹرنیشنلزم ہی کیوں نہ بن جائے، اس کا حل دریافت کر سکے۔ اس مسئلہ کا حل عالمگیر انسانیت ہے۔ یعنی ایک ایسا عقیدہ یا تحریک جس کا مقصد یہ ہو کہ وہ قومیت اور بین الاقوامیت کی سطح سے بلند ہو کر خالص انسانی سطح پر امن قائم کرنا چاہتی ہے۔

(EMREY REVES-THE ANATOMY OF PEACE)

انسان کے تمدّنی مسائل کا یہ وہ حل ہے جسے زبانِ وحی نے آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے پیش کیا تھا۔ انسانی ذہن نے اسے اس وقت نہ اپنایا، لیکن اب، صدیوں تک آگ اور خون کی ہولی کھیلنے کے بعد بالآخر وہ اس حل کی طرف آرہا ہے۔

ظاہر ہے کہ جو مثالی مملکت ان خطوط کے مطابق متشکل کی جائے گی اس کی ابتدا کسی ایک خطۂ زمین سے ہو گی۔ یہ خطۂ زمین اس عظیم، عالمگیر انقلابی نظریہ کی تجربہ گاہ بنے گا۔ اس خطۂ زمین کی حفاظت نہایت ضروری ہو گی۔ اس لئے کہ اگر لیبارٹری ہی محفوظ نہیں رہے گی تو تجربہ کہاں ہو گا؛ اس مثالی مملکت میں وطن کی یہی حیثیت ہوتی ہے اور اس اعتبار سے' اس کا مستحکم اور محفوظ رکھنا افرادِ وطن کا اوّلین فریضہ ہوتا ہے۔ وطن وہ صدف ہے جس میں جوہرِ انسانیت' گہر آبدار بنتا ہے۔ اس لئے گہر کی پرورش اور نشوونما کے لئے صدف کی حفاظت اور استحکام ضروری ہے۔ وطن ہی نہیں بلکہ ساری طبیعی زندگی اور مادی اسباب و وسائل وہ مرکب (VEHICLE) ہیں جن پر سوار ہو کر جوہرِ انسانیت اپنی منزل تک پہنچتا ہے۔ جو مسافر اپنی سواری کی پروا اور حفاظت نہیں کرتا، اس سے زیادہ احمق کون ہے؛ لیکن سواری بہرحال ایک مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتی ہے' مقصود بالذات نہیں ہوتی ــــــ وہ (MEANS) ہوتی ہے' (END) نہیں ہوتی۔

مثالی مملکت کی تجربہ گاہ

اب مجھے اس سوال کی طرف آنا چاہیئے جو اس مقام پر آپ کے دل میں بار بار ابھر رہا ہے۔ یعنی اس سوال کی طرف

کہ "جہاں تک ان اصولوں کا تعلق ہے، وہ توفی الواقعہ مثالی (IDEAL) ہیں، لیکن مملکت کا کاروبار بالآخر انسانوں کے ہاتھوں سے سرانجام پائے گا۔ اس کی کیا گارنٹی ہے کہ وہ انسان ان اصولوں کو اچھی طرح چلائیں گے اور انہیں (ABUSE) نہیں کریں گے۔ جہاں تک محض اصولوں کا تعلق ہے دنیا کی کوئی مملکت بھی ایسی نہیں جس کے آئین وضوابط میں کوئی نہ کوئی اچھا اصول نہ ہو۔ ان سب کے ہاں اچھے اچھے اصول، آئینی ضابطوں میں درج ہیں۔ لیکن انسانی ہاتھوں سے ان اصولوں کی جو درگت بنتی ہے، وہ سب کے سامنے ہے" سوال یہ ہے کہ قرآن اس مشکل کا حل کیا تجویز کرتا ہے؟ سوال بڑا اہم اور بنیادی ہے، اس لئے اس کا جواب بھی، اسی نسبت سے غور طلب اور محتاجِ توجّہ ہے۔

مملکت انسانوں کے ہاتھوں سے عمل میں آئے گی!

سوال یہ ہے کہ دنیا کی مختلف مملکتوں میں، باوجودیکہ ان کے آئین وضوابط میں بلند پایہ اصول مندرج ہیں، اس قدر فساد کیوں برپا ہے؟ مختلف اقوام میں، باوجودیکہ ان میں بین الاقوامی معاہدات اور عالمی اداروں کی بلند آہنگ قرار دادیں موجود ہیں، باہمی بے اعتمادی اور تخریب کوشی کیوں ہے؟ پھر کسی ایک ملک یا قوم میں نہایت عمدہ ضوابطِ قوانین وہدایات کے باوجود، اربابِ اقتدار ان کی پاسداری، اور عام افرادِ مملکت قانون کا احترام کیوں نہیں کرتے؟

(SPALDING) ان تمام سوالات کا ایک ہی جواب دیتا ہے۔ وہ اپنی کتاب (CIVILIZATION IN EAST AND WEST) میں لکھتا ہے:-

مادی تصوّرِ حیات

"موجودہ یورپ، دنیا کو "مادی انجیل" کا سبق دیتا ہے جس سے زندگی کے متعلق وہ تصوّر پیدا ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ انسانی امن کے بجائے درندوں کی جنگ ہے۔ یہ عالمگیر شورش اور عدم اطمینان اسی تصوّر کا نتیجہ ہے۔ تہذیبِ مغرب کے لئے (اور اس کے ساتھ دوسری تمام تہاذیب کے لئے جو اس کی نقل کرتی ہیں) خطرہ کا موجب حکومت کی کوئی خاص شکل نہیں۔ اصل خطرہ کی بات یہ ہے کہ ان کی ہر حکومت خالص مادی بنیادوں پر قائم ہے۔ جبتک یہ بنیاد نہیں بدلتی، شکلوں کے بدل دینے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔"

سوال یہ ہے کہ "مادّی" "تصوّرِ حیات" کیا ہے جو عالمگیر فساد کی جڑ، قومی تباہ کاریوں کا موجب اور انفرادی خرابیوں کا باعث ہے۔ اس تصوّرِ حیات کی تفصیل تو طویل ہے لیکن اس کا ماحصل یہ ہے کہ انسانی زندگی عبارت ہے اس

کے جسم سے جو طبیعی قوانین کے مطابق زندہ رہتا ہے اور انہی کے مطابق ایک دن ختم ہو جاتا ہے اور اسی کے خاتمے سے اس فرد کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ نہ انسان کی زندگی اس کے ماوراء کچھ اور ہے اور نہ ہی اس کے اوپر کوئی اور قوّت ہے۔

اس تصوّرِ حیات کا جو اثر زندگی کے اور شعبوں پر پڑتا ہے، سرِدست اسے چھوڑ یئے۔ اس وقت صرف یہ دیکھئے کہ جہاں تک انسان کی تمدّنی اور سیاسی زندگی کا تعلق ہے، اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ ذیل کی مثالیں اس حقیقت کو واضح کر دیں گی۔

قانون سازی کے اختیارات

(۱) خروشیف جیسا آمرِ مطلق ہو یا امریکی حکومت جیسا جمہوری ادارہ، دونوں میں قانون سازی کے اختیارات لامحدود ہوں گے۔ سیکولر گورنمنٹ کی بنیادی خصوصیّت ہی یہ ہے کہ وہ نہ کسی غیر متبدّل اصول کی پابند ہو نہ کسی ناقابلِ تغیّر اخلاقی شرائط سے مشروط۔ وہ جس قسم کا جی چاہے قانون بنائے اور جب جی چاہے اس میں ترمیم کر دے یا اسے منسوخ ہی کر دے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں ہر مملکت ایسے قوانین مرتّب کرے گی جو اس مملکت کے لئے فائدہ مند ہوں۔ اسے باقی دنیا میں بسنے والے انسانوں کے مفاد سے کوئی تعلّق نہیں ہوگا۔ (ROMELIN) نے ٹھیک کہا تھا کہ

> "مملکت کا بنیادی فریضہ اپنے مفاد کا تحفّظ اور اپنی قوّت کی نشوونما ہے۔ اسے کسی دوسری مملکت کا خیال صرف اس صورت میں رکھنا چاہیئے جب اس سے اس کے اپنے مفاد کے خلاف زد نہ پڑتی ہو۔"

ان حالات میں جو بین الاقوامی فساد برپا ہو سکتا ہے، وہ ظاہر ہے۔

(۲) حکومت میں جو پارٹی برسرِ اقتدار آئے گی، وہ ایسے قوانین بنائے گی جن سے اس جماعت کے مفادات کا تحفّظ ہو سکے جس کی وہ نمائندگی کرتی ہے، خواہ دوسری پارٹیوں کے مفاد پر اس کی زد کیسی ہی کیوں نہ پڑے۔ جب اس کی جگہ دوسری پارٹی برسرِ حکومت آئے گی تو وہ پہلی پارٹی کے وضع کردہ قوانین کو منسوخ قرار دیگی اور ایسے جدید قوانین مرتّب کرے گی جن سے ان کی پارٹی کے مفاد کا تحفّظ ہو۔ اس سے خود ملک کے اندر، مختلف جماعتوں اور طبقات میں جس قدر فساد برپا ہوگا اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

قانون کی پابندی

(۳) اس تصوّرِ حیات کے ماتحت، ملک کے قانون کی پابندی صرف وہ شخص کرے گا جسے اس کا احساس ہو کہ قانون کی خلاف ورزی سے :-

(ا) وہ سوسائٹی میں بدنام ہو جائے گا۔

(ب) پولیس کی گرفت میں آ جائے گا، اور

(ج) عدالت اُسے سزا دے گی۔

اگر کوئی شخص ایسا انتظام کر لے کہ وہ خلاف ورزیٔ قانون سے پولیس کی گرفت میں نہ آ سکے اور اگر وہ پکڑا بھی جائے تو عدالت سے چھوٹ جائے۔ نیز معاشرہ میں وہ ایسا با اثر ہو کہ کوئی شخص اس کے خلاف لب کشائی نہ کر سکے یا معاشرہ میں جرائم اس قدر عام ہو جائیں کہ جرم کا ارتکاب باعثِ ذلّت ہی نہ سمجھا جائے تو اس کے بعد کوئی جذبۂ محرکہ ایسا نہیں رہے گا جس کے ماتحت قانون کی پابندی یا اس کا احترام باقی رہ سکے[۱]۔ چنانچہ آجکل تمام مہذّب ممالک میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔ ہر جگہ جرائم بڑھتے جاتے ہیں اور جرائم کے انسداد کا علاج، اربابِ نظم و نسق کی سمجھ میں اس کے سوا کچھ نہیں آتا کہ پولیس کی تعداد میں اضافہ کر دیا جائے۔ چنانچہ جرائم کی کثرت اور پولیس کے اضافہ کی رفتار میں مسلسل دوڑ (RACE) جاری رہتی ہے۔ یہ تو کسی مملکت میں بھی ممکن نہیں کہ ہر شخص کے سر پر ایک سپاہی مسلّط رہے۔ اس لئے جرائم کی روک تھام ناممکن ہو چکی ہے۔ ان حالات میں آپ سوچئے کہ کیا دنیا میں کوئی مملکت بھی ایسی ہو سکتی ہے جس کا نظم و نسق صحیح خطوط پر قائم رہ سکے۔ اور کوئی پارٹی بھی ایسی ہو سکتی ہے کہ اقتدار اس کے ہاتھ میں آئے اور وہ اپنے فائدے کی نہ سوچے؟

یہ ہیں اس مادی تصوّرِ حیات کے فطری نتائج جس پہ تہذیبِ مغرب کی اساس و بنیاد ہے۔ اس کے برعکس قرآن کی رُو سے تصوّرِ حیات یہ ہے کہ

قرآنی تصوّرِ حیات

(ا) انسان صرف طبیعی جسم سے عبارت نہیں۔ جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جسے انسانی ذات کہتے ہیں۔ انسانی ذات کی نشو و نما، مقصدِ حیات ہے۔

(ب) جس طرح خارجی کائنات کے لئے خدا کے متعیّن کردہ قوانین از خود موجود ہیں۔ وہ انسانوں کے وضع کردہ نہیں۔ نہ ہی انسان ان میں تغیر و تبدل کر سکتا ہے۔ اسی طرح انسان کی تمدّنی زندگی کے لئے بھی ابدی اصول متعیّن ہیں جن میں کوئی انسان یا انسانوں کی جماعت کسی قسم کا تغیّر و تبدّل نہیں کر سکتی۔

(ج) خدا کے مقرر کردہ قوانین کی خلاف ورزی کی سزا کا انحصار اس پر نہیں کہ اگر جرم کرنے والے کو کوئی شخص

---

[۱] مزید تفصیل اس مقالہ میں ملے گی جس کا عنوان ہے۔ "ہم میں کیریکٹر کیوں نہیں"۔

دیکھ لے یا اُسے گرفتار کرلے، تو اسے اس کی سزا ملے اور اگر ایسا نہ ہو، تو وہ سزا سے بچ جائے۔ خدا کا قانون یہ ہے کہ آگ میں انگلی ڈالنے سے انگلی جل جائے گی اور اس میں سخت تکلیف ہوگی۔ اس میں صورت یہ نہیں کہ اگر کوئی شخص

قانونِ مکافات

آپ کو آگ میں انگلی ڈالتے ہوئے دیکھ لے تو آپ کی انگلی جلے اور اس میں تکلیف ہو اور اگر اسے کوئی دیکھنے نہ پائے تو آپ اس "جرم" کی سزا سے بچ جائیں۔ یہ سزا آپ کو بہرحال مل کر رہے گی خواہ آپ اس کا ارتکاب، پہاڑ کی چوٹی پر، یا زمین کے غار کے اندر تنہائی میں بھی کیوں نہ کریں۔ اسے خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔

جس طرح طبیعی قوانین کی خلاف ورزی کا اثر انسان کے جسم پر ہوتا ہے، اسی طرح، اخلاقی قوانین کی خلاف ورزی کا اثر انسان کی ذات پر پڑتا ہے۔ یعنی جس طرح سنکھیا کھانے سے انسان کی جسمانی زندگی ختم ہو جاتی ہے، اسی طرح حرام کا مال کھانے سے اس کی ذات تباہ ہو جاتی ہے۔ جس طرح آگ کے غلط استعمال سے ہاتھ جل جاتا ہے اسی طرح اختیارات کے غلط استعمال سے انسانی ذات کی صلاحیتیں جھلس جاتی ہیں۔ اسے جہنم کا عذاب کہا جاتا ہے۔ جس طرح سنکھیا اپنا ہلاکت آفریں اثر کر کے رہتا ہے خواہ آپ اسے بند کمرے کے اندر ایسے وقت میں کھائیں جب کہ آپ کو دیکھنے والا کوئی نہ ہو، اسی طرح مالِ حرام اپنا تباہ کن اثر کر کے رہتا ہے خواہ اس کا کسی کو علم ہو سکے یا نہ۔

سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۢ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ ۝ لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ؕ

(۱۳ — ۹ — ۱۱)

اس کے لئے برابر ہے خواہ تم میں سے کوئی بات کو چھپائے یا اُسے بلند آواز سے کہے۔ خواہ وہ رات کی تاریکیوں میں کچھ کرے یا دن کی روشنی میں چلے۔ اس کے آگے اور پیچھے ایسے پاسبان لگے ہوئے ہیں جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتے اور اس کی ہر نقل و حرکت اور قول و عمل کو ریکارڈ کرتے رہتے ہیں۔

وہ ریکارڈ کبھی ضائع نہیں ہو سکتا۔ یہ ریکارڈ ہر انسان کی گردن میں لٹکا رہتا ہے۔ وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ (۱۷ — ۱۳)

نگاہ کی خیانت

جہاں تک طبیعی قوانین کا تعلق ہے، ان کا نقصان صرف اس وقت پہنچتا ہے جب ان کی خلاف ورزی عمل میں آجائے۔ آپ ہزار مرتبہ دل میں خیال کریں کہ جب آپ کے سامنے آگ آئے گی تو آپ اس میں کود جائیں گے۔ اس سے آپ کے جسم پر ذرا بھی آنچ نہیں آئے گی۔ آپ

کا جسم اس وقت جلے گا جب آپ عملاً آگ میں کود جائیں گے۔ لیکن جہاں تک اخلاقی اقدار کا تعلق ہے ان کی خلاف ورزی کا نقصان ارادہ کرنے سے بھی پہنچ جاتا ہے۔ آپ کسی کے ہاں بیٹھے ہیں اور سوچ رہے ہیں کہ وہ ذرا اندر جائے اور آپ اس کا قلم اڑا لیں۔ آپ دیر تک اسی خیال میں بیٹھے رہتے ہیں۔ لیکن (آپ کی بدقسمتی کہ) وہ اُٹھ کر اندر نہیں جاتا۔ آپ بالآخر تھک کر ناکام چلے آتے ہیں۔ آپ نے چوری نہیں کی۔ دنیا کا کوئی قانون آپ سے مواخذہ نہیں کر سکتا۔ لیکن اخلاقی اقدار کے قانون کی رُو سے آپ کی ذات کو اس ارادہ سے بھی سزا مل جائے گی۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِى الصُّدُوْرُ (۴۰/۱۹) "وہ نگاہ کی خیانتوں اور دل کے ارادوں تک سے واقف ہوتا ہے۔"

دنیاوی جرائم کی عدالت میں اگر مجرم کے خلاف شہادت یا ثبوت نہ ملے تو وہ چھوٹ جاتا ہے۔ لیکن اخلاقی اقدار

اپنے خلاف آپ شہادت

کی عدالت میں، نہ کسی خارجی ثبوت کی ضرورت ہوتی ہے نہ باہر کے گواہ کی۔ وہاں ہر مجرم اپنے خلاف خود گواہی دیتا اور ثبوت پیش کرتا ہے۔

كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا (۱۷/۱۴) "آج خود تیری اپنی ذات تیرا حساب لینے کے لئے کافی ہے۔"

پھر جس طرح آگ میں ہاتھ ڈالنے کے بعد، گورنر جنرل کی سفارش بھی آپ کو اس کے درد سے محفوظ نہیں رکھ سکتی اور لاکھ روپے کی رشوت بھی آپ کو اس تکلیف سے بچا نہیں سکتی۔ نہ ہی کوئی دوسرا آپ کی جگہ وہ دکھ بھگت سکتا ہے۔ اسی طرح مستقل اقدار کی خلاف ورزی کی سزا سے کسی صورت چھٹکارا نہیں ہو سکتا۔

يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ○ (۲/۴۸)

"اس دور میں نہ کوئی شخص کسی دوسرے کے کسی کام آسکے گا نہ کسی کی سفارش قبول کی جائے گی۔ نہ کچھ معاوضہ لے کر اسے چھوڑ دیا جائے گا۔ نہ ہی اس کا کوئی حامی و ناصر ہوگا۔

ان لوگوں کے ہاتھ میں نظم و نسق

قرآن کی مثالی مملکت کا نظم و نسق ان لوگوں کے ہاتھ میں ہوگا جن کا خدا کے اس قانونِ مکافات پر پورا پورا یقین ہو، اس پر ان کا ایمان ہو۔ جنہیں یقینِ محکم ہو کہ اقدارِ انسانیت کی خلاف ورزی سے ان کی ذات کا نقصان ہوگا اور یہ نقصان دنیاوی فوائد کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ جس طرح عام مملکت کا نظم و نسق ان لوگوں کے ہاتھ میں نہیں دیا جاتا جنہیں اپنے نفع نقصان کا بھی ہوش نہ ہو۔ اسی طرح اس مثالی مملکت کا انتظام بھی ان لوگوں کو نہیں سونپا جاتا

جنہیں اپنی ذات کے نفع و نقصان کا خیال نہ ہو۔ ایسے لوگ اس کے اہل ہی تصوّر نہیں کئے جاتے وہ اس کے لئے (DISQUALIFY) ہو جاتے ہیں۔

ایمان کسے کہتے ہیں

کہہ دیا جائے گا کہ کرنے کو تو اس قسم کا اقرار ہر شخص کر لیتا ہے لیکن ان باتوں کو عمل میں کوئی نہیں لاتا۔ اس لئے بات پھر وہیں آجاتی ہے کہ اس کی کیا گارنٹی ہے کہ یہ لوگ اپنے ایمان کے مطابق عمل بھی کریں گے۔ اس کے لئے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ ایمان کہتے کسے ہیں؟ آپ..... آگ میں ہاتھ کیوں نہیں ڈالتے؟ اس لئے کہ آپ کو یقین ہے کہ آگ میں ہاتھ ڈالنے سے آپ کا ہاتھ جل جائے گا۔ اسی کو ایمان کہتے ہیں۔ یہ ایمان طبیعی قوانین کے متعلق ہے۔ مستقل اقدار کے متعلق بھی جس کا ایمان اس قسم کا ہو، اسے ایمان والا کہا جائے گا۔ اس قسم کے ایمان کے بعد ممکن نہیں کہ انسان زبان سے کچھ کہے اور عمل اس کے خلاف کرے۔ جو شخص جانتا ہے کہ سنکھیا مہلک ہوتا ہے اس کی یہ کیفیت کبھی نہیں ہو سکتی کہ وہ زبان سے تو سنکھیا کو مہلک کہے لیکن جب سنکھیا سامنے آئے تو اُسے جھٹ سے نگل لے۔ وہ کبھی ایسا نہیں کرے گا۔ بڑی سے بڑی رشوت بھی اُسے اس پر آمادہ نہیں کر سکے گی۔ مال و دولت کا عظیم نقصان بھی اسے اس کے لئے تیار نہیں کر سکے گا۔ وہ سب کچھ برداشت کرے گا لیکن سنکھیا نہیں کھائے گا۔ اسے کہتے ہیں سنکھیا کی ہلاکت آفرینی پر ایمان۔ اس سے کم درجے کا اقرار ایمان کہلاتا ہی نہیں۔ لہٰذا کسی مومن کے لئے ممکن ہی نہیں کہ وہ کسی ایسے کام کے لئے آمادہ ہو جائے جس سے اس کی ذات کی ہلاکت ہوتی ہو۔

ایسے لوگ ہوں گے اس مثالی مملکت کے اربابِ حل و عقد۔

دین کی بنیادوں پہ مملکت

یہ بنیادیں جن پر اس مثالی مملکت کی عمارت استوار ہوتی ہے، قرآن کی اصطلاح میں دین کے اجزا کہلاتے ہیں۔ جب مملکت دین کے تابع رہے تو نوعِ انسان کے لئے آیۂ رحمت ہوتی ہے اور جب دین سے الگ ہو جائے تو تباہیوں کا موجب۔ طرزِ حکومت کے بدلنے سے اس میں کچھ فرق نہیں آتا۔

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو!
جُدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

یہ مثالی مملکت قائم ہوتی ہے مستقل اقدار کی بنیادوں پر، اور اس کی بقا کا راز، اس غیر متبدّل ابدی اصول میں ہوتا ہے کہ

مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ ۔ (۱۳/۱۷)

بقا اسی کے لئے ہے جو تمام نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہو۔

انسانیّت کے لئے نفع بخش کسی خاص جماعت، خاص پارٹی، خاص گروہ، خاص ملک، خاص قوم کے لئے نفع بخش نہیں بلکہ پوری کی پوری انسانیّت کے لئے نفع بخش حتّیٰ کہ اس میں مسلم اور غیر مسلم کی بھی کوئی تمیز نہیں۔ ہر شخص اپنے اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے اس مملکت کی نفع رسانیوں سے فیضیاب ہو سکتا ہے۔ اس میں غیر مسلموں کی جان، مال، عزّت، آبرو ہی کی حفاظت نہیں بلکہ ان کی پرستش گاہوں تک کی حفاظت بھی مملکت کا فریضہ ہوتی ہے۔ اور ہر ایک کے معاملات عدل و انصاف کی رُو سے طے پاتے ہیں۔ حتیٰ کہ دشمن کے ساتھ بھی عدل کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس حکم کی تعمیل اس کا فریضہ ہوتا ہے کہ

لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۚ اِعْدِلُوْا ۚ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (۵/۸)

کسی قوم کی دشمنی بھی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کر دے کہ تم ان سے عدل نہ کرو۔ ہمیشہ عدل کرو کہ یہی روش تقویٰ سے قریب تر ہے۔

پروفیسر (J.D. MABBOTT) نے کہا تھا کہ

"اچھی حکومت اسے کہنا چاہیئے جس میں تمام افراد کی حفاظت ہو۔ کسی کو کسی سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہ ہو۔ باہمی معاملات میں خوشگواری ہو۔ افراد کے تنازعات کے فیصلے عدل کی رُو سے کئے جا سکیں۔"

(THE STATE AND THE CITIZENS)

قرآنی تصوّر کے مطابق قائم شدہ مملکت، ان تمام شرائط پر پوری اترتی ہے۔ یہی وہ مملکت ہوتی ہے جس کے انسانیّت ساز اور زندگی بخش نتائج سے دنیا دیکھ لیتی ہے کہ ذہنِ انسانی کے تجویز کردہ نظامِ حکومت اور وحی کے خطوط پر متشکل مملکت میں کیا فرق ہوتا ہے ——— وہی فرق جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا تھا کہ مملکت

لادیں ہو تو ہے زہرِ ہلاہل سے بھی بدتر!

ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاق

۱۹۶۲ء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قائدِ اعظمؒ اور اسلامک آئیڈیالوجی

قائدِ اعظمؒ کے یومِ پیدائش پر ۲۵ ر دسمبر ۱۹۵۹ء کو سینٹ ہال لاہور میں تقریر

برادرانِ عزیز! آج کی تقریب میں شرکت میرے لئے دو وجوہات سے باعثِ فخر و مسرّت ہے۔ ایک وجہ تو بالکل ظاہر اور بیّن ہے اور وہ یہ کہ یہ تقریب ملّتِ اسلامیہ کے اس محسنِ عظیم کی یاد میں منائی جا رہی ہے جس کے یقینِ محکم اور عملِ پیہم کے صدقہ میں آج ہمارا شمار دنیا کی آزاد قوموں میں ہو رہا ہے۔ تاریخ کے جس نازک دور سے ہم گذر رہے تھے، اگر اس وقت حکیمُ الامّت علامہ اقبالؔ (علیہ الرحمۃ) پاکستان کا تصوّر نہ دیتے اور اس کے بعد قائدِ اعظم (علیہ الرحمۃ) بساطِ سیاست پر نمودار نہ ہوتے تو خود قائدِ اعظمؒ کے الفاظ میں ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کا نام و نشان تک باقی نہ رہتا۔ اس اعتبار سے ملّتِ پاکستانیہ، روحِ قائدِ اعظمؒ کو مخاطب کر کے بجا طور پر کہہ سکتی ہے کہ

حیرت کے غم کدہ میں خوشی کا گذر کہاں
تم آگئے تو رونقِ کاشانہ ہوگئی

لہٰذا قوم کے اتنے بڑے محسن کا حق ہے کہ اس کی یاد اس شان سے منائی جائے جس کی مستحق اس کی عزت اور عظمت ہے۔
میری مسرّت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ تقریب قوم کے نوجوان طالب علموں کے زیرِ اہتمام منائی جا رہی ہے، وہ نوجوان

جن کے متعلق قائدِ اعظمؒ نے (نومبر ۱۹۳۹ء میں اپنے پیغامِ عید میں) فرمایا تھا کہ

"ہم بڑے بوڑھوں کی کافی آزمائشیں ہوچکی ہیں۔ لیکن میں آج اپنے نوجوان دوستوں کے حلقہ میں بیٹھ کر انہیں بھلا دینا چاہتا ہوں۔ میں ان کے دلوں کے ان تاروں کو چھیڑنا چاہتا ہوں جن میں تازہ ولولوں کے نغمے خوابیدہ ہیں۔ اس لئے کہ یہی نوجوان ہیں جن کے کندھوں پہ ہماری آرزوؤں کے بروئے کار لانے کا بار پڑنے والا ہے۔"

آج سے بیس اکیس سال پہلے کا ذکر ہے کہ انٹر کالجیئیٹ مسلم برادرہڈ نے (جنوری ۱۹۳۸ء میں) پہلا یومِ اقبالؒ منایا جس میں شرکت کے لئے ہمارا قافلہ علامہ اسلم جیراجپوری (علیہ الرحمتہ) کے زیرِ قیادت دہلی سے یہاں آیا۔ سامنے لاء کالج کے ہال میں جلسہ منعقد ہوا تھا۔ اس وقت لاہور کے کالجوں کے درو دیوار، اقبالؒ کے پیغام اور جناحؒ کے نام سے گونج رہے تھے۔ اور ایسا نظر آتا تھا کہ یہ نوجوان طالب العلم نہیں، عمل و عقیدت اور ذوق و شوق کا ایک کارواں ہے جو رقصاں و جنباں اور شاداں و فرحاں، جانبِ منزل کشاں کشاں جا رہا ہے۔ لیکن تشکیلِ پاکستان کے بعد رفتہ رفتہ ہوا یہ کہ اقبالؒ کا پیغام اور قائدِ اعظمؒ کا نام دونوں نظر انداز ہوتے چلے گئے اور اب ایسے طالب علم خال خال دکھائی دیں گے جنہیں ان سے کوئی دل بستگی اور پیوستگی باقی رہی ہو۔ ان حالات میں، انہی نوجوان طالب علموں کے ایک گروہ کا آگے بڑھ کر، ایسی تقاریب منانا، میرے نزدیک قوم کی نشاۃ ثانیہ کی علامت اور اس کے مستقبل کی درخشندگی کی دلیل ہے۔ میں ان نوجوانوں کو ان کے اس جذبہ اور عمل پر مستحقِ مبارک باد سمجھتا ہوں۔

بہت بڑی کمی

برادرانِ عزیز! یہ سمجھنے کے لئے کہ قائدِ اعظمؒ کے سامنے معاملہ کیا تھا، ان کی دشواریاں کیا تھیں، انہوں نے ان تمام دشواریوں پر کس طرح قابو پالیا۔ اور پاکستان کا کونسا تخیل اپنوں اور بیگانوں کے سامنے پیش کیا، ضروری ہے کہ ہمیں اس دور کا پس منظر معلوم ہو۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ آج ہمارے پاس نہ تو قائدِ اعظمؒ کے کوئی قابلِ اطمینان سوانح حیات ہیں اور نہ ہی ہماری جنگِ آزادی کی کوئی مفصل اور مستند تاریخ۔ آج تو پھر بھی ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جنہوں نے اس جنگ میں خود حصہ لیا اور اس کے مناظر دیکھے تھے۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد جب یہ لوگ اٹھ جائیں گے تو آنے والی نسلوں کے لئے یہ داستان ایک فسانۂ کہن بن کر رہ جائے گی۔ قوم کے مستقبل کے لئے اس کے ماضی کی سچی اور صحیح تاریخ کا ہونا نہایت ضروری ہے۔

آج عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے، بلکہ بالفاظِ صحیح یوں کہئے کہ ایک منظّم کوشش کے تحت یہ اثر پیدا کیا گیا ہے (اور یہ کوشش ان لوگوں کی طرف سے ہوئی ہے جو اس زمانے میں نظریۂ پاکستان کے خلاف تھے اور ابھی تک پاکستان میں رہنے کے باوجود، وہ دل سے پاکستانی نہیں ہو سکے) کہ اس کشمکش میں مسئلہ زیرِ نزاع فقط اتنا تھا کہ کانگریس (یعنی ہندو اور قومیت پرست مسلمان) یہ چاہتے تھے کہ سارے ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں (سب کی) مخلوط حکومت قائم ہو۔ اور تفرقہ پسند (SEPARATIONISTS) یعنی مسلم لیگ کے حامی۔ یہ چاہتے تھے کہ ہندوؤں کی الگ حکومت ہو اور مسلمانوں کی الگ اور ان کا یہ مطالبہ انگریزوں کے اشارے پر تھا جو ہندوستان کو آزادی دینا نہیں چاہتے تھے۔

کانگریس کے عزائم

لیکن برادرانِ من! بات اس سے کہیں گہری اور مختلف تھی۔ کانگریس کے عزائم کیا تھے، اس کا نصب العین کیا تھا؟ وہ ہندوستان میں کیا چاہتی تھی؟ اس کے متعلق مجھ سے نہیں بلکہ خود کانگریس کے ذمہ دار حضرات کی زبان سے سنئے۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جنرل سیکرٹری آچاریہ کرپلانی نے اگست ۱۹۳۹ء میں ایک طویل بیان شائع کیا جس میں بتایا گیا تھا کہ کانگریس کے سامنے مقصد کیا ہے۔ میں ان کے اس بیان کا اقتباس آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ اسے غور سے سنئے انہوں نے کہا تھا:-

"وہ لوگ جو کانگریس کے پروگرام کو تو مانتے ہیں لیکن اس سیاسی عقیدہ کو ماننے سے انکار کرتے ہیں جس پر گاندھی جی نے کانگریس کے ... پروگرام کی بنیاد رکھی ہے۔ وہ درحقیقت نہ تو کانگریس کی حالیہ ترقی سے واقف ہیں اور نہ یہ جانتے ہیں کہ گاندھی جی کے فلسفۂ حیات (آئیڈیالوجی) نے کانگریس میں کیا مرتبہ حاصل کر لیا ہے؛ ایسے لوگوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اب کانگریس صرف ایک ایسی سیاسی جماعت نہیں جو ملک کو پردیسی اقتدار سے آزاد کرانا چاہتی ہے بلکہ یہ ہماری معاشرت کی موجودہ حیثیت کو بالکل بدل دینا چاہتی ہے اور اس کی بنیاد ایک بالکل نئے فلسفہ پر رکھنا چاہتی ہے۔ جب تک کانگریس پر گاندھی جی کا اثر غالب نہیں ہوا تھا، اس وقت تک کانگریس کے لیڈروں کا خیال تھا کہ ہماری سیاسی غلامی کو ...... ہماری معاشرتی حالت سے براہِ راست کوئی بنیادی تعلق نہیں۔ اس لئے ان لیڈروں نے یہ طے کیا تھا کہ کانگریس کا یہ کام نہیں کہ وہ معاشرتی اصلاح کے کاموں میں دخل دے۔ وہ اسے بالکل سیاسی جماعت رکھنا چاہتے تھے۔ اس زمانے میں یہ ممکن تھا کہ مختلف معاشرتی نظریئے رکھنے والے لوگ سیاسی حیثیت سے ایک محاذ پر جمع ہو جائیں۔ گویا ان لوگوں نے زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا

تھا: ایک سیاسی زندگی، دوسری معاشرتی زندگی۔ لیکن گاندھی جی نے آکر اس اصول کو توڑ دیا۔ انہوں نے پرانے ڈاکٹروں کی تشخیص کو غلط قرار دے کر بتایا کہ ہماری سیاسی غلامی کوئی ایسی چیز نہیں جسے ہم اخلاقی، روحانی اور معاشرتی زندگی سے جدا کر سکیں۔ اس لئے ہماری سیاسی جدوجہد کو معاشرتی، اخلاقی اور روحانی جدّوجہد کے ساتھ وابستہ ہونے کی سخت ضرورت ہے۔ گاندھی جی نے کانگرس کو بتایا کہ ہمارا کام صرف یہی نہیں کہ ملک کی سیاسی باگ ڈور انگریزوں کے ہاتھ سے چھین کر اہلِ ملک کے ہاتھ میں دے دیں، بلکہ سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ ہم اپنی تمام جدّوجہد کی بنیاد کسی ایسے فلسفۂ حیات پر رکھیں جس کے دائرے میں ہماری معاشرت، اخلاق اور روحانیت سب کچھ داخل ہو۔ بالفاظِ دیگر، ہماری تحریک کو صرف سیاسی نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اسے روحانی اور اعلیٰ فلسفۂ زندگی کے ماتحت ہونا چاہیئے تاکہ اس جدّوجہد سے نہ صرف ہماری سیاسی زندگی متاثر ہو بلکہ ہماری زندگی کا ہر شعبہ اس سے متاثر ہو اور ہماری زندگی کا ایک بالکل نیا باب شروع ہو، جسے ہم تاریخ کا نیا دور کہہ سکیں۔ زندگی کا یہی وہ نیا باب اور نیا دور ہے جسے گاندھی جی کانگریس کے ذریعے ہندوستان میں لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

مہاتما گاندھی کیا تھے

اس اقتباس سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ کانگریس کا نصب العین ہندوستان میں ایسے معاشرہ کا قیام تھا جو مہاتما گاندھی کے پیش کردہ فلسفۂ حیات پر مبنی ہو۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مہاتما گاندھی کس فلسفۂ حیات کے معتقد تھے۔ سوال کا جواب خود ان کی اپنی زبان سے سنیئے۔ انہوں نے اپنے متعلق لکھا تھا:۔

"میں اپنے آپ کو سناتنی ہندو کہتا ہوں۔ کیونکہ میں ویدوں، اپنشدوں، پرانوں اور ہندوؤں کی تمام مذہبی کتابوں کو مانتا ہوں۔ اوتاروں کا قائل ہوں اور تناسخ پر عقیدہ رکھتا ہوں۔ میں گئو رکھشا کو اپنے دھرم کا جزو سمجھتا ہوں اور بت پرستی سے انکار نہیں کرتا۔ ... میرے جسم کا رُواں رُواں ہندو ہے۔"

(بحوالہ خطبۂ صدارت، قائدِ اعظمؒ آل انڈیا مسلم لیگ سیشن دہلی ۴۳ء ص ۲۴)

یہ تھا برادرانِ عزیز! وہ مہیب خطرہ جس سے مسلمانوں کو بچانے کے لئے قائدِ اعظمؒ انگلستان میں بودوباش اختیار کر لینے کے بعد، پھر ہندوستان آئے اور میدانِ سیاست میں اُترے تھے۔

قائدِ اعظمؒ کا اعلان

انہوں نے آکر اعلان کیا کہ مسلمان اپنا جداگانہ تصوّرِ زندگی و جداگانہ فلسفۂ حیات و جداگانہ

کلچر رکھتے ہیں۔ اس لئے وہ اپنے آپ کو کسی اور فلسفۂ حیات میں جذب نہیں ہونے دیں گے۔ انہوں نے مسلم لیگ کے مدراس سیشن (۱۹۴۱ء) کے خطبۂ صدارت میں فرمایا۔

"مسلم لیگ کا نصب العین یہ بنیادی اصول ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ایک جداگانہ قومیت رکھتے ہیں اس لئے انہیں کسی دوسری قومیت میں جذب کرنے یا ان کے نظریات اور ملّی تشخص کو مٹانے کے لئے جو کوشش کی جائے گی اس کی سخت مخالفت کی جائے گی۔ ہم نے تہیّہ کر لیا ہے کہ ہم اپنے جداگانہ قومی تشخص اور جداگانہ حکومت کو قائم کر کے رہیں گے۔"

انہوں نے (۸ مارچ ۱۹۴۴ء کو) مسلم یونیورسٹی (علی گڑھ) میں اپنی تقریر کے دوران میں کہا۔

"ہندو اور مسلمان خواہ ایک گاؤں یا ایک شہر ہی میں کیوں نہ رہتے ہوں وہ کبھی ایک قوم نہیں بن سکتے۔ وہ ہمیشہ الگ الگ عناصر کی حیثیت سے رہے ہیں۔"

انہوں نے لیگ کے کراچی سیشن میں ان نکات کو زیادہ وضاحت سے بیان فرمایا اور صراحت سے بتایا کہ جب ہم کہتے ہیں کہ مسلمان اپنا مخصوص فلسفۂ حیات رکھتے ہیں اور ایک جداگانہ قوم ہیں تو اس کا مطلب کیا ہے۔ انہوں نے پہلے یہ سوال کیا کہ

وہ کیا چیز ہے جس نے مسلمانوں کو ایک رشتہ میں پرو رکھا ہے۔ وہ کونسی چٹان ہے جس پر اُن کی ملّی عمارت کی بنیاد ہے۔ وہ کونسا لنگر ہے جس سے ان کی کشتی بندھ رہی ہے۔

اور اس کے بعد خود ہی اس کا جواب ان الفاظ میں دیا:۔

ان سوالوں کا جواب ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ یہ محکم رشتہ، یہ سنگین چٹان، یہ آہنی لنگر خدا کی وہ کتابِ عظیم (قرآن) ہے جس نے تمام مسلمانوں کو جسدِ واحد بنا رکھا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے ہم میں وحدت زیادہ ہوتی جائے گی۔ اس لئے کہ ہمارا خدا ایک، خدا کی کتاب ایک، اس کا رسولؐ ایک، اس لئے ہماری ملّت بھی ایک ہے۔

یہ کہہ کر قائدِ اعظمؒ نے گویا بھڑوں کے چھتے پر پتھر مار دیا۔ مہاتما گاندھی پھنکارتے ہوئے اٹھے اور انتہائی غیظ و غضب کے عالم میں فرمایا:۔

"میری روح اس بات کے تصوّر سے بغاوت کرتی ہے کہ اسلام اور ہندو مت مختلف اور متضاد کلچر اور نظریۂ حیات کے حامل ہیں۔ کسی ایسے نظریہ کا تسلیم کر لینا میرے نزدیک خدا کے انکار کے مترادف ہے کیونکہ میرا

قلبی عقیدہ یہ ہے کہ قرآن کا خدا بھی وہی ہے جو گیتا کا ہے۔

(ہندوستان ٹائمز۔ ۱۴ ۴/۴۴)

اس پر بھی اس کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا تو لکھا کہ

"میں ایک تنگ نظر ہندو مت یا تنگ نظر اسلام کا تصور نہیں کر سکتا۔ ہندوستان ایک بہت بڑا ملک ہے اور ایک بہت بڑی قوم ہے، جو مختلف تہذیبوں پر مشتمل ہے اور یہ تہذیبیں ایک دوسری میں جذب ہونی شروع ہو گئی ہیں لیکن مسلم لیگ نے مسلمانوں کو یہ سبق پڑھانا شروع کر دیا ہے کہ یہ تہذیبیں ایک دوسرے میں جذب نہیں ہو سکتیں۔"

(ہندوستان ٹائمز ۱۵ ۵/۴۴)

لیکن قائدِ اعظمؒ پر ان باتوں کا کیا اثر ہو سکتا تھا۔

وہ چنگاری خس و خاشاک سے کس طرح دب جائے
جسے حق نے کیا ہو نیستاں کے واسطے پیدا

مسٹر گاندھی کے نام

انہوں نے یکم جنوری ۱۹۴۱ء کو مسٹر گاندھی کے نام وہ معرکہ آرا خط لکھا جو تاریخ میں ایک خاص حیثیت رکھتا ہے۔ یہ خط کافی مفصّل ہے اور اس قابل ہے کہ اس کا بار بار مطالعہ کیا جائے۔ میں اس کا مختصر سا اقتباس پیش کرتا ہوں۔ انہوں نے اس میں (مسٹر گاندھی کو) لکھا کہ

"آپ آج اس سے انکار کرتے ہیں کہ قومیت کی بنیاد مذہب پر ہے لیکن کل تک جب آپ سے پوچھا جاتا تھا کہ زندگی میں آپ کا نصب العین کیا ہے؟ وہ کونسا جذبۂ محرکہ ہے جو انسان کو کسی مقصد کے حصول کے لئے آمادہ کرتا ہے؟ کیا وہ سیاست ہے، معاشرت ہے یا مذہب ہے؟ تو آپ کا جواب یہ ہوتا تھا کہ وہ مذہب اور خالص مذہب ہے۔ کل تک تو آپ یہ کہتے تھے اور آج آپ مجھ سے یہ فرماتے ہیں کہ تم مذہب کو سیاست میں کیوں گھسیٹ لائے ہو۔ سُن لیجئے میرے نزدیک زندگی کا کوئی شعبہ ہو، مذہب انسان کے ہر عمل کو اخلاقی بنیاد عطا کرتا ہے۔ اگر مذہب کو بیچ میں نہ لایا جائے تو انسان کی زندگی میں شور و شغب کے سوا اور کیا رہ جاتا ہے۔"

اس پر چاروں طرف سے مخالفت کا سیلاب اُمنڈ آیا۔ اسمبلی میں کانگریس پارٹی کے لیڈر مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی نے کہا کہ

"نہیں۔ اب یہ ناممکن ہے کہ کوئی ایسا نظامِ حکومت قائم کیا جا سکے جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔ اب وقت آ چکا ہے کہ ہم اس امر کا اعتراف کر لیں اور اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ ضمیر و مذہب؛ خدا کو ان کے مناسب مقام یعنی آسمان کی بلندیوں پر رکھ دیا جائے اور انہیں خواہ مخواہ زمین کے معاملات میں گھسیٹ کر نہ لایا جائے۔ اس بات کا تو تصوّر بھی ناممکن ہے کہ اگر مذہب کو سیاست سے الگ نہ کیا جائے تو کوئی بھی نظامِ حکومت قائم رہ سکتا ہے۔ عہدِ حاضر میں بہترین نظامِ حکومت کی بنا اس نظریہ پر قائم ہو سکتی ہے کہ جغرافیائی حدود کے اندر گھرا ہوا ایک ملک ہو اور اس ملک کے اندر رہنے والے تمام افراد معاشی اور سیاسی مفاد کے رشتہ میں منسلک ہو کر ایک متحدہ قومیت بن جائیں۔"

(ہندوستان ٹائمز ۵/۹/۴۸) ص۱

اور تمام ہندو پریس میں چیخ و پکار شروع ہو گئی کہ مسٹر جناح پاکستان کا نیا (STUNT) لے کر آ گئے ہیں۔ اس پر قائدِ اعظمؒ نے اپنی مخصوص مسکراہٹ سے فرمایا کہ

"پاکستان کوئی نئی چیز نہیں۔ یہ تو صدیوں سے موجود ہے۔ شمال مغربی اور شمال مشرقی ہند مسلمانوں کا حقیقی ملک ہے جہاں آج بھی (۷۰) فیصدی سے زیادہ ان کی آبادی ہے۔ ان علاقوں میں ایسی آزاد اسلامی حکومت ہونی چاہیئے جس میں مسلمان اپنے مذہب، اپنے کلچر اور اپنے قوانین کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔"

آزاد اسلامی حکومت

یہ تقریر انہوں نے دسمبر ۱۹۴۰ء میں احمد آباد کے ایک جلسۂ عام میں کی تھی۔ جلسہ میں اقلیّت کے صوبوں کے بہت سے مسلمان بھی موجود تھے۔ (خود قائدِ اعظمؒ بھی اقلیّت کے صوبہ سے متعلّق تھے) آپ نے ان مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہا:۔

"ہم اقلیت کے صوبوں والوں پر جو گزرتی ہے گزر جانے دو۔ لیکن آؤ ہم اپنے ان بھائیوں کو تو آزاد کرا دیں جو اکثریّت میں ہیں تاکہ وہ اسلامی قوانین کے مطابق وہاں آزاد حکومت قائم کر سکیں۔

ص۱ واضح رہے کہ تقریر میں ان اقتباسات کو ربطِ مضمون کے لئے اسی تسلسل سے پیش کیا گیا تھا نہ کہ ان بیانات کی تاریخی ترتیب کی رُو سے۔ مقصد یہ بتانا تھا کہ اس زمانے میں کانگریسیوں کے خیالات کیا تھے اور قائدِ اعظمؒ ان کو کیا جواب دیتے تھے۔

قائدِ اعظمؒ نے مسلم لیگ کے نصب العین اور پاکستان کے مفہوم کو اس شدّ و مد سے پیش کیا اور اس اصرار و تکرار سے دہرایا تھا کہ کسی کو اس کے متعلق کوئی مغالطہ نہیں رہا تھا۔ مثلاً سنہ ۱۹۴۰ء کا ذکر ہے کہ یہ تجویز زیرِ غور تھی کہ کانگریس مسلم لیگ کے ساتھ مل کر مخلوط حکومتیں قائم کرے۔ اس پر مسٹر سنتیہ مورتی نے کہا تھا کہ

"کانگریس اس مسلم لیگ کے ساتھ مل کر مخلوط حکومت کس طرح بنا سکتی ہے جس کا نصب العین اسلامی حکومت کا احیاء ہو" (ہندوستان ٹائمز۔ ۱۱/۶/۴۰)

قرآنی حکومت

سنہ ۱۹۴۱ء میں لدھیانہ میں اکھنڈ ہندوستان کانفرنس منعقد ہوئی جس کے صدر مسٹر منشی تھے۔ انہوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا:-

"تمہیں کچھ معلوم ہے کہ پاکستان کیا ہے؟ تمہیں معلوم تو سُن لیجئے۔ نظریّۂ پاکستان سے مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ ملک کے ایک یا ایک سے زیادہ گوشوں میں اپنے لئے ایسے مساکن بنا لیں جہاں زندگی اور طرزِ حکومت قرآنی اصولوں کے سانچے میں ڈھل سکے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھو کہ پاکستان مسلمانوں کا ایسا خطّہ ہوگا جس میں اسلامی حکومت قائم ہو۔ اس کے برعکس تم جانتے ہو کہ اکھنڈ ہندوستان کے سامنے کیا مقصد ہے۔ اس کا مقصد وہ عظیم الشّان کلچر ہے جسے ہندی کلچر کہا جاتا ہے۔ وہ کلچر جو زمانۂ قبل التاریخ میں پیدا ہوا اور چھ ہزار سال کی مدتِ مدید میں بڑھتا، پھولتا، پھلتا، زمانہ کی سطح کو یوں روندتا ہوا آگے بڑھتا گیا جس طرح مادرِ گنگا طوفان کے وقت اُمڈتی چلی جا رہی ہو۔" (ٹریبیون ۲/۱۱/۴۱)

خطبہ کے آخر میں مسٹر منشی نے مسلمان قومیّت پرستوں کو مخاطب کر کے کہا کہ میں ان سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ انہوں نے مسلم عوام تک پہنچ کر انہیں اس نظریّۂ افتراق (پاکستان) کے خطرات سے آگاہ کیوں نہیں کیا؟ جلسہ میں جمعیت العلماء کے ایک رکن تشریف فرما تھے۔ انہوں نے اُٹھ کر کہا کہ ہم نظریّۂ پاکستان کی مخالفت کریں گے کیونکہ یہ نظریّہ اسلام کے خلاف ہے۔ (بحوالہ ہندوستان ٹائمز)

پاکستان کے مخالف

آپ کو آج اس پر یقیناً حیرت ہوتی ہوگی کہ وہ کونسا مسلمان ہو سکتا تھا جو اس نظریّہ کو خلافِ اسلام قرار دے کہ مسلمان ایک آزاد خطّہ میں اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں جہاں زندگی قرآنِ کریم کے اصولوں کے سانچے میں ڈھل سکے۔ لیکن اس نظریّہ کی مخالفت ہوتی تھی اور سخت مخالفت ہوتی تھی۔ یہ مخالفت کرنے والے کون تھے؟ جمعیت العلماء ہند، جس کے سرغنہ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی، مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید وغیرہم "علمائے کرام" تھے۔ بہار میں اس

کے مخالف انصار، پنجاب میں مجلسِ احرار اور جماعتِ اسلامی، سرحد میں سرخپوش، یہ سب اس مطالبہ کے خلاف تھے کہ مسلمان اپنی آزاد حکومت قائم کریں جس میں طرزِ زندگی اسلامی قالب میں ڈھل جائے۔ یا للعجب!

میں نے پہلے کہا ہے کہ ہندو اچھی طرح سے جانتا تھا کہ نظریۂ پاکستان سے مفہوم کیا ہے اور جداگانہ قومیت کی بنیاد کس اُصول پر ہے۔ جب قائدِاعظمؒ نے (۱۹۳۹ء میں) اپنا پیغام عید نشر کیا جس میں مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کے تصوّر کی وضاحت کی تو مہاتما گاندھی کے پرائیویٹ سیکرٹری مسٹر مہادیو ڈیسائی نے اخبار ہری جن میں ایک مقالہ لکھا جس میں اس نے کہا کہ

"ایک جداگانہ قومیّت کا تخیّل ہی اس خیال سے پیدا ہوتا ہے کہ ہمارا مذہب دوسرے مذاہب پر فوقیّت رکھتا ہے"

(ہری جن - ۲۵/۱۱/۳۹ء)

قائدِاعظمؒ نے مسلمانوں کی جداگانہ قومیّت کا تصور دے کر اس حقیقت کا اعلان کیا کہ اس میں شک کیا ہے کہ اسلام کا مقابلہ کوئی دوسرا مذہب نہیں کر سکتا۔ لیکن اُدھر سے مولانا ابوالکلام آزاد نے فرمایا کہ یہ غلط ہے۔

مولانا آزاد کی تفسیر

عالمگیر سچّائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ قرآن نے نوعِ انسان کے سامنے مذہب کی عالمگیر سچائی کا یہ اصول پیش کیا ہے کہ

تمام مذاہب سچّے ہیں، لیکن پیروانِ مذاہب سچّائی سے منحرف ہو گئے ہیں۔ اگر وہ اپنی فراموش کردہ سچّائیوں کو از سرِ نو اختیار کر لیں تو میرا مقصد پورا ہو گیا۔

(ترجمان القرآن، جلد اوّل - تفسیر سورۂ فاتحہ)

اس طرح انہوں نے "مہاتما گاندھی" کے اس فلسفہ کی "قرآنی" سند بہم پہنچا دی کہ قرآن اور گیتا کا خدا ایک ہے۔ اس لئے اسلام کو ہندو مت پر کوئی فوقیّت حاصل نہیں۔ یہ انہی مہاتما جی کا فلسفہ تھا جن کے جسم کا رُوواں رُواں "ہندو" تھا۔ لیکن جنابِ آزاد نے جن کے متعلق اپنے رام گڑھ کے کانگریس کے خطبۂ صدارت میں فرمایا تھا کہ

"وقت کی ساری بھیلی ہوئی اندھیاریوں میں انسانی فطرت کا ایک روشن پہلو ہے جو مہاتما گاندھی کی روحِ عظیم کو کبھی جھکنے نہیں دیتا۔"

المذکورہ شخص جو اپنے آپ کو فخر سے بت پرست کہتا ہے اسے روحِ عظیم کا حامل بتایا جاتا ہے! بہرحال یہ تھا ہندو کے پاس جناحؒ کے مطالبۂ اسلامی حکومت کا توڑ۔ انہوں نے مولانا آزاد کی اس تفسیر کا ہندی زبان میں ترجمہ کرا کر اس کی عام اشاعت کی۔ دوسری طرف "واردھا کی تعلیمی اسکیم" کے ذریعے (جسے پھر بدقسمتی سے

ایک مسلمان ـــــــ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کی طرف منسوب کر کے شائع کیا گیا تھا) اس نظریہ کو بچوں کے نصاب میں داخل کرانے کی کوشش کی گئی۔

یہ کچھ برادرانِ عزیز! مذہب کے علمبرداروں کی طرف سے جبّوں اور قبوں، عماموں اور دستاروں سے مرصّع ہو کر کیا جا رہا تھا اور دوسری طرف ایک ہیٹ اور سوٹ پوش "مسٹر" تھا ـــــــ جس کے متعلق جماعتِ اسلامی کے امیر سیّد ابوالاعلیٰ مودودی صاحب بڑے طنز اور تحقیر سے کہتے رہتے تھے کہ ان کی ذہنیت مغربی تعلیم و تربیت کی تخلیق ہے اور

"ان کے خیالات، نظریات اور طرزِ سیاست اور رنگِ قیادت میں خوردبین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی چھینٹ نہیں دیکھی جا سکتی۔"

(سیاسی کشمکش، مطبوعہ ترجمان القرآن، جلد ۱۷، صفحہ ۶۶، عدد ۲)

دعوت الی القرآن

وہ میرِ قافلہ، کاروانِ ملّت کو برابر قرآن کی طرف دعوت دیئے چلا جاتا تھا۔ اس نے ۱۹۴۵ء میں اپنے عید کے پیغام میں قوم سے کہا کہ

"اس حقیقت سے ہر مسلمان باخبر ہے کہ قرآن کے احکام صرف مذہبی اور اخلاقی حدود تک محدود نہیں۔ گبن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ بحرِ اطلانٹک سے لے کر گنگا تک، ہر جگہ قرآن کو ضابطۂ حیات کے طور پہ مانا جاتا ہے، جس کا تعلّق صرف الٰہیات سے نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کے لئے سول اور فوجداری قوانین کا ضابطہ ہے جس کے قوانین نوعِ انسانی کے تمام اعمال و احوال کو محیط ہیں اور وہ قوانین منشائے خداوندی کے مظہر ہیں۔

اس حقیقت سے سوائے جہلا کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن مسلمانوں کا ضابطۂ حیات ہے۔ یہ ضابطۂ حیات، مذہب، معاشرت، تجارت، عدالت، فوج، سول، فوجداری کے تمام قوانین کو اپنے اندر لئے ہے۔ مذہبی رسوم ہوں یا روزمرّہ کی زندگی کے عام معاملات، روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی کا، اجتماعی واجبات کا سوال ہو یا انفرادی حقوق کا، اخلاقیات کا معاملہ ہو یا جرائم کا، اس دنیا میں مجرموں کی سزا کا سوال ہو یا آخرت کی عقوبت کا، ان تمام معاملات کے لئے اس ضابطہ میں قوانین موجود ہیں۔ اسی لئے نبیؐ اکرم نے فرمایا تھا کہ ہر مسلمان کو قرآن کا نسخہ اپنے پاس رکھنا چاہیئے اور اس طرح اپنا مذہبی پیشوا آپ بن جانا چاہیئے۔

اس پر یقیناً ہر شخص کو تعجب ہو گا کہ جس شخص کے خیالات ہیں "خوردبین" لگا کر بھی اسلامیّت کی کوئی چھینٹ نہ دیکھی جا سکتی تھی" اس نے دین کے ان غوامض کو کہاں سے حاصل کر لیا۔

سرِّ خدا کہ زاہد و عابد بکس نگفت

در حیرتم کہ بادہ کشاں از کجا شنید!

اس کا جواب اقبالؒ کے ان الفاظ کے سوا کیا دیا جا سکتا ہے کہ

خرد نے اس کو سکھا کی نظرِ حکیمانہ!

سکھائی عشق نے اس کو حدیثِ رندانہ

اس نے اپنی خداداد بصیرت سے، خالی الذہن ہو کر، خدا کی کتاب کا مطالعہ کیا تھا اور اس کتابِ عظیم نے اپنے یہ حقائق اس پر واشگاف کر دیئے تھے۔

برادرانِ عزیز! وقت تیزی سے دوڑ رہا ہے اور یہ داستان ابھی طویل ہے لیکن میں اسے ایک اقتباس پر ختم کر دینا چاہتا ہوں۔ اگست ۱۹۴۱ء میں قائدِ اعظمؒ حیدر آباد (دکن) تشریف لے گئے۔ وہاں چند نوجوانوں نے آپ سے انٹرویو لیا اور کچھ سوالات پوچھے۔ یہ سوال و جواب اورینٹ پریس کی وساطت سے باہر آئے۔ آپ انہیں سنیئے اور پھر غور کیجئے کہ جس اختصار اور جامعیّت سے اسلامی حکومت کے خصائص اور لوازم کو اس "رہبرِ فرزانہ" نے بیان کیا ہے اس پر کسی اضافہ کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟۔ غور سے سنیئے:۔

اسلامی حکومت کے خصائص

سوال۔ مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں؟

جواب۔ جب میں انگریزی زبان میں مذہب (RELIGION) کا لفظ سنتا ہوں تو اس زبان اور محاورہ کے مطابق لامحالہ میرا ذہن خدا اور بندے کی باہمی نسبت اور رابطہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقیّد مفہوم یا تصوّر نہیں میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ مُلّا، نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے۔ البتہ میں نے قرآنِ مجید اور قوانینِ اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم الشّان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلّق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی، سیاسی ہو یا معاشی، غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآنِ کریم کی اصولی ہدایات اور سیاسی

طریقِ کار نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہیں بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے حسنِ سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصّہ ہے اس سے بہتر تصوّر ناممکن ہے۔

سوال۔ اس سلسلہ میں اشتراکی حکومت کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب۔ اشتراکیت، بالشویت یا اسی قسم کے دیگر سیاسی اور معاشی مسالک، دراصل اسلام اور اس کے نظامِ سیاست کی غیر مکمل اور بھونڈی سی نقلیں ہیں۔ ان میں اسلامی نظام کے اجزاء کا سا ربط اور تناسب و توازن نہیں پایا جاتا۔

سوال۔ ترکی حکومت تو سیکولر اسٹیٹ ہے۔ کیا اسلامی حکومت اس سے مختلف ہے؟

اس سوال کا پہلا حصّہ تو ایک جداگانہ عنوان سے متعلق ہے۔ لیکن دوسرے حصّہ میں جو کچھ قائدِ اعظمؒ نے کہا ہے وہ اس قابل ہے کہ اس کے ایک ایک لفظ پر بار بار غور کیا جائے۔ اس لئے کہ یہ جواب ان تمام پیچیدگیوں کو صاف کر دیتا ہے جو اسلامی آئین اور اسلامی حکومت کے متعلق آج کل عام طور پر ذہنوں میں پائی جاتی ہیں۔ آپ نے جواب میں فرمایا:۔

جواب۔ ترکی حکومت پر میرے خیال میں سیکولر اسٹیٹ کی سیاسی اصطلاح اپنے پورے مفہوم میں منطبق نہیں ہوتی۔ اب رہا اسلامی حکومت کے تصوّر کا امتیاز تو یہ بالکل واضح ہے۔ اسلامی حکومت کے تصوّر کا یہ امتیاز پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآنِ مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی، نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآنِ کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

برادرانِ عزیز! ان الفاظ پر پھر غور کیجئے کہ

(۱) اسلامی حکومت میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے، جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآنِ مجید کے احکام اور اصول ہیں۔

(۲) اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی، نہ کسی اور شخص کی یا ادارہ کی۔

(۳) قرآنِ کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے

ہیں۔

(۴) اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔

فرمائیے! کیا اسلامی حکومت کے اصول و مبانی کے متعلق اس سے زیادہ صاف، واضح اور جامع بات کچھ اور بھی کہی جا سکتی ہے؟

یہ تھی برادرانِ عزیز! وہ اسلامک آئیڈیالوجی جسے قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ پیش کرتے تھے اور وہ تھے حالات جن میں انہوں نے اس آئیڈیالوجی کو پیش کیا تھا۔ مجھے امید ہے کہ میری ان مختصر سی معروضات سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی ہوگی کہ ہماری جنگِ آزادی سے مفہوم کیا تھا؛ وہ کون سا خطرہ تھا جس سے ملّت کو بچانے کے لئے قوم کا یہ مشفق و غمخوار، دوبارہ میدانِ سیاست میں آیا تھا۔ ہندوؤں کے مشئوم عزائم کیا تھے اور ان کے ہمنوا مسلمان افراد اور جماعتیں اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ کیا کرنا چاہتی تھیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی واضح ہو گیا ہوگا کہ پاکستان کی سرزمین حاصل کرنے سے حقیقی مقصود کیا تھا؟

اس کے بعد یہ ہماری انتہائی بدقسمتی تھی کہ اس خطۂ زمین کے حاصل ہونے کے ساتھ ہی یہ کاروانِ سالار ہم میں باقی نہ رہا۔ اور اس کے بعد

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَوٰةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ۝ (19/59)

اس کے بعد ایک طرف ایسے ناخلف پیدا ہو گئے جنہوں نے زندگی کے بلند مقاصد کو فراموش کر دیا، اعلیٰ اقدار کو ضائع کر دیا، اپنی مفاد پرستیوں کے پیچھے پڑ گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خدا کے اٹل قانونِ مکافات کے مطابق تباہیاں ان کے سامنے آ کھڑی ہو گئیں۔ دوسری طرف وہی عناصر جو آخری وقت تک پاکستان کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے، نہایت ڈھٹائی سے پاکستان آ گئے اور بڑے بڑے مقدس اور معصوم نقابوں میں اس آتشِ انتقام کے فرو کرنے میں مصروف ہو گئے جو قائدِ اعظمؒ کے ہاتھوں شکستِ عظیم سے ان کے دلوں میں بھڑک اٹھی تھی۔ ان سب حالات نے مل کر ہمیں اس مقام تک پہنچا دیا جس سے ہر شخص باخبر ہے۔

لیکن اس سے برادرانِ عزیز! مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ علامہ اقبالؒ نے کتنی بڑی حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا جب انہوں نے کہا تھا کہ اس میں شبہ نہیں کہ دنیا کی ہر چیز بنتی اور بگڑتی ——— بگڑتی اور

بنتی ہے ؎

آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر کارِ جہاں بے ثبات، کارِ جہاں بے ثبات

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام

جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام!

یہی وہ مردِ خدا ہے جس کی یاد منانے کے لئے ہم آج یہاں جمع ہوئے ہیں، وہ یاد کہ جس سے ایک طرف ہر صاحبِ نظر کی یہ کیفیت ہے کہ

موجۂ گُل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال

اور دوسری طرف ہر قلبِ حسّاس کا یہ عالم کہ

فرشتے پونچھ لیتے ہیں مرے رخسار سے آنسو!

الٰہی! آج کس کی یاد میں شبنم فشاں ہوں میں

وَالسّلام علیٰ من اتبع الھدیٰ۔

(۱۹۵۹ء)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قائدِ اعظمؒ کا پاکستان

(یومِ قائدِ اعظمؒ کی تقریب پر دسمبر ۱۹۶۲ء میں تقریر)[1]

صدرِ محترم و برادرانِ عزیز! سلام و رحمت!

کیا اس قسم کی بات آپ کے لئے وجہِ تعجب نہ ہوگی کہ ایک شخص کسی شے کی تلاش میں برسوں تک مارا مارا پھرتا رہا۔ اس کے حصول کے لئے اس نے دن رات ایک کر دیئے۔ دنیا بھر کی مخالفت مول لی۔ وقت، دولت، توانائی صرف کی۔ بالآخر خدا خدا کر کے وہ گوہرِ مقصود ہاتھ آیا تو وہ سوچنے بیٹھ گیا کہ میں نے اس چیز کو مانگا کیوں تھا؟ میں نے اسے حاصل کس مقصد کے لئے کیا ہے؟ اسے کس مصرف میں لایا جائے گا؟

یقیناً یہ کہانی آپ کے لئے وجہِ تعجب ہوگی۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ وجہِ تعجب اور باعثِ حیرت یہ حقیقت ہوگی کہ یہ کہانی کسی اور کی نہیں خود ہماری اپنی کہانی ہے۔ ملّتِ پاکستانیہ کی کہانی ہے۔ ہم نے دنیا کے سامنے پاکستان کا مطالبہ پیش کیا۔ اس مطالبہ کی سخت مخالفت ہوئی۔ ہم نے ان مخالفتوں کا سر توڑ مقابلہ کیا۔ اس لئے کہ یہ ہماری زندگی کا نصب العین، ہماری تمناؤں کا مرکز اور ہماری آرزوؤں کا محور تھا۔ اس کے ساتھ ہماری موت اور زندگی کا سوال وابستہ تھا۔ ہم نے اس کے حصول کے لئے دس برس تک مسلسل جدّ و جہد کی۔ بالآخر ۱۹۴۷ء میں ہمارا یہ مقصد

---

[1] اس تقریر میں اور جو اس سے پہلے آ چکی ہے اور جو اس کے بعد آنے والی ہے، بعض اقتباسات مشترک ملیں گے۔ ان میں سے بعض کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اور بعض باقی رہنے دیئے گئے ہیں تاکہ مضمون کا تسلسل ٹوٹنے نہ پائے۔

حاصل ہو گیا۔ پاکستان وجود میں آ گیا۔

پاکستان کیوں مانگا تھا؟

لیکن جب یہ وجود میں آ گیا تو ہم نے ایک دوسرے سے پوچھنا شروع کر دیا کہ ہم نے پاکستان مانگا کیوں تھا؟ اس مطالبہ سے ہمارا مقصد کیا تھا؟ پاکستان سے بالآخر مفہوم کیا ہے؟ اسے کیا کیا جائے؟ اسے کیسا بنایا جائے وغیرہ وغیرہ۔ پاکستان کو وجود میں آئے پندرہ برس ہو گئے لیکن ہم ملّی اعتبار سے ابھی تک متعیّن نہیں کر سکے کہ ہم نے اسے حاصل کس مقصد کے لئے کیا تھا؟ ہمارے اس ذہنی انتشار کی حالت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ ایک طرف سے آواز آتی ہے کہ ہندوؤں کی تنگ نظری نے پاکستان بنوا دیا۔ اگر "وہ مسلمانوں کے ساتھ کشادہ دلی سے پیش آتے؛ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرتے" تو انہیں ہندوستان کی تقسیم کا خیال تک بھی نہ آتا۔ گویا مطالبۂ پاکستان کی بنیاد کسی مثبت جذبہ پر نہیں تھی۔ محض ہندوؤں کی تنگ نظری سے مجبور ہو کر ہم نے

بھانت بھانت کی بولیاں

علیحدگی کا فیصلہ کیا تھا اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر آج بھی ہندو یہ وعدہ کر لے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ فیاضانہ سلوک کرے گا تو ہم اپنی جداگانہ مملکت کو چھوڑ کر پھر اس کے ساتھ جا ملیں گے۔ (یاللعجب)

دوسری طرف سے آواز آتی ہے کہ صاحب! یہ تو انگریز کی چال تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ ہندوستان کو چھوڑ کر جائے تو ایسی شکل میں کہ ہندو اور مسلمان ہمیشہ آپس میں لڑتے رہیں۔ اس لئے اس نے پاکستان کا تصوّر پیدا کیا، اور مسٹر جناحؒ کو آگے بڑھایا۔ گویا مسٹر جناحؒ انگریز کے اس مقصد کو بروئے کار لانے کے لئے آلۂ کار تھے۔ یہ اس شخص کی نسبت کہا جاتا ہے جس کے متعلق اس کے بدترین دشمنوں تک کو اعتراف تھا کہ ——— "وہ کسی قیمت پر، کسی کے ہاتھ بک نہیں سکتا تھا۔"*

غرضیکہ جتنے منہ اتنی باتیں ——— کوئی کچھ کہتا ہے، کوئی کچھ۔ آیئے اس تھوڑے سے وقت کو غنیمت جانیں اور ہم خود قائدِاعظمؒ سے پوچھیں کہ آپ نے پاکستان کا مطالبہ کیوں کیا تھا؟ آپ الگ مملکت کیوں چاہتے تھے؟ اس مملکت کا تصوّر آپ کے ذہن میں کیا تھا؟ اسے آپ نے کس مقصد کے لئے حاصل کیا تھا؟ اسے آپ کیا دیکھنا چاہتے تھے، کیا بنانا چاہتے تھے؟ ان سوالات کے جواب میں جو کچھ قائدِاعظمؒ کہیں، اس سے بڑی شہادت اس باب میں کوئی اور ہو نہیں سکتی۔

---

* ۸ مارچ ۱۹۴۴ء کا ذکر ہے۔ قائدِاعظمؒ نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک اہم تقریر کی جس کا چرچا بڑی

پاکستان کب وجود میں آیا تھا؟

دیر تک رہا۔ اس میں سوال زیرِ نظر یہ تھا کہ پاکستان کے تصوّر سے مطلب کیا ہے؛ اس مطالبہ کی بنیاد کیا ہے؛ اس کی وجہِ جواز کیا ہے؟ یہ یکایک اُفقِ ذہنی سے کیسے اُبھر آیا۔ یہ نظریہ نکل کہاں سے پڑا......... یہ تھے وہ سوالات جن کا جواب دینے کے لیئے قائدِ اعظمؒ اُٹھے تھے۔

قائدِ اعظمؒ کا انداز، یہ تھا کہ وہ بات بڑی مختصر کرتے تھے لیکن وہ ہوتی تھی بڑی جامع، صاف، سیدھی، دوٹوک، نہ اس میں نہ کوئی پیچ وخم ہوتا تھا نہ ابہام یا الجھاؤ۔ انہوں نے مذکورہ بالا سوالات کا جواب ایک فقرہ میں دے دیا۔ اور وہ فقرہ ایسا ہے کہ جوں جوں اس پر غور کیجئے نگۂ بصیرت وجد میں آ جاتی ہے۔ اس سے نہ صرف مطالبۂ پاکستان کی بنیاد اور وجہِ جواز ہی سامنے آ جاتی ہے بلکہ خود اسلام کا ایک بنیادی اصول بھی اس طرح اجاگر ہوتا ہے کہ اس سے بہت سے سیاسی عقدے حل ہو جاتے ہیں۔ آپ نے کہا کہ

"پاکستان اس دن وجود میں آگیا تھا جب ہندوستان میں پہلا غیر مسلم مسلمان ہوا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے، جب یہاں مسلمانوں کی حکومت بھی قائم... نہیں ہوئی تھی۔"

نظریۂ قومیّت

غور فرمایا آپ نے کہ اس سیدھے سادے اور مختصر سے جملے میں کتنی بڑی حقیقت کو بے نقاب کر دیا گیا ہے کہ آج اگر ہندوستان میں کوئی ہندو عیسائی ہو جائے تو اس کے صرف مذہبی عقیدہ میں تبدیلی آتی ہے۔ اس کی سیاسی زندگی پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ وہ جس طرح پہلے ہندوستانی قوم کا فرد تھا اسی طرح اس تبدیلیٔ مذہب کے بعد بھی اسی قوم کا فرد رہے گا۔ یا مثلاً انگلستان میں یہودیت کے پیرو بھی بستے ہیں اور عیسائی بھی۔ اگر کوئی یہودی اپنا مذہب چھوڑ کر عیسائی ہو جاتا ہے تو اس سے اس کی قومیّت (NATIONALITY) پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ وہ بدستور انگلستانی رہتا ہے لیکن اسلام کی کیفیت اس سے بالکل مختلف ہے۔ اس میں جہاں کوئی شخص اسلام لاتا ہے وہ ایک جداگانہ قوم (امّتِ مسلمہ) کا فرد بن جاتا ہے۔ اس سے صرف اس کا مذہب ہی نہیں بدلتا؛ اس کی قومیّت بھی بدل جاتی ہے۔ بالفاظِ دیگر، اسلام میں، قومیّت کا مدار، نسل، رنگ، زبان یا وطن کا اشتراک نہیں، اس کا مدار دین کا اشتراک ہے۔ جو لوگ دین میں مشترک (مسلمان) ہیں وہ دنیا کے کسی خطّے میں بستے ہوں، کسی نسل سے متعلق ہوں، کوئی زبان بولتے ہوں، وہ سب ایک قوم کے افراد ہیں۔ اس کے برعکس، اگر وہ ایک ہی ملک میں بستے ہوں اور ایک ہی نسل کیا، بلکہ ایک ہی خاندان سے بھی متعلق کیوں نہ ہوں، اگر وہ دین میں مشترک نہیں (دونوں مسلمان نہیں) تو وہ دو الگ الگ قوموں کے افراد ہیں۔ فارس کا

سلمانؓ، روم کا صہیبؓ، حبشہ کا بلالؓ اور عرب کا عمرؓ، نسل، رنگ، زبان، وطن کے اختلاف کے باوجود محض دین کے اشتراک کی بنیاد پر ایک قوم کے افراد تھے۔ لیکن محمد رسول اللہ اور حضورؐ کا حقیقی چچا ابولہب —— دو الگ الگ قومیتیں رکھتے تھے —— یہی وہ اسلام کا اصل الاصول تھا جسے علامہ اقبالؒ نے بہت پہلے ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ ؎

اپنی ملّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر — خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی

ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار — قوّتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تیری

دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں

اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملّت بھی گئی!

اور اسی حقیقت کو قائدِ اعظمؒ نے اس چھوٹے سے فقرے میں بیان کر دیا تھا کہ

پاکستان اس دن وجود میں آگیا تھا جب ہندوستان میں پہلا غیر مسلم، مسلمان ہوا تھا۔

وہ غیر مسلم جب مسلمان ہوا تو پہلی قوم کا فرد نہیں رہا، وہ ایک جداگانہ قوم کا فرد ہو گیا۔ ہندوستان میں ایک نئی قوم وجود میں آگئی۔ اور جب ایک نئی قوم وجود میں آگئی تو اس کے لئے ایک الگ مملکت کی ضرورت بھی مسلّم ہو گئی۔ اس طرح پاکستان کی پہلی اینٹ اس دن رکھی گئی جب یہاں پہلا غیر مسلم مسلمان ہوا تھا۔

آپ نے غور فرمایا کہ پاکستان کے مطالبہ کا جذبۂ محرکہ کیا تھا؟ مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ مملکت کی وجۂ جواز کیا تھی؟ تقسیمِ ہند کی ضرورت کیوں پیش آئی تھی؟ ...... اس کی وجہ نہ ہندو کی تنگ نظری تھی نہ انگریز کی چال۔ یہ اسلام کا بنیادی مطالبہ تھا۔ یہ مسلمانوں کے دین کا تقاضا تھا۔ چونکہ دنیا کے لئے یہ نظریہ بالکل نیا اور قومیت کا یہ تصوّر، مروّجہ راستوں سے ہٹا ہوا تھا اگرچہ اسلام نے اسے چودہ سو سال پہلے پیش کیا تھا —— چودہ سو سال پہلے کیوں؟ یہ تو اس دن پیش کر دیا گیا تھا جب سب سے پہلے نبی کی وساطت سے خدا کی وحی انسانوں تک آئی تھی، اس لئے اس کی ضرورت تھی کہ اسے بار بار دہرایا جائے اور مختلف گوشوں سے اس کی وضاحت کی جائے۔ چنانچہ قائدِ اعظمؒ اسے مسلسل دس برس تک دہراتے رہے۔ انہوں نے ۲۱ مارچ ۱۹۴۴ء کو پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

مسلمان الگ قوم ہیں

”میں نہیں سمجھتا کہ کوئی دیانتدار آدمی اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ مسلمان بجائے خویش، ہندوؤں سے ایک الگ مستقل قوم ہیں“

یہ فرق اسی صورت میں سمجھ میں آسکتا تھا جب "مذہب اور دین" کا فرق سمجھ میں آجاتا۔ "مذہب" (جسے عام طور پر RELIGION کہہ کر پکارا جاتا ہے) "خدا اور بندے کے درمیان ایک پرائیویٹ تعلق کا نام ہے جسے انسان کی تمدنی، عمرانی، سیاسی، معاشی زندگی سے کچھ واسطہ نہیں۔ اس پرائیویٹ تعلق کو ایک عیسائی اپنے گرجے میں، ایک پارسی اپنے آتش کدہ میں، ایک ہندو اپنے مندر میں (اور انہی لوگوں کے خیال کے مطابق) ایک مسلمان اپنی مسجد میں ——— بلکہ یوں کہئے کہ ہر شخص اپنے اپنے گھر کے کسی کونے میں یا پہاڑ کے کسی غار میں، اپنے اپنے طور پر قائم کرسکتا ہے۔ جب وہ ایسا کرلیتا ہے تو مذہب کا دائرہ ختم ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد یہ لوگ اپنی عملی زندگی میں اپنے اپنے ملک کی سیاست کے مطابق کام کرتے ہیں۔ یہ ہے مذہب کا تصوّر۔ اس کے برعکس، دین کا تصوّر یہ ہے کہ یہ خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق کا نام نہیں۔ یہ زندگی کا ایک ضابطہ اور نظام حیات ہے جو انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہے۔ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قائدِ اعظمؒ نے ۲۷ نومبر ۴۵ء کو ایڈورڈس کالج پشاور میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ

مذہب اور دین کا فرق

> "ہم دونوں قوموں میں صرف "مذہب" کا فرق نہیں، ہمارا کلچر ایک دوسرے سے الگ ہے۔ ہمارا دین ہمیں ایک ضابطۂ حیات دیتا ہے جو زندگی کے ہر شعبہ میں ہماری راہ نمائی کرتا ہے۔ ہم اس ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔"

اس سے ظاہر ہے کہ پاکستان کی بنیاد اس دعویٰ پر تھی کہ اسلام ایک مذہب نہیں بلکہ دین ہے جسے آج کی اصطلاح میں تمدنی نظام کہنا چاہیئے۔ یہ دین ایک الگ آزاد مملکت میں ہی بروئے کار آسکتا ہے جہاں اس کے احکام اور اصول، قانون کی شکل میں نافذ کئے جاسکیں۔

اس تصوّر کی مخالفت

(مہاتما) گاندھی کی دُور رس نگاہ نے اس "خطرہ" کو بھانپ لیا اور سمجھ لیا کہ جب تک مسلمانوں کے دل سے مذہب اور دین کے اس تصوّر کو نکال نہ دیا جائے اور انہیں یہ باور نہ کرادیا جائے کہ اسلام بھی باقی مذاہب کی طرح ایک مذہب ہے، اس وقت تک پاکستان کے مقدمہ کو جیتا نہیں جاسکتا۔ اس کے لئے انہوں نے سب سے بہتر طریق کار یہ سوچا کہ، ہندوستانی بچوں (ہندوؤں اور مسلمانوں، سب کے بچوں) کی تعلیم میں یہ بات داخل کردی جائے کہ سب مذاہب سچے ہیں۔ رام بھی وہی ہے رحیم بھی وہی۔ کسی مذہب کو دوسرے مذہب پر فضیلت نہیں۔ اسلام، ہندو دھرم،

عیسائیت وغیرہ سب یکساں ہیں۔ اس کے لئے انہوں نے اپنی مشہور تعلیمی اسکیم (وِدّیا مندر یا واردھا کی اسکیم) جاری کی اور اسے عملاً مدرسوں میں نافذ کرنا چاہا۔

ہندو یہ کچھ کر رہا تھا ——— اس نے یہ کچھ کرنا ہی تھا۔ پاکستان کے مطالبہ سے اس کا وہ خواب، پریشان ہوا جا رہا تھا جس کی رُو سے وہ ہندوستان کی مسلم آبادی پر اپنی حکومت مسلّط کرنا چاہتا تھا لیکن آسمان کی آنکھ اس عبرت انگیز تماشا کو حیرت سے دیکھ رہی تھی کہ اس کی اس مخالفت میں خود مسلمانوں کے اکابرین ——— بالخصوص دین کے علمبردار حضرات ——— ان سے بھی آگے آگے تھے۔ چنانچہ مذہب اور دین کے اس فرق کو مٹانے اور اسلام کو باقی مذاہب جیسا ایک مذہب ثابت کرنے کے لئے مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) نے اپنی تفسیر القرآن (ترجمان القرآن) لکھی جس کی جلد اوّل (تفسیر سورۂ فاتحہ) میں بار بار اس دعوے کو دہرایا گیا کہ

"عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ اسلام کا کہنا ہے کہ اگر مذہب کے پیرو اپنے اپنے مذہب پر کاربند ہو جائیں تو میرا منشا پورا ہو جاتا ہے[1]"

کانگریس نے ان کی اس تفسیر کا ترجمہ مختلف زبانوں میں، لاکھوں کی تعداد میں شائع کرایا۔

اُدھر یہ کچھ ہو رہا تھا اور اِدھر قائدِ اعظمؒ اپنی اس پکار کو برابر دُہرائے جا رہے تھے کہ اسلام ایک مذہب نہیں، دین ہے۔ چنانچہ جب مارچ ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس (لاہور) میں پاکستان کا ریزولیشن پیش ہوا تو انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا:۔

میرے لئے یہ اندازہ لگانا بہت مشکل ہے کہ آخر ہمارے ہندو بھائی، اسلام اور ہندومت کی حقیقت اور اہمیت کو سمجھنے سے گریز کیوں کر رہے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ یہ دونوں مذہب نہیں بلکہ ایک دوسرے سے مختلف معاشرتی نظام ہیں اور اس بنا پر متحدہ قومیت ایک ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھیئے ہندو اور مسلمان مذہب کے ہر معاملے میں دو جداگانہ فلسفے رکھتے ہیں۔ دونوں کی معاشرت ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ یہ دو الگ الگ تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کی بنیادیں متضاد تصوّرات پر ہیں۔

---

[1] مولانا آزاد (مرحوم) کی اس تفسیر کی تردید میں، میں نے اسی زمانے میں ایک بھرپور مقالہ لکھا تھا جسے ملک میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ مقالہ اب میرے مجموعۂ مضامین (فردوسِ گم گشتہ) میں شامل ہو چکا ہے۔

دو ایسی قوموں کو ایک نظامِ سلطنت میں یک جا کر دینا باہمی منافشت کو بڑھائے گا اور بالآخر اس نظام کو پاش پاش کر دے گا جو اس ملک کی حکومت کے لئے وضع کیا گیا ہے۔

ان تصریحات کے ساتھ مطالبۂ پاکستان کا ریزولیوشن پاس کیا گیا جس سے مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کے مطالبہ کو سیاسی سند حاصل ہو گئی۔

اسلامی مملکت کے قیام کے لئے

اس کے بعد یہ سوال سامنے آیا کہ جب یہ خطّۂ زمین حاصل ہو جائے گا تو اس میں مملکت کس انداز کی ہو گی۔ آپ کو یاد ہو گا کہ پاکستان کا تصوّر، علاّمہ اقبالؒ نے اپنے الہٰ آباد (مسلم لیگ) کے خطبہ ۱۹۳۰ء میں پیش کیا تھا اس میں انہوں نے فرمایا تھا کہ

"مسلم مملکت کا میرا یہ مطالبہ، ہندوستان اور اسلام دونوں کے لئے منفعت بخش ہو گا۔ ہندوستان کو اس سے اس حقیقی امن اور سلامتی کی ضمانت مل جائے گی جو قوتوں کے توازن کا فطری نتیجہ ہو گی اور اسلام کو اس سے ایسا موقع میسّر آ جائے گا جس سے یہ اس ٹھپّہ کو مٹا سکے جو عرب (ملوکیت) نے اس پر زبردستی لگا رکھا ہے اور یہ اس قابل ہو سکے گا کہ یہ اپنے قوانین، تعلیم اور ثقافت کو پھر سے زندگی اور حرکت عطا کر سکے اور انہیں عصرِ حاضر کی روح کے قریب تر آنے کے قابل بنا سکے۔"

اسلامِ خالص

برادرانِ گرامی قدر! وقت نہیں ورنہ میں وضاحت سے بتاتا کہ علاّمہ اقبالؒ نے جو یہ فرمایا ہے کہ پاکستان کی اسلامی مملکت میں، اسلام کو موقع میسّر آ جائے گا کہ یہ اس ٹھپّے کو مٹا سکے جو عرب ملوکیت نے اس پر زبردستی لگا رکھا ہے تو اس کا مطلب کیا ہے۔ یہ ایک عظیم حقیقت ہے، جس کی طرف وہ چند لفظوں میں اشارہ کر گئے ہیں۔ میں اس وقت صرف اتنا کہہ کر اپنے موضوع کی طرف آ جانا چاہتا ہوں کہ ہمارے ہاں جو اسلام اس وقت بالعموم مروّج ہے وہ بہ حیثیتِ مجموعی، ہمارے دورِ ملوکیت کا پیدا کردہ ہے۔ علامہ اقبالؒ یہ چاہتے تھے کہ اگر پاکستان کا خطّۂ زمین حاصل ہو جائے تو اس میں، اس حقیقی اسلام کو پھر سے عملاً متشکل کیا جائے جو عہدِ محمدؐ رسول اللہ والذین معہٗ میں وجہ "نازش" عالم تھا۔ اس طرح اسلام سے وہ ٹھپّہ مٹ سکے گا جو اس پر عرب حکومت نے صدیوں سے لگا رکھا ہے۔ یعنی پاکستان ایک اسلامی مملکت ہو گا اور اس میں اسلام اپنی اصلی اور حقیقی شکل میں رائج ہو گا۔

علاّمہ اقبالؒ کے یہی وہ بلند تصوّرات تھے جن کی بنا پر قائدِ اعظمؒ نے ۹ دسمبر ۱۹۴۴ء کو یومِ اقبالؒ کی تقریب پر

انہیں ان گراں قدر الفاظ میں یاد فرمایا تھا:۔

علامہ اقبالؒ اگرچہ ایک عظیم شاعر اور فلسفی تھے لیکن وہ عملی سیاست دان بھی کم پائے کے نہ تھے۔ وہ اسلامی اصولوں پر ایمانِ کامل اور یقینِ محکم کی بنیاد پر، ان چند افراد میں سے تھے جنہوں نے سب سے پہلے یہ تصوّر پیش کیا کہ ہندوستان کے شمالی مغربی اور شمال مشرقی علاقوں کو ہندوستان سے الگ کر کے ایک اسلامی مملکت تشکّل کی جاسکتی ہے۔

یعنی پاکستان سے مقصود وہ خطّۂ زمین تھا جس میں اسلامی مملکت قائم کی جائے چنانچہ انہوں نے ۱ مارچ ۴۴ء میں، پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے سالانہ کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

"پاکستان کے تصوّر کو جو مسلمانوں کے لئے اب ایک عقیدہ کی حیثیت رکھتا ہے، مسلمانوں نے اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ ان کی حفاظت، نجات اور تقدیر کا راز اسی میں مضمر ہے۔ اس سے یہ آواز اقصائے عالم میں گونجے گی کہ دنیا میں ایک ایسی مسلم مملکت بھی ہے جو اسلام کی عظمتِ گزشتہ کو ازسرِ نو زندہ کرے گی۔"

اس سے ظاہر ہے کہ قائدِ اعظمؒ کے ذہن میں یہ تصوّر موجود تھا کہ پاکستان، مسلمانوں کی دوسری مملکتوں جیسی مملکت نہیں ہوگی۔ یہ وہ مملکت ہوگی جو اسلام کی عظمتِ گزشتہ کو ازسرِ نو زندہ کرے گی۔

اسلامی قوانین

انہوں نے ۲۱ نومبر ۱۹۴۵ء کو، فرنٹیر مسلم لیگ (پشاور) کی کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے کہا:۔

"مسلمان، پاکستان کا مطالبہ اس لئے کرتے ہیں کہ وہ اس میں اپنے ضابطۂ حیات، ثقافتی نشوونما، روایات اور اسلامی قوانین کے مطابق زندگی بسر کرسکیں۔"

جون ۱۹۴۵ء میں انہوں نے فرنٹیر مسلم اسٹوڈنٹس کے نام اپنے پیغام میں فرمایا:۔

"پاکستان سے مطلب یہ نہیں کہ ہم غیر ملکی حکومت سے آزادی چاہتے ہیں، اس سے حقیقی مراد مسلم آئیڈیالوجی ہے جس کا تحفّظ نہایت ضروری ہے۔ ہم نے صرف اپنی آزادی ہی حاصل نہیں کرنی ہے، اس قابل بھی بننا ہے کہ ہم اس کی حفاظت کرسکیں اور اسلامی تصوّرات اور اصولات کے مطابق زندگی بسر کرسکیں۔"

میں نے ابھی ابھی کہا ہے کہ قائدِ اعظمؒ کا یہ انداز تھا کہ وہ کسی بات کو مبہم اور غیر واضح نہیں رہنے دیتے تھے۔ پاکستان

کے متعلق ابھی تک۔ ان کے یہ خیالات ہمارے سامنے آسکے ہیں کہ اس سے مقصد اسلامی مملکت تھا جس میں ہم اپنے تصورات کے مطابق اسلامی قوانین کے تابع زندگی بسر کریں۔" اسلامی مملکت؛ اسلامی نظام" حتیٰ کہ" اسلامی قوانین" سے کیا مراد ہے؟ مختلف سمتوں سے اس کا جواب مختلف ملتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا قائدِ اعظمؒ نے ان اصطلاحات کو ایسے ہی استعمال کر دیا تھا یا اپنے مفہوم کو متعین طور پر بھی بیان کیا تھا۔!

انہوں نے حسبِ عادت متعین طور پر بتا دیا تھا کہ" اسلامی نظام" سے ان کا مقصد کیا ہے؟ اگست ۱۹۴۱ء میں وہ حیدر آباد (دکن) تشریف لے گئے۔ وہاں عثمانیہ یونیورسٹی کے طالب علموں نے، ان سے اس باب میں کچھ سوالات پوچھے۔ ان سوالات کے جواب میں انہوں نے جو کچھ کہا، اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی نظام سے ان کا متعین مفہوم کیا تھا؛

(یہ اقتباس سابقہ تقریر میں آچکا ہے، وہاں سے دیکھ لیا جائے ـــ صـ۵۶ پر)

آپ اس جواب کے ایک ایک فقرہ پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ اس حقیقت کو کس قدر غیر مبہم مختصر لیکن جامع الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے کہ کوئی مملکت اسلامی کس طرح بنتی ہے۔ اسلام کی بنیادی تعلیم لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کے سوا کوئی اور ہستی ایسی نہیں جس کی اطاعت اختیار کی جائے۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۴۰/۱۲) اس کے سوا کسی اور کا فیصلہ قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ کسی اور کو اس کا حق ہی حاصل نہیں کہ کسی سے اپنا فیصلہ اور حکم منوائے۔

لیکن خدا تو ایک اَن دیکھی، مطلق ذات کا نام ہے۔ اس کی اطاعت کی عملی شکل کیا ہو گی؟ کیسے معلوم کیا جائے گا کہ فلاں معاملہ میں اس کا حکم اور فیصلہ کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ" اس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں"۔ اسی لئے اس کا ارشاد ہے کہ: اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ (۳/۷) جو کچھ تمہاری طرف خدا نے نازل کیا ہے اس کا اتباع کرو۔ اس کے سوا کسی اور سرپرست کا اتباع مت کرو۔ بالفاظِ دیگر" اسلامی حکومت قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے"۔ اسی کے احکام ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ یہی چیز کفر اور ایمان کا خطِ امتیاز قرار پاتی ہے۔ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۴۴/۵) "ـــ جو خدا کی کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کرتے تو یہی لوگ ہیں جنہیں کافر کہا جاتا ہے"۔

" مسٹر جناح" پاکستان کی اسلامی مملکت کے متعلق یہ تصور پیش کر رہا تھا اور دین کے علمبردار حضرات یہ کہہ کر

مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کر رہے تھے کہ

"جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومتِ الٰہی قائم ہو جائے گی، ان کا گمان غلط ہے۔ دراصل اس کے نتیجہ میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی۔[1]"

یعنی جس حکومت کے متعلق یہ اعلان کیا جا رہا تھا کہ اس میں آزادی اور پابندی کے حدود، خدا کے متعین کردہ ہوں گے، اس کے خلاف لوگوں کو یہ کہہ کر مطمئن کیا جا رہا تھا کہ وہ "مسلمانوں کی کافرانہ حکومت" ہوگی۔

ہم نے برادرانِ عزیز! دیکھ لیا ہے کہ قائدِ اعظمؒ کے نزدیک مملکتِ پاکستان کا بنیادی دستور اور ضابطہ قرآنِ کریم کو قرار پانا تھا۔ قرآنِ مجید کی عظمت اور جامعیت قائدِ اعظمؒ کے اُفقِ ذہن پر کس طرح چھا رہی تھی، اس کا اندازہ ان کے ان بیانات سے لگایا جا سکتا ہے جن میں وہ وقتاً فوقتاً اس حقیقت کو سامنے لاتے رہے۔ مثلاً ۱۹۴۵ء میں قوم کے نام عید کے پیغام میں انہوں نے جو کچھ فرمایا اسے سابقہ تقریب میں لکھا جا چکا ہے — (دیکھئے ص ۵۴)

یہ بھی ظاہر ہے کہ ہندوستان کے مسلمان، مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ان کی الگ الگ پارٹیاں بھی تھیں۔ ان میں نسلی اور صوبائی تعصب بھی تھا۔ خود پاکستان نے جن دو بڑے بڑے خطوں پر مشتمل ہونا تھا (یعنی مغربی اور مشرقی پاکستان) ان میں ہزاروں میل کا فاصلہ تھا۔ لسانی اور نسلی نقطۂ نگاہ سے بھی ان دونوں خطوں کے رہنے

مسلمانوں میں وجہِ جامعیت

والوں میں کوئی وجہِ اشتراک نہ تھی۔ سوال یہ تھا کہ ان تمام وجوہِ اختلاف کے باوجود، وہ کون سی قدرِ مشترک ہے جو ان باہم دگر متضاد عناصر کو ایک نقطہ پر جمع کر سکتی تھی۔ اس کا جواب قائدِ اعظمؒ کے الفاظ میں سنیئے۔ انہوں نے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس (۱۹۴۳ء۔ واقع کراچی) میں پہلے خود ہی یہ سوال اٹھایا کہ

"وہ کونسا رشتہ ہے جس میں منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسدِ واحد کی طرح ہیں۔ وہ کونسی چٹان ہے جس پر ان کی ملت کی عمارت استوار ہے۔ وہ کونسا لنگر ہے جس سے اس اُمت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے۔"

اس کے بعد خود ہی اس سوال کا جواب اِن الفاظ میں دیا کہ

---

[1] دیکھئے سیّد ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی کتاب "سیاسی کشمکش" حصہ سوم۔

" وہ بندھن، وہ رشتہ، وہ چٹان، وہ لنگر، خدا کی کتاب عظیم قرآن کریم ہے۔ مجھے یقین محکم ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے ہم میں زیادہ سے زیادہ وحدت پیدا ہوتی جائے گی۔ ایک خدا، ایک رسولؐ، ایک کتاب، ایک امت۔"

بکھرے ہوئے مسلمانوں میں وحدت پیدا کرنے کا یہ وہ طریق تھا جسے خود خدا نے تجویز کیا تھا۔ جب کہا تھا کہ..... وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا..... (۳/۱۰۳) "تم سب مل کر خدا کے اس سر رشتہ کو محکم طور پر تھام لو، اور تفرقہ پیدا نہ کرو۔" قرآن پر ایمان لانے سے، دنیا کے مختلف انسان، ایک قوم بنتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ وابستہ رہنے سے ان کی وحدت برقرار رہ سکتی ہے۔ اسی کو قائدِ اعظمؒ نے اہلِ پاکستان کے لئے وجہ جامعیت قرار دیا تھا۔

یہ کچھ قائدِ اعظمؒ نے حصولِ پاکستان سے بہت پہلے کہا تھا۔ بعض گوشوں سے اب یہ آواز اٹھائی جاتی ہے کہ پاکستان سے پہلے تو بے شک قائدِ اعظمؒ نے یہی کچھ کہا تھا لیکن حصولِ پاکستان کے بعد انہوں نے اپنے خیالات میں تبدیلی پیدا کر لی تھی۔

حصولِ پاکستان کے بعد

نہ صرف یہ کہ یہ دعویٰ واقعات کے خلاف ہے بلکہ جس شخص کو قائدِ اعظمؒ کی طبیعت اور کردار سے ذرا سی بھی واقفیت ہے وہ بلاتوقّف کہہ دے گا کہ هٰذا بهتان عظیم۔ حصولِ پاکستان کے بعد انہوں نے اکتوبر ۱۹۴۷ء میں، خالق دینا ہال (کراچی) میں حکومت کے افسروں سے خطاب کرتے ہوئے کہا:-

" پاکستان کا قیام جس کے لئے ہم گذشتہ دس سال سے مسلسل کوشش کر رہے تھے، اب خدا کے فضل سے ایک حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آ چکا ہے۔ لیکن ہمارے لئے اس آزاد مملکت کا قیام مقصود بالذات نہیں تھا، بلکہ ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہمیں ایک ایسی مملکت مل جائے جس میں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں اور جس میں ہم اپنی روشنی اور ثقافت کے مطابق نشوونما پا سکیں۔ اور جہاں اسلام کے عدلِ عمرانی کے اصول آزادانہ طور پر روبہ عمل لائے جا سکیں۔"

"اسلام کے عدلِ عمرانی کے اصول" کیا ہیں، اس کی تشریح ذرا آگے چل کر سامنے آئے گی۔ اس مقام پر میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جن اسلامی اصولوں کا اعلان، قائدِ اعظمؒ، تحریکِ پاکستان کے دوران کیا کرتے تھے، انہی کا اعادہ پاکستان کے حصول کے بعد بھی کرتے رہے۔ تقسیمِ ہند کے بعد ہندوؤں نے جس قدر مسلمانوں کا کشت و خون کیا وہ

تاریخ کی نہایت عبرت انگیز خونی داستان ہے۔ اس وقت حالات بڑے نازک تھے' جن کی وجہ سے مسلمان بہت مضطرب و پریشان تھے۔ ان حالات میں قائدِ اعظمؒ نے ۳۰ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو یونیورسٹی اسٹیڈیم (لاہور) میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

"اگر ہم نے ان حالات میں، قرآن سے راہ نمائی لی، تو ہم ہندوؤں کی سازش کے علی الرغم کامیاب ہو کر رہیں گے"

وہ ایسے نامساعد حالات میں بھی، قرآن ہی سے راہ نمائی حاصل کرنے کی تلقین کرتے تھے۔

دستورِ پاکستان

تشکیلِ پاکستان کے بعد سب سے اہم مسئلہ دستورِ پاکستان کی تدوین کا تھا۔ ساری دنیا کی نظریں پاکستان کی طرف اُٹھ رہی تھیں، یہ دیکھنے کے لئے کہ یہ نوزائیدہ مملکت جو اسلام کے ازسرِ نو احیاء کا دعویٰ لے کر وجود میں آئی ہے، اپنے لئے دستور کس انداز کا مرتب کرتی ہے۔ اس سلسلے میں قائدِ اعظمؒ نے فروری ۱۹۴۸ء میں اہلِ امریکہ کے نام ایک پیغام براڈ کاسٹ کیا، جس میں کہا کہ

"پاکستان کا نسٹی ٹیوینٹ اسمبلی نے ابھی پاکستان کا آئین مرتب کرنا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس آئین کی آخری شکل کیسی ہوگی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کا آئینہ بردار، جمہوری انداز کا آئین ہوگا۔ اسلام کے یہ اصول آج بھی اسی طرح عملی زندگی پر منطبق ہو سکتے ہیں جس طرح وہ تیرہ سو سال پہلے ہو سکتے تھے۔ اسلام نے ہمیں وحدتِ انسانیت اور ہر ایک کے ساتھ عدل اور دیانت کی تعلیم دی ہے۔

تھیاکریسی نہیں ہوگی

آئینِ پاکستان کے مرتب کرنے کے سلسلے میں جو ذمہ داریاں اور فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں، ان کا ہم پورا پورا احساس رکھتے ہیں۔ کچھ بھی ہو یہ مسلّمہ بات ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیاکریسی رائج نہیں ہوگی جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعمِ خویش) "خدائی مشن" کو پورا کریں۔"

اب آپ نے سمجھ لیا عزیزانِ من! کہ ہمارے مذہبی پیشوا تحریکِ پاکستان کے خلاف کیوں تھے؟ اور وہ کیوں "مسٹر جناح" کے خلاف اس قدر پروپیگنڈہ کرتے تھے؟ یہ قوم کی انتہائی بدقسمتی تھی کہ قائدِ اعظمؒ کی عمر نے ایفا نہ کیا اور انہیں اتنی مہلت ہی نہ مل سکی کہ وہ دستورِ پاکستان مرتب کر سکتے' ورنہ یہاں چودہ پندرہ سال سے مذہب کے نام پر جو انتشار پیدا کیا جا رہا ہے، ملک اس سے بچ جاتا اور اس وقت تک ہماری کشتیٔ ملت کہیں سے کہیں پہنچ چکی ہوتی۔ بہرحال یہ ایک الگ داستان ہے جو ہمارے آج کے

موضوع سے ہٹی ہوئی ہے۔

اب اسلام کے عدلِ عمرانی کے ان اصولوں کو دیکھئے جن کی طرف پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے۔ اسلام کا منتہیٰ یہ ہے کہ ایک فرد کی تمام مضمر صلاحیتوں کی اس طرح نشو و نما ہو جائے کہ وہ اس دنیا میں اور اس کے بعد حیاتِ اخروی میں زندگی کے ارتقائی منازل طے کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا جائے۔ اس مقصد کے لئے وہ سب سے پہلے، افراد کو زندگی کی بنیادی ضروریات (خوراک، لباس، مکان وغیرہ) کی طرف سے بے فکر کر دیتا ہے "تاکہ وہ اطمینان سے بلند مقاصدِ انسانیت کے حصول کے لئے جدّ و جہد کر سکیں۔ اس کے لئے اسلامی نظامِ مملکت، تمام افرادِ مملکت کو اس امر کی ضمانت دیتا ہے کہ "ہم خدا کی طرف سے تمہاری اور تمہاری اولاد کی ضروریاتِ زندگی کا ذمہ لیتے ہیں" ۶/۱۵۲

اسلام کے عدلِ عمرانی

اس کا نام اسلام کا عدلِ عمرانی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے ۱۹۳۷ء میں قائدِ اعظمؒ کے نام اپنے خط میں لکھا تھا کہ

"سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے افلاس کا علاج کیا ہے؛ لیگ کا مستقبل اس سوال کے حل پر موقوف ہے۔ اگر لیگ نے اس باب میں یہ نہ کیا تو مجھے یقین ہے کہ عوام اس سے اسی طرح بے تعلق رہیں گے جس طرح اس وقت تک بے تعلق رہے ہیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اسلامی آئین کے پاس اس مسئلہ کا حل موجود ہے۔ اس آئین کو دورِ حاضر کے تصوّرات کی روشنی میں مزید نشو و نما دی جا سکتی ہے۔ اسلامی آئین کے طویل اور گہرے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام کو اچھی طرح سے سمجھ کر نافذ کر دیا جائے تو اس سے کم از کم ہر فرد کو سامانِ پرورش ضرور مل جاتا ہے۔ اگر ہندوؤں نے سوشل ڈیماکریسی کو اپنے ہاں قبول کر لیا تو ہندو مت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ لیکن اسلام کے لئے سوشل ڈیماکریسی کو ایسے مناسب انداز سے قبول کر لینا جس سے یہ اس کے اصولوں سے نہ ٹکرائے اسلام میں کسی تبدیلی کے مترادف نہیں ہوگا بلکہ اس سے مفہوم یہ ہوگا کہ ہم اسلام کو پھر سے اس منزّہ صورت میں اختیار کر رہے ہیں جیسا کہ یہ شروع میں تھا۔"

تشکیلِ پاکستان کے بعد جب مملکت نے اپنا (اسٹیٹ) بینک کھولا، تو جولائی ۱۹۴۸ء میں اس کے افتتاح کی تقریب، قائدِ اعظمؒ کے ہاتھوں سر انجام پائی تھی۔ اس موقع پر انہوں نے جو تقریر فرمائی (اور میرا خیال ہے کہ یہ ان کی زندگی کی آخری تقریر تھی) اس میں کہا کہ

"ہمارے پیشِ نظر مقصد یہ ہے کہ یہاں کے عوام خوش حالی اور اطمینان کی زندگی بسر کر سکیں۔ اس مقصد کا

حصول، مغرب کے اقتصادی نظام کو اختیار کرنے سے کبھی نہیں ہو سکتا۔ ہمیں اپنا راستہ آپ متعین کرنا چاہیئے اور دنیا کے سامنے ایک ایسا نظام پیش کرنا چاہیئے جو اسلامی مساوات اور عدلِ عمرانی کے اسلامی تصورات پر مبنی ہو۔ صرف یہی وہ طریق ہے جس سے ہم اس فریضہ سے عہدہ برآ ہو سکیں گے جو ہم پر مسلمان ہونے کی حیثیت سے عائد ہوتا ہے اور ہم دنیا کو وہ پیغام دے سکیں گے جو اسے تباہیوں سے بچا لے گا اور نوعِ انسان کی بہبود، مسرت اور خوشحالی کا ضامن ہو سکے گا۔ یہ کام کسی اور نظام سے نہیں ہو سکتا۔"

لیکن ظاہر ہے کہ جاگیرداری، زمینداری اور سرمایہ داری کی موجودگی میں، اسلام کا یہ معاشی نظام قائم نہیں ہو سکتا۔ تحریکِ پاکستان کے دوران، ملک کے بڑے زمیندار اور سرمایہ دار مسلم لیگ کے ساتھ تھے لیکن قائدِ اعظمؒ انہیں کسی دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتے تھے کہ حصولِ پاکستان کے بعد ان کی پوزیشن کیا ہو گی۔ انہوں نے تشکیلِ پاکستان سے بہت پہلے: ۱۹۴۳ء میں، آل انڈیا مسلم لیگ کے دہلی کے سیشن میں بر ملا اعلان کیا کہ

زمینداری اور سرمایہ داری

"اس مقام پر میں زمینداروں اور سرمایہ داروں کو بھی متنبہ کرنا چاہتا ہوں۔ وہ ایک ایسے فتنہ انگیز ابلیسی نظام کی رُو سے جو انسان کو ایسا بدمست کر دیتا ہے کہ وہ کسی معقول بات کو سننے کے لئے آمادہ ہی نہیں ہوتا عوام کے گاڑھے پسینے کی کمائی پر رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ عوام کی محنت کو غصب کر لینے کا جذبہ ان کی رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے۔ میں اکثر دیہات میں گیا ہوں۔ وہاں میں نے دیکھا ہے کہ لاکھوں خدا کے بندے ہیں جنہیں ایک وقت بھی پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی۔ کیا اسی کا نام تہذیب ہے؟ کیا یہی پاکستان کا مقصد ہے؟ اگر پاکستان سے یہی مقصود ہے تو میں ایسے پاکستان سے باز آیا۔ اگر ان سرمایہ داروں کے دماغ میں ہوش کی ذرا سی بھی رمق باقی ہے تو انہیں زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ چلنا ہو گا۔ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو ان کا خدا حافظ! ہم ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔"

مملکتِ پاکستان کا نقشہ

برادرانِ عزیز! یہ تھا مختصر الفاظ میں، قائدِ اعظمؒ کے تصور کی رُو سے پاکستان کا نقشہ ـــــ یعنی ـــــ

(۱) ایک ایسی مملکت جس میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود قرآنِ کریم کی رُو سے متعین ہوں۔

(۲) جس میں کوئی قانون ایسا نہ ہو جو قرآنِ کریم کے خلاف ہے۔

(۳) جس میں تھیاکریسی یعنی مذہبی پیشواؤں کی اجارہ داری کا کوئی سوال نہ ہو۔

(۴) جس میں کوئی فرد اپنی بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہنے پائے۔

(۵) اور جس میں سرمایہ داری اور زمینداری کے غیر اسلامی نظام کو ختم کر دیا جائے۔

(۶) جس میں نہ مغرب کی بے لگام جمہوریت راہ پا سکے نہ روس کی سرسام خیز اشتراکیت —— جس میں نظامِ سیاست و معیشت بہر حال حدود اللہ کے تابع رہے۔

یہ تھا وہ مقصد جس کے لئے قائدِ اعظمؒ نے پاکستان کے لئے انگریز؛ ہندو اور خود مسلمانوں کے علمائے کرام کے خلاف جو مکھی لڑائی لڑی تھی۔ ہماری بدبختی یہی نہیں کہ ہم اس وقت تک، پاکستان کو ان تصوّرات کے مطابق متشکّل نہیں کر سکے' اس سے بڑی بدبختی یہ ہے کہ خود یہ تصوّرات ہی رفتہ رفتہ قوم کی نظروں سے اوجھل ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ابھی یہاں، وہاں، ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے تحریکِ پاکستان میں عملی حصّہ لیا؛ جنہیں قائدِ اعظمؒ کے ساتھ کام کرنے کی سعادت نصیب ہوئی؛ جنہوں نے، ان کے ان ارشادات و

یہ تصوّرات اوجھل ہو رہے ہیں

پیغامات کو اپنے کانوں سے سنا اور اپنی آنکھوں سے پڑھا۔ لیکن یہ لوگ آہستہ آہستہ اُٹھتے چلے جائیں گے۔ ان کے بعد' ہماری آنے والی نسلوں کو اتنا بتانے والا بھی کوئی نہیں ہوگا کہ پاکستان کیوں مانگا گیا تھا۔ اور اس سے مقصود و مفہوم کیا تھا؟ کس قدر سنگین ہے ہمارا یہ جرم کہ ہم نے آج تک نہ تحریکِ پاکستان کی کوئی ایسی مستند تاریخ مرتّب کی ہے جس میں یہ مقاصد اُبھر کر سامنے آ جائیں اور نہ ہی قائدِ اعظمؒ کی کوئی ایسی سوانح عمری مدوّن کی ہے جو ان کے ان تصوّرات کی آئینہ دار ہو۔　　　والسلام

(۱۹۶۲ء)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پاکستان کس نے بنایا؟

۱۱ ستمبر ۱۹۶۳ء کی صبح، ساڑھے نو بجے قائدِ اعظمؒ کے یومِ وفات پر
بزمِ طلوعِ اسلام لاہور کے زیرِ اہتمام وائی ایم سی اے ہال میں تقریر

کہتے ہیں کہ جب سیمرغ[1] (PHOENIX) کو محسوس ہوتا ہے کہ اس کی زندگی کے آخری دن قریب آگئے ہیں تو وہ اپنے گرد تنکے جمع کر لیتا ہے اور اس آشیاں میں بیٹھ کر دیپک راگ الاپتا ہے جس سے، اس کے پروں سے شعلے نکلتے ہیں۔ ان سے اس کا آشیانہ بھی جل جاتا ہے اور وہ خود بھی راکھ کا ڈھیر بن کر رہ جاتا ہے۔ اس کے بعد اس راکھ پر بارش کا چھینٹا پڑتا ہے تو اس میں سے ایک نیا سیمرغ پیدا ہو جاتا ہے۔

قوموں کی حیاتِ نو

سیمرغ کے متعلق تو معلوم نہیں، لیکن جن قوموں میں زندگی کی کوئی رمق باقی ہوتی ہے، حوادثِ زمانہ انہیں جلا کر **راکھ کا ڈھیر بھی کیوں نہ بنا دیں**، ان کی خاکستر کے اندر سے دبی **ہوئی چنگاری اُبھرتی ہے** اور اس سے ایک ایسا زندہ انسان پیدا ہو جاتا ہے جو اس قوم کو حیاتِ نو عطا کر دیتا ہے۔ **اقبالؒ نے اسی** کی طرف اشارہ کیا تھا جب کہا تھا کہ ؎

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ — پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار! — اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

---

[1] یہ ایک افسانوی پرندہ ہے۔ کوئی اسے سیمرغ کہتا ہے کوئی قفنس، کوئی موسیقار۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد ــــــ کہ جسے انگریز کی استعماریت نے "غدر" سے تعبیر کر کے تاریخ کو مسخ کرنے کی کوشش کی تھی، مسلمان یکسر راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئے تھے۔ ان کی سلطنت ہی نہیں چھنی تھی، ان کی ملّی ہستی ختم ہو گئی تھی۔ وہ ایک قوم کی حیثیت سے باقی ہی نہیں رہے تھے۔ انگریز کی سیاست نے یُذَبِّحُونَ اَبْنَآءَکُمْ وَیَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَکُمْ[۴۹] کی ملّت کش پالیسی اختیار کر کے، ایک بار پھر فرعونی استبداد کی یاد تازہ کرا دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ہندو نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ وہ انگریزوں کے ساتھ مل کر اپنی ہزار سالہ غلامی کا انتقام ان مسلمانوں سے لے گا جو کسی نہ کسی طرح زندہ رہ گئے تھے۔ انہوں نے اس مقصد کے لئے ہر اقدام کا مورد مسلمانوں کو ٹھہرایا۔ "لائل محمڈنز آف انڈیا" کے مصنّف کے الفاظ ہیں:۔

۱۸۵۷ء کے بعد

"اس وقت کوئی آفت ایسی برپا نہیں ہوئی جس کے متعلق یہ نہ کہا گیا ہو کہ اسے مسلمانوں نے برپا کیا تھا، خواہ اسے رام دین اور ماتا دین نے ہی برپا کیوں نہ کیا ہو۔ کوئی بلا آسمانوں سے ایسی نہیں آئی جس نے سب سے پہلے مسلمانوں کا گھر نہ تاکا ہو۔ کوئی کانٹوں والا درخت اس زمانے میں نہیں اُگا جس کی نسبت یہ نہ کہا گیا ہو کہ یہ مسلمانوں نے بویا ہے۔ کوئی آتشیں بگولا نہیں اٹھا جس کے بارے میں یہ مشہور نہ کیا گیا ہو کہ اسے مسلمانوں نے اٹھایا ہے۔"

یہی تھے اس قوم کے وہ ناکردہ گناہ جن کی پاداش میں ڈاکٹر ہنٹر نے اپنی کتاب (دی انڈین مسلمانز) میں تجویز کر دیا تھا کہ مستقبل کے ہندوستان میں مسلمانوں کا مقام لکڑہاروں اور سقّاؤں سے زیادہ کچھ نہیں ہوگا۔

لیکن عین اسی زمانے میں خود انگریزی حکومت کے ایک دفتر کا معمولی ملازم (صدر امینی کا سررشتہ دار) جس کے بچپن اور جوانی کا زمانہ، خود اس کے اپنے الفاظ میں "کبڈی کھیلنے، کنکوّے اڑانے اور ناچ مجرے دیکھنے میں" گزرا تھا، اس قوم کی خاکستر سے چنگاری بن کر ابھرا اور دیکھتے ہی دیکھتے قوم کے عروقِ مردہ میں زندگی بخش حرارت بن کر سرایت کر گیا۔ جب اس کے دل میں قوم کو سنبھالنے کا احساس بیدار ہوا ہے تو فضا میں چاروں طرف چھائی ہوئی مایوسی کا عالم کیا تھا، اس کے متعلق اس نے بعد میں خود کہا تھا کہ

سرسیّد کی نمود

"میں اس وقت ہرگز یہ نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پھر پنپ سکے گی اور از سرِ نو عزت پانے کے قابل ہو جائے گی۔ آپ یقین کیجئے کہ اس غم نے مجھے بڈھا کر دیا اور میرے بال سفید ہو گئے۔"

یہ مسیحائے ملت، کہ قوم کے غم نے جس کے جوانی ہی میں بال سفید کر دیئے تھے، سیّد احمد خانؒ تھا جو بعد میں سر سیّد کے نام سے متعارف ہوا۔ اس زمانے میں بھی اس کے دل میں قوم کے غم کی گہرائی اور کیریکٹر کی بلندی کی کیا کیفیت تھی، اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگایئے۔ اس نے اس عالمگیر خلفشار کے زمانہ میں محض انسانی ہمدردی کی بنا پر بہت سی انگریز عورتوں اور بچّوں کی جان بچائی تھی۔ حکومت نے ان کی ان خدمات کے صلے میں

کیریکٹر کی بلندی

رؤسائے چاند پور کی ضبط شدہ جاگیر اور اس کے ساتھ ایک معقول جائداد پیش کی۔ لیکن اس نے اس پیش کش کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ

"ایک مسلمان بھائی کے خون سے اپنی پیاس بجھانا مجھے کسی طرح گوارا نہیں ہو سکتی۔"

اس نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی ایک تقریر میں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ

"میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ نالائق اس دنیا میں کوئی نہ ہوگا کہ قوم پر تو یہ بربادی ہو اور میں ان کی جائداد لے کر تعلقہ دار بنوں۔ چنانچہ میں نے اُسے قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

یاد رہے کہ سر سیّد اس زمانے میں انگریز کی حکومت کا ملازم تھا اور وقت ایسا تھا کہ گورنمنٹ کی طرف سے اس قسم کی پیش کش سے انکار، اس شخص کو باغیوں کے زمرے میں شامل کرا دینے اور پھانسی کے تختے پر لٹکوا دینے کے لئے کافی تھا۔ اس کے بعد سر سیّد کھل کر سامنے آ گیا اور ایک طرف مسلمانوں کو انگریز کے استبداد اور ہندو کی دسیسہ کاریوں سے بچانے اور دوسری طرف ان بکھرے ہوئے تنکوں کو اکٹھا کرنے میں ہمہ تن مصروف ہو گیا۔ وہ اس زمانے میں کہا کرتا تھا کہ

"میں جب رات کو آسمان کی طرف دیکھتا ہوں تو اس کے اس حصّے کی جو نیلا نیلا، سیاہ اور ڈراؤنا سا دکھائی دیتا ہے کچھ بھی پروا نہیں کرتا، بلکہ ان ستاروں کو دیکھنا چاہتا ہوں جو اس میں چمکتے ہیں اور معشوقانہ انداز کی کشش سے ہمیں اپنی طرف کھینچتے ہیں۔"

اور پھر وہ اپنے ساتھیوں سے سوال کیا کرتا تھا کہ

ستاروں کو دیکھنے کی تمنّا

"کیا تم اپنی قوم میں اس قسم کے لوگ پیدا کئے بغیر جو ستاروں کی طرح چمکتے ہوں اپنی قوم کو معزز اور دوسری قوموں کی نگاہ میں باعزّت بنا سکتے ہو؟"

وہ قوم کے لئے یہ کچھ کر رہا تھا اور قوم کے علمائے کرام اور مفتیانِ عظام اس پر کفر کے فتوے لگانے کے جہادِ عظیم

میں مصروف تھے اور سارا زور اسے مُلحد، لامذہب، کرسٹان، نیچری، دہریہ، دجّال، مرتد اور کافر ثابت کرنے میں صرف فرما چکے تھے۔ اس میں ہر فرقہ کے مولوی صاحبان شامل تھے۔ حتیٰ کہ جب فتویٰ پر چوٹی کے ساٹھ مولویوں کی مہروں اور دستخطوں سے سرسیدؒ کی تکفیر پر اجماع ہو گیا تو پھر یہ حضرات یہاں سے بھاگے بھاگے مکہ معظمہ پہنچے، تاکہ حرمین شریف کی مہروں سے فتویٰ کی محکمیت کو اور زیادہ ثبت کیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے بھی فرما دیا کہ

کفر کے فتوے

"یہ شخص یا تو ملحد ہے یا شرع سے کفر کی طرف مائل ہو گیا ہے یا زندیق ہے کہ کوئی دین نہیں رکھتا۔ اگر اس نے گرفتاری سے پہلے توبہ کر لی اور ان گمراہیوں سے رجوع کی اور توبہ کی علامتیں اس سے ظاہر ہو گئیں تو قتل نہ کیا جائے ورنہ دین کی حفاظت کے لئے اس کا قتل واجب ہے۔"

سرسیدؒ، قریہ قریہ، گاؤں گاؤں، شہر بہ شہر، کوچہ بکوچہ، قوم کا درد دل میں لئے، اس کی زندگی اور فلاح و بہبود کے لئے دیوانہ وار پھرتا تھا اور "یہ حامیانِ شرعِ مبین اور مفتیانِ دینِ متین" کفر کے فتوؤں کا انبار اٹھائے، اس کے پیچھے لگے رہتے اور لوگوں کو تلقین کرتے پھرتے کہ اگر نجات چاہتے ہو تو اس شخص کی کوئی بات نہ سننا۔ اس کے جواب میں سرسیدؒ کیا کہتا تھا، سنیئے۔ ایک مرتبہ وہ اسی تکفیر کے ہنگاموں اور گالی گلوچ کے جلو میں علی گڑھ مدرسہ کی تعمیر کے سلسلے میں لاہور آیا تو ایک اجتماعِ عظیم میں تقریر کرتے ہوئے اس نے کہا:-

فتویٰ کا جواب

اے بزرگانِ پنجاب! میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر ایک کافر و مرتد آپ کی قوم کی بھلائی کی کوشش کرے تو کیا آپ اسے اپنا خادم اور خیرخواہ نہیں سمجھیں گے۔ آپ کے لئے دولت سرا بناتے ہیں جس میں آپ آرام کرتے ہیں اور آپ کے بچے آرام پاتے ہیں یا آپ کے لئے مسجد بناتے ہیں جس میں آپ خدائے ذوالجلال کا نام پکارتے ہیں، چمار، قلی، کافر، بت پرست، بدعقیدہ، سب مزدور کام کرتے ہیں مگر آپ نہ کبھی اس دولت خانے کے دشمن ہوتے ہیں اور نہ مسجد کے منہدم کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ آپ مجھے بھی اس مدرسہ (علی گڑھ) کے قائم کرنے میں ایک قلی اور چمار کی مانند تصوّر کر لیجئے اور میری محنت اور مشقّت سے اپنے لئے گھر بننے دیجئے۔

سرسیدؒ کی یہ ساری کوششیں کس مقصد کے لئے تھیں؟ اس مقصد کے لئے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی ــــــ جو بکھرے ہوئے تنکوں کی طرح فضا میں منتشر تھے پھر سے شیرازہ بندی کی جائے تاکہ وہ اس ملک میں قائم بالذات اور مستقل جداگانہ قوم کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکیں۔ مسلمانوں کو یہ حیثیت دینے کے لئے نہ انگریز تیار

دو الگ الگ قومیں

تھا نہ ہندو رضا مند۔ انگریز انہیں ایک باغی مذہبی فرقہ تصوّر کرتے تھے اور ہندو انہیں اچھوت قرار دینے کے درپے تھے۔ لیکن سرسیّد نے ان دونوں کے علی الرغم اعلانیہ کہہ دیا کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں۔

"اور مجھے یقین ہو گیا ہے کہ یہ دونوں قومیں اب کسی کام میں بھی دل سے شریک نہیں ہو سکیں گی۔ ابھی تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ جوں جوں وقت گزرتا جائے گا یہ مخالفت اور عناد ان ہندوؤں کے سبب سے اُبھرے گا، جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں۔ جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا۔"

سرسیّد نے یہ الفاظ (۱۸۶۷ء میں) بنارس کے کمشنر، مسٹر شکسپئر کے سوال کے جواب میں کہے تھے۔ پاکستان کی بنیاد اس نظریہ پر اُستوار ہوئی ہے کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں۔ اس لئے ان کی مملکتیں بھی الگ الگ ہونی چاہئیں۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو یہ اعلان، اس بنیاد کی پہلی اینٹ ہے جو آج سے سو سال پہلے سرسیّد کے ہاتھوں رکھی گئی تھی۔

پاکستان کی پہلی اینٹ

اس اینٹ کو رکھتے ہوئے اس نے دارالعلوم کے طلباء سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ

"یاد رکھو! سب سے سچّا کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمدؐ رسول اللہ ہے۔ اسی پر یقین رکھنے سے ہماری قوم، ہماری قوم ہے۔ اگر تم نے سب کچھ کیا اور اس پر یقین نہ کیا تو تم ہماری قوم نہ رہے۔ پھر اگر تم آسمان کے ستارے بھی ہو گئے تو کیا؟ مجھے امّید ہے کہ تم علم اور اسلام دونوں باتوں کے نمونے ہو گے اور جبھی ہماری قوم کو حقیقی عزت نصیب ہو گی۔"

یہ تھا پاکستان کا معمارِ اوّل — سرسیدؒ — جس پر یہاں سے لے کر مکّہ معظّمہ تک کے علمائے کرام نے کفر و الحاد کے فتوے لگائے تھے۔ سوچیے کہ اگر قوم اس وقت ان فتوؤں کا اثر قبول کر لیتی تو ہم گنہگار تو ایک طرف، خود اس مقدّس طائفہ کی اولاد کا کیا حشر ہوتا؟ ان میں سے کوئی بھی عبداللہ اور عبدالرحمٰن نہ ہوتا، سب لالہ گردھاری لعل یا فضل مسیح ہوتے۔

سرسیّد نے آنکھیں بند کیں تو اس شمع کو سیالکوٹ کے ایک نوجوان کے سپرد کر دیا جو اس زمانے میں ہنوز —

اقبالؒ

ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

کا وطنی ترانہ گایا کرتا تھا۔ اس کے بعد جب وہ یورپ گیا اور وہاں وطنیت یا قومیّت (نیشنلزم)

کی تباہ کاریوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تو اس پر قرآنِ کریم میں بیان کردہ یہ حقیقت بے نقاب ہو گئی کہ قومیت کی بنیاد مشترکہ آئیڈیالوجی (با ایمان) ہے، وطن کا اشتراک نہیں۔ چنانچہ جب وہ وہاں سے واپس آیا تو اُس کی زبان پر "ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا" ــــ کی جگہ

مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

تھا۔ اُس زمانے میں یہاں قومیت پرستی کا بڑا چرچا تھا۔ اس لئے کہ یہ تصور، ہندو اور انگریز دونوں کے لئے مفید تھا۔ اقبالؒ کی نگہِ دُوررس نے مسلمانوں کے لئے اس عظیم خطرے کو بھانپا اور جو بات سرسیدؒ نے پچاس سال پہلے مجملاً کہی تھی اسے شرح و بسط کے ساتھ کہنا شروع کر دیا۔ اس نے نظریۂ وطنیت کے فریب خوردہ مسلمانوں کو للکار کر کہا کہ یاد رکھو!

مسلم قومیّت کا معیار

ترالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا!
بنا، ہمارے حصارِ ملّت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

اور اس سے بھی واضح تر الفاظ میں کہ

اس دَور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور	ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور	تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے!
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے!	غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبوی ہے!
بازو ترا، توحید کی قوّت سے قوی ہے	اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظّارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے!
اے مصطفوی خاک میں اس بُت کو ملا دے

وہ یومِ اوّل سے اپنے آخری سانس تک اسی پیغام کو دہراتا چلا گیا۔ جب اس نے دیکھا کہ فضا اس سے متاثر ہو گئی ہے تو اس نے الہ آباد کے مقام پر مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے خطبۂ صدارت میں اس حقیقت کا اعلان کر دیا کہ مسلمان ایک جداگانہ قوم ہے۔ اس لئے اس کی مملکت بھی الگ اور آزاد ہونی چاہیئے تاکہ یہ اس میں قرآن کے احکام و قوانین کو ایک زندہ حقیقت کی طرح نافذ کر کے صحیح اسلامی زندگی بسر کر سکے۔ حضرات علمائے کرام

پاکستان کا اوّلین تصوّر

نے اقبالؒ کے خلاف پہلے ہی کفر کے فتوے صادر کر رکھے تھے، اس اعلان نے گویا بھِڑوں کے چھتّے میں پتھر مار دیا۔ قومیّت پرست علماء نے مخالفت کا طوفان برپا کر دیا۔ وطن کے اشتراک پر ہندو اور مسلم کی متحدہ قومیّت کے جواز میں بزعمِ خویش "خدا اور رسولؐ کے ارشادات" پیش کئے جانے لگے۔ اس طائفہ کے سرخیل، مولانا حسین احمد مدنیؒ (مرحوم) نے برملا کہا کہ

اِس زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں

مولانا حسین احمد مدنیؒ

چونکہ یہ الفاظ ہندوستان کے سب سے بڑے دارالعلوم کے شیخ الحدیث کی زبان سے نکلے تھے اس لئے ان سے اقبالؒ کے دل پر چھری چل گئی۔ اس کے سینۂ پُرسوز سے بے ساختہ ایک چیخ نکلی جس نے ان زندۂ جاوید اشعار کی شکل اختیار کر لی کہ

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں، ورنہ ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است

سرود بر سرِ منبر کہ ملّت از وطن است چہ بے خبر ز مقامِ محمّدِ عربی است!

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

اگر باُو نہ رسیدی، تمام بولہبی است!

اس کے بعد مولانا مدنی کے جواب پر انہوں نے جو بیان شائع کیا وہ اس موضوع پر گویا حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں انہوں نے واضح الفاظ میں فرمایا کہ

"اگر بعض مسلمان اس فریب میں مبتلا ہیں کہ دین اور وطن بہ حیثیت ایک سیاسی تصوّر کے یکجا رہ سکتے ہیں، تو میں مسلمانوں کو بروقت انتباہ کرتا ہوں کہ اِس راہ کا آخری مرحلہ اوّل تو لادینی ہوگا[1] اور اگر لادینی نہیں تو اسلام کو محض ایک

---

[1] اقبالؒ کا یہ خدشہ کس قدر صحیح تھا، اِس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اخبار مدینہ (بجنور) کی ۱۷ اپریل ۱۹۶۳ء کی اشاعت میں اسرار احمد آزاد صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کی جلی سرخی یہ ہے کہ "یہ الزام غلط ہے کہ علمائے ہند اس ملک میں سلطنتِ اسلامیہ کے لئے کوشاں رہے"۔ اور نفسِ مضمون میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ دارالعلوم دیوبند سے تعلّق رکھنے والے علماء نے کم از کم اس صدی کے آغاز سے ہندوستان میں جمہوری اور سیکولر حکومت کے قیام کو اپنا دامع نصب العین قرار دے لیا تھا۔

اخلاقی نظریہ سمجھ کر اس کے اجتماعی نظام سے بے پروائی"

اور اس کا خاتمہ انہوں نے ان الفاظ پہ کیا کہ

"مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریز کی غلامی کے بند توڑنا اور اس کے اقتدار کو ختم کرنا ہمارا فرض ہے۔ لیکن اس آزادی سے ہمارا مقصد یہ نہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں، بلکہ ہمارا اوّل مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے اور مسلمان طاقتور بن جائے۔ اس لئے مسلمان کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار نہیں ہوسکتا جس کی بنیادیں انہی اصولوں پر ہوں، جن پہ انگریزی حکومت قائم ہے۔ ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل کو قائم کرنا چہ معنی دارد؟ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کلیتہً نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالاسلام بن جائے۔ لیکن اگر آزادیٔ ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ جیسا دارالکفر ہے ویسا ہی رہے یا اس سے بھی بدترین جائے تو مسلمان ایسی آزادیٔ وطن پر ہزار مرتبہ لعنت بھیجتا ہے۔ ایسی آزادی کی راہ میں لکھنا، بولنا، روپیہ صرف کرنا، لاٹھیاں کھانا، جیل جانا، گولی کا نشانہ بننا سب کچھ حرام اور قطعی حرام سمجھتا ہے۔"

حضرت علامہ اقبالؒ کو اس واقعہ سے اس قدر صدمہ پہنچا کہ وہ پھر بستر سے اُٹھ ہی نہ سکے اور اس کے تھوڑا ہی عرصہ بعد ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔ لیکن پاکستان کی بنیاد کی جو اینٹ سرسیّدؒ نے رکھی تھی وہ اسے اپنی عمر بھر کی محنتِ شاقہ سے اتنا اونچا لے گئے کہ اس پہ گویا چھت ڈالنا باقی رہ گیا۔ کتنے عظیم تھے پاکستان کے یہ معمار اور کتنا بڑا ہے ملّتِ اسلامیہ پر ان کا احسان۔

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے — سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

اقبالؒ کے بعد

مرتے وقت یہ شمع کس کے ہاتھ میں دینی ہے، علامہ اقبالؒ کی نگہِ حقیقت بین نے اس کا انتخاب بہت پہلے کر لیا تھا۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ اس ہجوم میں ایک مردِ راہ بیں ایسا ہے جس کے سپرد یہ امانت نہایت اطمینان اور وثوق سے کی جا سکتی ہے۔ یہ تھے مسٹر محمد علی جناحؒ بار ایٹ لا جنہیں ملّت کی متحدہ آواز نے قائدِ اعظمؒ کہہ کر پکارا اور انہوں نے اپنی بے لوث خدمت، بے پناہ محنت اور بلند ترین کیریکٹر سے ملّت کے اس اعتماد کو سچ کر دکھایا۔

سرسیّدؒ نے ۱۸۶۷ء میں بنارس کے کمشنر سے کہا تھا کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں اور دونوں دل سے کسی کام میں اشتراک نہیں کر سکتیں۔ اقبالؒ نے ۱۹۰۶ء میں کہہ دیا تھا کہ ——

"بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے" اور جناحؒ نے اب مسلمانوں کے لئے ایک الگ آزاد مملکت کی بنیاد اس دعویٰ پر رکھی کہ

قائدِ اعظمؒ "ہم دونوں فرقوں میں صرف مذہب کا فرق نہیں، ہمارا کلچر ایک دوسرے سے الگ ہے۔ ہمارا دین ہمیں ایک ضابطۂ حیات دیتا ہے جو زندگی کے ہر شعبہ میں ہماری راہ نمائی کرتا ہے ہم اس ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔" (ایڈورڈس کالج پشاور کی تقریر، ۲۷ نومبر ۱۹۴۵ء)

اس سے پہلے انہوں نے ۲۱ مارچ ۱۹۴۴ء کو پنجاب اسٹوڈنٹس فیڈریشن سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

"میں نہیں سمجھتا کہ کوئی دیانتدار آدمی اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ مسلمان بجائے خویش ہندوؤں سے الگ ایک مستقل قوم ہیں۔"

اس سے دو ہفتہ پہلے (۸ مارچ ۱۹۴۴ء کو) انہوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک اہم تقریر کی۔ اس میں سوال زیرِ نظر یہ تھا کہ پاکستان کے تصور سے مطلب کیا ہے؟ یہ یکایک سامنے کیسے آگیا۔ ان سوالات کے جواب میں قائدِ اعظمؒ نے دو فقرے کہے اور حقیقت یہ ہے کہ ان دو فقروں میں پاکستان کے مطالبہ کی ساری تاریخ سمٹا کر رکھ دی۔ آپ نے فرمایا:۔

پاکستان کب وجود میں آیا تھا؟ "پاکستان اس دن وجود میں آگیا تھا جب ہندوستان میں پہلا غیر مسلم مسلمان ہوا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے، جب یہاں مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی۔"

آپ نے غور کیا کہ کتنی عظیم حقیقت ہے جسے ان چند الفاظ میں سمو کر رکھ دیا ہے۔ جس دن پہلا غیر مسلم، مسلمان ہوا تھا اس دن ایک جداگانہ قوم وجود میں آگئی تھی اور یہی چیز مسلمانوں کی الگ مملکت کے مطالبہ کی بنیاد ہے۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ یہ الفاظ کس کی زبان سے نکل رہے تھے؟ اس مسٹر جناحؒ کی زبان سے جو ابھی کل تک بڑے فخر سے کہا کرتا تھا کہ

(I AM NATIONALIST FIRST, NATIONALIST SECOND, AND NATIONALIST LAST.)

قائدِ اعظمؒ مسلم قومیت کا اعلان پر اعلان کرتے جا رہے تھے اور اسلام کے علمبردار حضرات علمائے کرام چاروں طرف سے یورش کر کے ان کی مخالفت میں امڈے چلے آرہے تھے۔ ان کا مسلک یہ تھا کہ ہندو اور مسلمان دونوں مل کر محض ایک وطن کے باشندے ہونے کی بنیاد پر ایک قوم کے افراد ہیں اور یہ تصور باطل ہے کہ اسلام کو ایک زندہ حقیقت

علماء کی طرف سے مخالفت

بننے کے لئے آزاد خطّہ زمین کی ضرورت ہے جس میں حکومت قوانین خداوندی کے مطابق قائم ہو۔ وہ کہتے تھے کہ سیکولر انداز کی جمہوری حکومت جس میں غیر مسلم (ہندو) اکثریت قانون وضع کرے، عین مطابقِ اسلام ہے۔ بس اتنا ضروری ہے کہ مسلمانوں کا پرسنل لا (شخصی قانون) یعنی نکاح طلاق وغیرہ سے متعلق معاملات علمائے کرام کے ہاتھ میں رہیں۔ وہ تھا مسٹر جناحؒ کا دعویٰ اور یہ تھا علمائے کرام کا مسلک۔ آسمان کی آنکھ نے اس سے زیادہ تعجب انگیز اور تأسف خیز تماشا شاید ہی کہیں اور دیکھا ہو کہ ڈاڑھی مونچھ منڈا، سوٹ بوٹ میں ملبوس، مغرب کا تعلیم یافتہ مسٹر جناحؒ مسلمانوں سے یہ کہہ رہا ہو کہ

"اس حقیقت سے سوائے جہلا کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن مسلمانوں کا ضابطہ اخلاق ہے، جو مذہب، معاشرت، تجارت، عدالت، فوج، سول اور فوجداری کے تمام قوانین کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ مذہبی رسوم ہوں یا روزمرہ کی زندگی کے عام معاملات، روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی کا، اجتماعی واجبات کا مسئلہ ہو یا انفرادی حقوق کا، ان تمام معاملات کے لئے اس ضابطہ میں قوانین موجود ہیں۔ اسی لئے نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ ہر مسلمان کو قرآن کا نسخہ اپنے پاس رکھنا چاہیئے اور اس طرح اپنا مذہبی پیشوا آپ بن جانا چاہیئے۔" (۱۹۴۵ء میں عید کا پیغام)

مولانا آزاد مرحوم

اور اس کے برعکس، امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) مسلمانوں کو اس کانگریس میں شرکت کی دعوت دیتے تھے جس کی قیادت مہاتما گاندھی کے ہاتھ میں تھی۔ مہاتما گاندھی کے متعلق ان کا ارشاد تھا کہ

"وقت کی ساری پھیلی ہوئی اندھیاریوں میں انسانی فطرت کا ایک ہی روشن پہلو ہے جو مہاتما گاندھی کی عظیم روح کو تھکنے نہیں دیتا۔" (خطبۂ صدارت پرتاپ گڑھ کانگریس)

یہ اس شخص کے متعلق کہا جا رہا تھا جو بڑے فخر سے اعلان کرتا تھا کہ

"میں اپنے آپ کو سناتنی ہندو کہتا ہوں کیونکہ میں وید دل اور اپ نشد دل، پرانوں اور ہندوؤں کی تمام مذہبی کتابوں کو مانتا ہوں۔ اوتاروں کا قائل ہوں، تناسخ پر عقیدہ رکھتا ہوں۔ میں گئو رکھشا کو اپنے دھرم کا جزو سمجھتا ہوں اور بت پرستی سے انکار نہیں کرتا۔ میرے جسم کا رُواں رُواں ہندو

ہے۔ (بحوالہ خطبۂ صدارت قائدِ اعظم مسلم لیگ سیشن دہلی، اپریل ۱۹۴۳ء)

مسٹر جناح پہلے یہ سوال اٹھاتا ہے کہ

"وہ کونسا رشتہ ہے جس میں منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسدِ واحد کی طرح ہیں۔ وہ کونسی چٹان ہے جس پر ان کی ملّت کی عمارت استوار ہے۔ وہ کونسا لنگر ہے جس سے اس امّت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے۔"

اور پھر خود ہی ان سوالات کا جواب ان الفاظ میں دیتا ہے کہ

"وہ بندھن، وہ رشتہ، وہ چٹان، وہ لنگر، خدا کی عظیم کتاب قرآنِ کریم ہے۔ مجھے یقینِ کامل ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے، ہم میں زیادہ سے زیادہ وحدت پیدا ہوتی جائے گی۔ ایک خدا، ایک رسولؐ، ایک کتاب، ایک امّت۔ (لیگ سیشن کراچی ۱۹۴۳ء)

اس کے برعکس، مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) فرماتے ہیں کہ

"یہ تخیّل کہ مسلمان بربنائے مذہب ایک جداگانہ قوم ہیں اور ہندوستان میں دو الگ الگ قومیں آباد ہیں — ایک ہندو اور دوسری مسلمان، انگریزوں کا وضع کردہ ہے۔"

اور اس کے بعد وہ سینے کے پورے زور سے اعلان کرتے ہیں کہ

"میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں۔ میں ہندوستان کی ایک اور ناقابلِ تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں۔" (ایضاً)

دورِ الہلال کے ابوالکلام آزاد

یہ وہی ابوالکلام آزاد ہیں جو کسی زمانے میں کہا کرتے تھے کہ

انسان کی اجتماعی حیات اور قومیّت دراصل ان تمام عقائد و اعمال کے مجموعہ کا نام ہے جو نسل و وطن اور متوارث و متواصل علائقِ نسلی سے ترکیب پاتے ہیں۔ انبیائے کرامؑ کا مشن یہ ہوتا ہے کہ ان تمام نسلی اور قومی امتیازات کو مٹا کر ایک نئی روحانی امتیاز و خصوصیت کی بنیاد پر نئی قومیّت پیدا کریں۔"

آگے چل کر لکھا تھا:-

"یہ برادری خدا کی قائم کی ہوئی برادری ہے۔ ہر انسان جس نے کلمہ لاالٰہ الااللہ کا اقرار کیا مجبور اقرار

کے اس برادری میں شامل ہو گیا خواہ وہ مصری ہو، خواہ الجیریا کا وحشی ہو، خواہ قسطنطنیہ کا تعلیم یافتہ ترک، لیکن اگر وہ مسلم ہے تو اس ایک خاندانِ توحید کا عضو ہے، جس کا گھرانہ کسی خاص وطن اور مقام سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ تمام دنیا اس کا وطن اور تمام قومیں اس کی عزیز ہیں۔ دنیا کے تمام رشتے ٹوٹ سکتے ہیں لیکن یہ رشتہ کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ پس درحقیقت، اسلام کے نزدیک، وطن و مقام، رنگ و نسل، اور زبان کی تفریق کوئی چیز نہیں..... انسان کے تمام دنیوی رشتے خود انسان کے بنائے ہوئے ہیں۔ اصل رشتہ صرف ایک ہے اور وہ وہی ہے جو انسان کو اس کے خالق اور پروردگار سے متّصل کرتا ہے۔"

وہ ابوالکلام آزاد جو اپنے دورِ الہلال (۱۹۱۲-۱۶ء) میں یہ کہتا تھا، اب کیا کہہ رہا تھا، اسے برادرانِ عزیز! ذرا کلیجہ تھام کر سنیئے۔ مولانا آزاد اپنی کتاب میں جو ان کی زندگی کا آخری کارنامہ ہے (اور جو شائع ان کی وفات کے بعد ہوئی ہے) لکھتے ہیں:-

مولانا آزاد کے آخری الفاظ

"لوگوں سے یہ کہنا کہ زمین کے ایسے قطعوں میں جو جغرافیائی، لسانی اور ثقافتی لحاظ سے اس قدر مختلف ہوں، مذہبی یگانگت سے وحدت پیدا ہو سکتی ہے، بہت بڑا فریب ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اسلام نے ایک ایسی برادری کی تشکیل چاہی تھی جو نسلی، لسانی، معاشی اور سیاسی حدود سے بلند ہو کر وجود میں آئے، لیکن تاریخ سے یہ حقیقت ثابت ہے کہ ایک مختصر سے عرصے کے بعد جسے زیادہ سے زیادہ سو سال کا عرصہ کہیئے، اسلام اس قابل نہیں رہا تھا کہ وہ مختلف ملکوں کو دین کی بنیادوں پر ایک وحدت بنا سکے۔"

(INDIA WINS FREEDOM-P.227)

استغفر اللہ! استغفر اللہ۔ مولانا آزاد کا کہنا یہ ہے کہ اسلام نے دین کی بنیادوں پر قومیت کی تشکیل کی کوشش کی لیکن وہ تجربہ ناکام رہا۔ اور اب اسے دہرانا حماقت اور لوگوں کو اس کی طرف دعوت دینا بہت بڑا فریب ہے۔ یہ وہی آزاد ہیں جو مسلمانوں کو برسوں تک یہ دعوت دیتے رہے کہ

"یہ برادری خدا کی قائم کی ہوئی برادری ہے۔ دنیا کے تمام رشتے ٹوٹ سکتے ہیں مگر یہ رشتہ کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔"

سچ ہے انسانی عروج کی تو ایک انتہا ہوتی ہے لیکن جب وہ پستی کی طرف گرتا ہے تو اس کی کوئی انتہا ہی نہیں ہوتی۔ جن غیر مسلموں کے ساتھ مل کر متحدہ قومیت میں جذب ہو جانے پر اب مولانا فخر محسوس کیا کرتے تھے ان کے متعلق وہ

کبھی مسلمانوں سے یہ کہا کرتے تھے کہ

کفار سے ساز باز مت رکھو

"کفار کے عہد و پیمان کا تمہیں بارہا تجربہ ہو چکا ہے۔ وہ آبرو باختہ ہیں۔ عزتِ نفس و شرف کا انہیں لحاظ تک نہیں قسمیں کھاتے ہیں، حلف اٹھاتے ہیں کہ یہ وعدہ استوار ہے، اس میں دوام و استمرار ہے۔ یہ عہد محکم ہے۔ یہ قول مستقل قرار قانونی حیثیت رکھتا ہے۔ زبان سے سب کچھ کہتے ہیں مگر ہاتھ سے کام کرتے وقت کچھ یاد نہیں رکھتے۔ لہٰذا اُن سے مسلمانوں کو ساز باز نہیں رکھنی چاہیئے۔ ان سے لے تعلق ہونا لازم ہے۔"

(الہلال، ۲۸ اگست ۱۹۱۳ء)

بہرحال، وہ تھی مسٹر جناح کی دعوت اور یہ تھی ہمارے علمائے کرام کی حالت۔ ہم نے اس باب میں مولانا آزاد (مرحوم) کا ذکر خاص طور پر اس لئے کیا ہے کہ یہ قومیت پرست علما کے امام تھے۔ ورنہ باقی حضرات بھی مسلمانوں کی الگ مملکت کے مطالبہ کی مخالفت میں ان سے پیچھے نہیں تھے۔ لیکن یہ خدا کا بندہ تھا کہ مخالفتوں کے اس تمام طوفان میں روشنی کے مینار کی طرح اپنے مقام پر کھڑا تھا اور اپنے مبنی بر صداقت مطالبہ کی نور پاشیوں سے باطل کی تاریکیوں کو ہٹاتا اور مٹاتا چلا جا رہا تھا۔ اس کی مسلسل جدوجہد اور انتھک کوششوں کا نتیجہ تھا جسے اس نے ....

پاکستان کا پختہ تصور

(مارچ ۱۹۴۴ء میں) پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی سالانہ کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے ان الفاظ میں بیان کیا کہ

"پاکستان کے تصوّر کو جو، اب مسلمانوں کے لئے ایک عقیدہ کی حیثیت رکھتا ہے، مسلمانوں نے اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ ان کی حفاظت، نجات اور تقدیر کا راز اسی میں پوشیدہ ہے۔ اسی سے یہ آواز اقصائے عالم میں گونجے گی کہ دنیا میں ایک ایسی مملکت بھی ہے جو اسلام کی عظمتِ گزشتہ کو از سرِ نو زندہ کریگی۔"

پھر انہوں نے (۲۱ نومبر ۱۹۴۵ء کو) فرنٹیر مسلم لیگ پشاور کی کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے کہا:۔

"مسلمان، پاکستان کا مطالبہ اس لئے کرتے ہیں کہ وہ اس میں اپنے ضابطۂ حیات، ثقافتی نشو و نما، روایات اور اسلامی قوانین کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔"

جون ۱۹۴۵ء میں انہوں نے فرنٹیر مسلم اسٹوڈنٹس کے نام اپنے پیغام میں فرمایا کہ

"پاکستان سے مطلب یہ نہیں کہ ہم غیر ملکی حکومت سے آزادی چاہتے ہیں۔ اس سے حقیقی مراد مسلم آئیڈیالوجی ہے جس کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔ ہم نے صرف اپنی آزادی ہی حاصل نہیں کرنی، ہم نے اس قابل

بھی بننا ہے کہ ہم اس کی حفاظت کر سکیں، اور اسلامی تصوّرات اور اصولات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔"

مسٹر جناحؒ اپنی اس پکار کو برابر دُہراتے جا رہے تھے اور مولوی حضرات اسلامی حکومت کے اس مطالبہ کی مخالفت میں دن بدن تند و تیز ہوتے جا رہے تھے۔ ہم نے اس سے پہلے ان کی مخالفت کے جس گوشے کا ذکر کیا ہے اس کا تعلق نیشنلسٹ علماء اور اس مسلک کی داعی دیگر جماعتوں سے تھا، مثلاً جمعیت العلماء ہند، مجلسِ احرار، آزاد مسلمان، انصار، سرخپوش وغیرہ۔ لیکن ان کے علاوہ ایک گوشہ اور بھی تھا جس کی طرف سے

جماعتِ اسلامی

مخالفت کا انداز ہی نرالا تھا۔ یہ تھی جماعتِ اسلامی اور اس کے امیر سیّد ابوالاعلیٰ مودودی صاحب! یہ متحدہ قومیت کے بھی مخالف تھے، لیکن اس کے ساتھ مطالبۂ پاکستان کے بھی دشمن۔ اس عداوت میں یہ حضرات نیشنلسٹ علماء سے بھی دو قدم آگے تھے۔ آپ نے ان چند اقتباسات سے، جنہیں پہلے پیش کیا گیا ہے، دیکھ لیا ہوگا کہ علامہ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ نے کس طرح صاف، بیّن اور غیر مبہم الفاظ میں اس حقیقت کو واشگاف کیا ——— اور بہ تکرار و اصرار واشگاف کرتے چلے گئے کہ پاکستان سے مراد ایک ایسی اسلامی مملکت کا قیام ہے جس میں قوانینِ اسلامی کے مطابق حکومت قائم کی جائے گی۔ لیکن مودودی صاحب یہ کہہ کر مسلمانوں کو اس مطالبہ کی حمایت کرنے سے باز رکھنے کے جہادِ عظیم میں مصروف تھے کہ

غلط بیانی

"مسلم لیگ کے کسی ریزولیوشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمحِ نظر پاکستان میں اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنا ہے۔"

(سیاسی کشمکش، حصّہ سوم، مطبوعہ ترجمان القرآن، محرّم ۱۳۶۰ھ ص۲۷ فٹ نوٹ)

آپ نے غور فرمایا کہ ان تمام اعلانات اور بیانات کی موجودگی میں جو مسلم لیگ کے دوسرے درجہ کے لیڈر تو ایک طرف، خود علّامہ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ کی طرف سے شائع ہوئے تھے اور ہوتے چلے جا رہے تھے، یہ کہنا کہ ان میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ ان کا آخری مطمحِ نظر پاکستان میں اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنا ہے، کس قدر دیدہ دلیری ہے۔

اور آگے بڑھیے۔ ان کی مخالفت کی آگ اسی سے ٹھنڈی نہیں ہوئی۔ انہوں نے اس کی وضاحت

کرتے ہوئے کہا کہ

" جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور

مسلمانوں کی کافرانہ حکومت

یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومتِ الٰہی قائم ہو جائے گی' ان کا گمان غلط ہے۔ دراصل اس کے نتیجہ میں جو کچھ حاصل ہو گا' وہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہو گی۔" (ایضاً صفحہ ۲۹)

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس وقت ہندو اور انگریز سے جنگ اس بات پر ہو رہی ہے کہ مسلمانوں کے لئے ایک الگ خطۂ زمین حاصل کیا جائے جس میں یہ آزاد حکومت قائم کر سکیں۔ جب یہ خطۂ زمین حاصل ہو جائے گا تو اس میں مسلمانوں کو یہ اختیار و اقتدار حاصل ہو گا کہ وہ اسلامی حکومت قائم کر لیں۔ اگر آزاد خطۂ زمین ہی نہ ملا تو اسلامی حکومت کے قیام کا سوال ہی پیدا نہیں ہو گا۔ اس کے جواب میں مودودی صاحب فرماتے:

ناممکن ہے

" بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ایک دفعہ غیر اسلامی طرز ہی کا سہی، مسلمانوں کا قومی اسٹیٹ تو قائم ہو جائے پھر رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعہ اس کو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ مگر میں نے تاریخ' سیاسیات اور اجتماعیات کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے' اس کی بنا پر میں اس کو ناممکن العمل سمجھتا ہوں اور اگر یہ کامیاب ہو جائے تو میں اس کو ایک معجزہ سمجھوں گا۔" (ایضاً صفحہ ۶)

واضح رہے کہ اب وہی مودودی صاحب، پاکستان کے خطۂ زمین میں اپنے تصور کے مطابق اسلامی اسٹیٹ قائم کرنے کے لئے ہر ممکن حربہ استعمال کر رہے ہیں اور اس اسلامی اسٹیٹ کی بنیاد، اس جمہوری نظام کو قرار دے رہے ہیں جس کے متعلق انہوں نے فرمایا تھا کہ اس کے نتیجہ میں جو حکومت قائم ہو گی وہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہو گی۔ چنیں و ودہ آسمان کم دیدہ باشد۔

یہ سب قرآن سے بے بہرہ ہیں

یہ تو رہی ان کی مخالفت مطالبۂ پاکستان کی۔ اب یہ سنئے کہ یہ صاحب، اس مطالبہ کو پیش کرنے والوں کے متعلق کیا فرماتے تھے۔ وہ سیاسی کشمکش حصہ سوم میں لکھتے ہیں:۔

" افسوس کہ لیگ کے قائد اعظم سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرزِ فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطۂ نظر سے پرکھتا ہو۔" (مطبوعہ ترجمان القرآن ' ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ صفحہ ۱۴۱۔۱۴۴)

دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:۔

"ان کے خیالات، نظریات اور طرزِ سیاست اور رنگِ قیادت میں خوردبین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی چھینٹ نہیں دیکھی جا سکتی۔ ان کا یہ حال ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے مسائل سے لے کر بڑے سے بڑے مسائل تک کسی معاملہ میں بھی انہیں قرآن کا نقطۂ نظر نہ تو معلوم ہی ہے اور نہ ہی اسے تلاش کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ انہیں نورِ ہدایت صرف مغربی قوانین و دساتیر ہی میں ملتا ہے۔

(ایضاً، صفحہ ۴۷)

آپ کو معلوم ہے کہ یہ کس شخص کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ اُسے چھوٹے سے چھوٹے مسائل تک میں بھی قرآن کا نقطۂ نظر معلوم نہیں! اس شخص (قائدِ اعظمؒ) کے متعلق جس کی قرآنِ کریم کے حقائق پر غائر نگہی کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے کہ جب وہ اگست ۱۹۴۱ء میں حیدر آباد (دکن) گئے تو عثمانیہ یونیورسٹی کے طالب علموں نے ان سے کچھ سوالات پوچھے۔ سنیئے کہ سوالات اور ان کے جوابات کیا تھے؟

قائدِ اعظمؒ کی قرآنی بصیرت

(یہ اقتباس، "قائدِ اعظمؒ اور اسلامک آئیڈیالوجی" کے زیرِ عنوان تقریر میں پہلے دیا جا چکا ہے، وہاں دیکھ لیا جائے۔ صفحہ ۵۶ پر)

یہ تھا مخالفتوں کا وہ ہجوم جس میں یہ نحیف و نزار سامردِ مجاہد، قوم سے ایک پیسہ لئے بغیر پاکستان کی چومکھی لڑائی تنہا لڑ رہا تھا اور اس کی مخالفت کی یہ کیفیت تھی کہ یہ لوگ سنجیدگی اور متانت کو بالائے طاق رکھ کر، بازاریت کی پست ترین سطح پر اُتر آئے تھے۔ اس سطح پر اُن کے طنز و استہزاء کی کیفیت کیا ہوتی تھی، اس کا اندازہ، جماعتِ اسلامی کے ایک رکنِ رکین ــــ نصر اللہ خاں صاحب عزیز (جو آج کل ایشیاء کے مدیر ہیں) کے ایک صحافتی شاہکار سے لگائیے جو ان کے اخبار "کوثر" کی ۱۲ جنوری ۱۹۴۷ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ اس کا عنوان تھا

استہزاء

ضرورت ہے ایک ہٹلر اور مسولینی کی

اور اس عنوان کے نیچے لکھا تھا:۔

"اس زمانہ میں ہٹلر نے جرمنی میں اور مسولینی نے اٹلی میں ظہور کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنی قوموں کو انہوں نے اپنی زمینِ پستی سے اٹھا کر آسمانِ رفعت پر بٹھا دیا۔ مسلمانوں نے دوسروں کو اس طرح کرتے دیکھا تو

انہوں نے بھی اپنے اشتہار کی عبارت بدل ڈالی۔ اب ان کے اخبارِ خیال کے صفحات پر یہ مضمون نظر افروز تھا ـــــ "ضرورت ہے ایک ہٹلر اور مسولینی کی" ـــــ بالآخر ان کی اشتہار بازی کامیاب ہوئی۔ اشتہار بازی کا اصول یہ ہے کہ اشتہار دیئے جاؤ، کسی نہ کسی روز تو گاہک پیدا ہوں گے۔ مہدی علیہ السّلام سے لے کر مسولینی تک کی ضرورت کا جو اشتہار مسلسل ان کے جریدۂ خیال میں نکل رہا تھا، آخرِ کار نتیجہ خیز ہوا اور مسٹر جناحؒ نے اپنی درخواست قوم کے حضور میں گزران دی۔ قوم نے باقی سب امیدوارانِ قیادت کو برخاست کر دیا اور مسٹر جناحؒ کو اپنا لیڈر تسلیم کر لیا اور قائدِ اعظمؒ زندہ باد کے نعروں سے فضائے ہند معمور ہو گئی۔ (بحوالہ جماعتِ اسلامی پر ایک نظر ص۳۶)

یہ جنوری ۱۹۴۷ء کی بات ہے۔ قائدِ اعظمؒ طنز و استہزا اور تحقیر و تذلیل کے ان تیروں کو بھی اپنے سینے پر لیتے اور انتہائی ضبط و استقلال سے اپنے دل میں سمو لیتے تھے۔ انہیں اس کی فرصت ہی کہاں تھی کہ وہ ان خار دار ... جھاڑیوں میں اپنا دامن الجھائیں۔ وہ جس کے دامن پر اسلامیت کی کوئی چھینٹ بھی نظر نہیں آتی تھی، ان سرتابقدم "اسلامی پیکروں" سے بہت اونچا تھا۔ وہ اپنی دُھن میں مستانہ وار آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ جوں جوں اسے منزل قریب نظر آ رہی تھی، اس کے ذوقِ سفر میں اور تیزی اور تازگی پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اسی جذب و انہماک سے اپنے بے سروسامان قافلہ کو لئے آگے بڑھتا گیا۔ تا آنکہ اگست ۱۹۴۷ء میں منزل نے خود آگے بڑھ کر اس کے قدم چومے اور اس نے انگریز، ہندو اور خود مسلمانوں کے مزعومہ علمبردارانِ اسلام و شریعت کی مسلسل مخالفت کے علی الرغم، اپنے کارواں کو سرزمینِ پاکستان میں آن اتارا۔ اور اس طرح جس عمارت کی پہلی اینٹ، سرسیّد کی نگہ دُوربیں نے رکھی تھی اور جس کی دیواریں اقبالؒ کی قرآنی فکر نے اوپر اٹھائی تھیں، وہ قائدِ اعظمؒ کی بصیرت و کردار کے صدقے تکمیل تک پہنچ گئی۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

پاکستان بن گیا

یہ مرتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا!

قائدِ اعظمؒ نے شروع ہی میں کہہ دیا تھا کہ ایک خطۂ زمین کا حصول، ہمارے لئے مقصود بالذّات نہیں۔ یہ ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اور وہ مقصد ہے اس خطۂ زمین میں صحیح اسلامی مملکت کا قیام۔ چنانچہ انہوں نے اس خطۂ زمین پر قدم رکھنے کے بعد اپنے رفقاء کو وضاحت سے سمجھا دیا کہ وہ کہیں اسی کو مقصود و منتہا سمجھ کر آرام سے نہ بیٹھ جائیں۔ چنانچہ انہوں نے اکتوبر ۱۹۴۷ء میں (خالق دینا ہال۔ کراچی میں) عمائد

حکومت سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

یہ خطۂ زمین مقصود بالذّات نہیں

"پاکستان کا قیام جس کے لئے ہم گذشتہ دس سال سے مسلسل کوشش کر رہے تھے، اب خدا کے فضل سے ایک حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آچکا ہے۔ لیکن ہمارے لئے اس آزاد مملکت کا قیام مقصود بالذّات نہیں تھا، بلکہ ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہمیں ایک ایسی مملکت مل جائے جس میں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں اور جس میں ہم اپنی روشنی اور ثقافت کے مطابق نشوونما پاسکیں اور جہاں اسلام کے عدلِ عمرانی کے اصول آزادانہ طور پر رُو بہ عمل لائے جا سکیں۔"

اسلام کا عدلِ عمرانی

اِسلام کے عدلِ عمرانی کے وہ اصول کیا ہیں جنہیں بروئے کار لانے کے لئے قائدِاعظمؒ کے الفاظ میں اس مملکت کو حاصل کیا گیا تھا، اس کا جواب صاف اور واضح ہے۔ اسلامی نظام کا منتہیٰ یہ ہے کہ ہر فرد کی تمام مضمر صلاحیتوں کی نشوونما اس طرح ہو جائے کہ وہ اس دنیا میں اور اس کے بعد کی زندگی میں اپنی ارتقائی منازل طے کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا جائے۔ اس مقصد کے لئے وہ سب سے پہلے افرادِ مملکت کو ان کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کی طرف سے بے فکر کر دیتا ہے تاکہ وہ اطمینان سے بلند مقاصدِ زندگی کے لئے جدّوجہد کر سکیں۔ وہ تمام افراد کو اس امر کی ضمانت دیتا ہے کہ "ہم خدا کی طرف سے تمہاری اور تمہاری اولاد کی ضروریاتِ زندگی کی ذمّہ داری لیتے ہیں"۔ اس کا نام اسلام کا عدلِ عمرانی ہے۔ اس کی وضاحت علّامہ اقبالؒ اور قائدِاعظمؒ نے جن الفاظ میں کی تھی، ان کا تفصیلی تذکرہ سابقہ تقریر میں کیا جا چکا ہے۔ وہاں دیکھ لیا جائے۔ قائدِاعظمؒ پاکستان میں اسلامی نظامِ زندگی متشکل کرنے کی تدابیر پر غور و فکر میں مصروف اور منہمک تھے کہ دیکھنے والے کیا دیکھتے ہیں کہ وہی لوگ جو مسلسل دس برس تک، مطالبۂ پاکستان کی اس شدّت سے مخالفت کرتے رہے تھے، فوج در فوج پاکستان کی طرف اُمنڈے چلے آرہے ہیں۔ چشمِ عبرت حیران تھی کہ یہ حضرات اب کس منہ سے ادھر آرہے ہیں۔ خود قائدِاعظمؒ بھی تعجّب انگیز نگاہوں سے اس ریلے کو دیکھ رہے تھے۔

مخالفینِ پاکستان، پاکستان کی طرف

وہ انہیں دیکھ رہے تھے اور ان کے ساتھ ہی ان کی مخالفت کی آگ، ان کی دشنام طرازیوں کی بوچھاڑ، ان کے طنز اور استہزاء کے تیروں کی بارش، ایک ایک کر کے پردۂ سیمین کی طرح ان کی نگاہوں کے سامنے آرہی تھی۔ دنیا منتظر تھی کہ اب دیکھیں قائدِاعظمؒ کی طرف سے ان کے تیر دستان

کا کیا جواب ملتا ہے۔ وہ پاکستان کے گورنر جنرل تھے۔ وہ جس پر چاہتے یہاں کا دروازہ بند کر سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے ایک بلند سیرت انسان کی طرح دل کی پوری کشادہ سے کام لیا اور جس طرح نبیٔ اکرمؐ نے مخالفینِ مکّہ سے، جو فتحِ مکّہ کے بعد پابجولاں سامنے کھڑے تھے، فرمایا تھا، ہاتھ کی پوری جنبش سے کہہ دیا کہ

لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ۔ (۱۲/۹۲)

وُسعتِ ظرف

آج تم پر کوئی مواخذہ نہیں مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا۔ (۳/۹۶) جو یہاں آئے گا، اسے امن حاصل ہو گا۔

انہوں نے اس وسعتِ ظرف کا ثبوت دیا، اگرچہ بعض کہنے والوں نے یہ بھی کہا کہ ان کی یہ کشادہ دلی پاکستان کے حق میں اچھی ثابت نہیں ہو گی۔ جو لوگ ابھی واہگہ سے اُس پار تک، پاکستان اور بانیٔ پاکستان کو مسلسل گالیاں دے رہے تھے، وہ اس حد کو پار کرنے کے ساتھ کس طرح پاکستان کے بہی خواہ ہو سکتے ہیں۔ ایسا کہنے والوں کے سامنے قرآنِ کریم کا وہ فیصلہ بھی تھا جو اس نے ان اعراب (قبائلی بدوؤں) کے سلسلے میں دیا تھا، جو عمر بھر اسلامی نظام کی مخالفت کرتے رہے تھے، لیکن جب اسلام کا غلبہ ہو گیا تو وہ اس کے سامنے جھکنے پر مجبور ہو گئے اور اپنا شمار مومنین کی صف میں کرنے لگے۔ اس پر قرآن نے کہا تھا کہ

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ۭ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ...... (۴۹/۱۴)

یہ اعراب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ تم ایمان نہیں لائے۔ تم صرف غلبۂ اسلام کے سامنے جھک گئے ہو۔ ایمان تمہارے دلوں کے اندر داخل نہیں ہوا۔

بعد کے واقعات نے بتا دیا ——— اور اب تک بتاتے چلے آ رہے ہیں کہ جنہوں نے مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کی تھی ان کے دل میں فی الواقعہ پاکستان کی محبت جاگزیں نہیں ہوئی۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ

کافر نتوانی شد، ناچار مسلماں شو

یہاں رہنے میں انہیں اپنے مفاد نظر آتے ہیں، اس لئے وہ پاکستانی ہیں۔ اس کے خلاف انتقام کی چنگاریاں اب بھی ان کے سینوں میں سلگ رہی ہیں۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُھُمْ اَكْبَرُ ۭ (۳/۱۱۸) اس بغض و عداوت کے مظاہرے کبھی کبھی ان کی زبان سے ہو جاتے ہیں لیکن جو کچھ ان کے دلوں میں چھپا ہے وہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ قائدِ اعظمؒ کو مقدسین کے اس طائفہ کے عزائم کا علم و احساس تھا، اس لئے انہوں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ مستقبل میں ان کی آئینی پوزیشن کیا ہونی چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے فروری ۱۹۴۸ء میں اہلِ امریکہ کے نام ایک پیغام براڈ کاسٹ کیا جس میں واضح الفاظ میں بتادیا کہ پاکستان میں تھیاکریسی کبھی قائم نہیں ہوگی۔

(اصل اقتباس سابقہ تقریر میں دیا جاچکا ہے وہاں دیکھ لیا جائے —— صفحہ پر)

لیکن قوم کی بدقسمتی (اور ان حضرات کی خوش بختی) کہ قائدِ اعظمؒ، آئینِ پاکستان کے مرتب کرنے سے پہلے ہی دنیا سے چلے گئے اور ان کے بعد کوئی ایسا نہ رہا جو انہیں ان کی حدود کے اندر رکھتا۔ چنانچہ یہ کھل کر میدان میں آگئے۔ آپ کو یاد ہے کہ مودودی صاحب نے تحریکِ پاکستان کے دوران میں کہا تھا کہ

"مسلم لیگ کے کسی ریزولیوشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریر میں یہ بات آج تک واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمحِ نظر، پاکستان میں اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنا ہے۔"

اب انہی مودودی صاحب نے پاکستان کے عوام سے کہنا شروع کردیا کہ

جھٹ بدل گئے

"میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ قیامِ پاکستان کی جدوجہد میں جو کچھ آپ کو سمجھایا گیا تھا وہ یہ تھا کہ پاکستان سے مقصود ایک ایسی حکومت کا قائم کرنا ہے جس کا نظام خدا کی پاک کتاب اور اس کے رسول محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی سنّت پر مبنی ہو اور تمام مسلمان اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرسکیں۔ لیڈروں کے ذہن میں خواہ کچھ بھی ہو کم از کم زبانوں سے انہوں نے ہر اسٹیج اور ہر منبر پر کھڑے ہوکر یہی کہا تھا اور عام مسلمانوں نے ان کے انہی وعدوں اور ان کے ظاہر کردہ انہی ارادوں پر یقین کرکے پاکستان کی تحریک میں ان کا ساتھ دیا تھا۔" (دستوری سفارشات پر تنقید صک)

یہ بھی آپ نے دیکھ لیا ہے کہ یہ حضرات یوم تشکیلِ پاکستان تک، پاکستان کے مطالبہ کی مخالفت میں کس طرح ایڑی چوٹی تک کا زور لگاتے رہے۔ لیکن اب بلا جھجک یہ کہنا شروع کردیا کہ

ہم نے پاکستان حاصل کیا

"ہم نے مسلمانوں کے قومی تحفظ کی کوشش کی تو اس لئے نہیں کہ دوسری قوموں کی طرح اس قوم کا بھی امتیازی وجود قائم رہے، بلکہ صرف اس لئے کہ یہ قوم دنیا میں حق کی شہادت ادا کرنے کے لئے زندہ رہے ہم نے ایک آزاد مملکت کا قیام چاہا تو اس غرض سے نہیں کہ روئے زمین پر ایک اور ترکی یا

ایک اور مصر یا ایران کا اضافہ ہو جائے بلکہ صرف اس غرض سے کہ ایک خالص اسلامی ریاست قائم ہو جو اسلامی نظام کا مکمل نمونہ دنیا کے سامنے پیش کرے۔"

(ترجمان القرآن ' اکتوبر ۱۹۵۰ء)

مسلمان باقی رہیں یا نہ رہیں

آپ کو معلوم ہے کہ مسلمانوں کے یہ مربی و محسن، جو یہ کہہ رہے ہیں کہ "ہم نے مسلمانوں کے قومی تحفظ کے لئے اس قدر کوشش کی تھی" کون بزرگوار ہیں! یہ وہی حضرت ہیں جو تحریکِ پاکستان کے دوران میں اعلانیہ کہہ رہے تھے کہ
"اگر ہندوستان کے مسلمانوں نے دین سے بے بہرہ لوگوں کی قیادت میں ایک بے دین قوم کی حیثیت سے اپنا علیحدہ وجود برقرار رکھا بھی (جیسا کہ ترکی اور ایران میں برقرار رکھے ہوئے ہیں) تو ان کے اس طرح زندہ رہنے میں اور کسی غیر مسلم قومیت کے اندر فنا ہو جانے میں آخر فرق ہی کیا ہے؟"

(سیاسی کش مکش بابت ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ۔ ص۲۱۵ مطبوعہ ترجمان القرآن)

یہ ہیں وہ جو آج دعویٰ کر رہے ہیں کہ ہم نے مسلمانوں کے قومی وجود کا تحفظ کیا تھا! باقی رہا ان کا یہ دعویٰ کہ انہوں نے ایک آزاد مملکت کا قیام چاہا تو اس کے متعلق اس سے زیادہ کیا کہا جائے کہ

چہ دلاور است دُزدے کہ بکف چراغ دارد

ان احسانات کا صلہ

اور آپ کو معلوم ہے کہ یہ حضرات اپنے احسانات کا بدلہ قوم سے کیا مانگتے ہیں؟ یہ کہ پاکستان کا اقتدار ان کے سپرد کر دو، تاکہ یہ اس میں اپنی مرضی کے مطابق "اسلامی نظام" قائم کر سکیں۔ اس "اسلامی نظام" میں قوم کا حشر کیا ہوگا' یہ بھی سننے چاہیئے۔ مودودی صاحب اپنے رسالہ "مرتد کی سزا" ص۸۰ میں لکھتے ہیں۔

چنگیزی اسلام

جس علاقہ میں اسلامی انقلاب رونما ہو، وہاں کی مسلمان آبادی کو نوٹس دے دیا جائے کہ جو لوگ اسلام سے اعتقاداً وعملاً منحرف ہو چکے ہیں اور منحرف رہنا چاہتے ہیں' وہ تاریخِ اعلان سے ایک سال کے اندر اندر اپنے غیر مسلم ہونے کا باقاعدہ اظہار کر کے ہمارے نظامِ اجتماعی سے باہر نکل جائیں۔ اس مدت کے بعد ان کو جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہوئے ہیں، مسلمان سمجھا جائے گا۔ تمام قوانینِ اسلامی ان پر نافذ کئے جائیں گے۔ فرائض و واجباتِ دینی کے التزام پر انہیں مجبور کیا جائے گا۔

اور پھر جو کوئی دائرۂ اسلام سے باہر قدم رکھے گا اسے قتل کر دیا جائے گا۔"

اور ظاہر ہے کہ اس بات کا فیصلہ کہ فلاں شخص نے دائرۂ اسلام سے قدم باہر رکھ دیا ہے، یہی حضرات کریں گے!

یہ ہے برادرانِ عزیز! وہ پاکستان جو سرسیدؒ کے اخلاص و جہاد، اقبالؒ کی آہِ سحرگاہی و نالۂ نیم شبی اور جناحؒ کی بصیرت و کردار سے قریب اسّی سال کی محنتِ شاقہ سے تعمیر ہوا اور یہ ہیں وہ لوگ جو آج اس کے دعویدار ہیں ـــــ وہ لوگ جو قوم کے اُن غمگساروں اور محسنوں کو کافر بناتے اور گالیاں دیتے رہے اور جنہوں نے پاکستان کی مخالفت میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ کس قدر دُور رس تھی نگاہ اس مردِ قلندر کی جب اس نے کہا تھا کہ

زاغوں کے تصرف میں ہے شاہیں کا نشیمن

مایوسی کی کوئی بات نہیں

لیکن اس میں عزیزانِ من! گھبرانے کی کوئی بات نہیں مشیّت کے جس پروگرام نے سرسیدؒ، اقبالؒ اور جناحؒ جیسی شخصیتوں کو ایک دوسرے کے تسلسل میں پیدا کر دیا تاکہ وہ اس قوم کو جسے اغیار کی ریشہ دوانیاں اور اپنوں کی غداریاں مٹا دینے یا شودر بنا دینے کا تہیّہ کر چکی تھیں، ایک عظیم مملکت کا وارث بنا دے۔ وہی پروگرام اب یہ انتظام بھی کرے گا کہ یہ متاعِ ملّی ہر رہزن کی دستبرد سے محفوظ رہے۔ اب پھر ایک سیمرغ پیدا ہو گا جو اپنی شعلہ نوائی سے، اس نشیدِ جانفزا کو فضائے کائنات میں عام کر دے گا کہ باطل کی قوتیں سرنگوں ہوں گی اور اس خطۂ پاک میں ایک بار پھر وہی قرآنی نظام جلوہ بار ہو گا جو چودہ سو سال پہلے، سرزمینِ حجاز میں وجہ بالیدگی شرفِ انسانیت ہوا تھا اور جس نے ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ داری کی ہر اس زنجیر کو توڑ کر رکھ دیا تھا جس میں نوعِ انسان صدیوں سے جکڑی چلی آ رہی تھی۔ سرسیدؒ، اقبالؒ اور جناحؒ کی بے صوت صدائیں پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ ایسا ہو کر رہے گا۔

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائیگی

پھر دلوں کو یاد آ جائیگا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائیگی!

شب گریزاں ہوگی، آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے!

ولو کرہ المشرکون۔

اس وقت کرنے کا کام یہ ہے کہ اس خطّۂ زمین کو ہر خطرہ سے محفوظ رکھنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی جائے۔ اس لئے کہ اگر (خدانہ کردہ) یہ خطّۂ زمین ہی نہ رہا تو اسلامی مملکت قائم کہاں ہوگی اور اس کے ساتھ ساتھ اس مقصد کو عام کیا جائے جس کے لئے یہ خطّۂ زمین حاصل کیا گیا تھا۔ جس قدر یہ خیال عام ہوگا اسی قدر اس مقصد کے حصول کے امکانات زیادہ روشن ہوں گے۔

والسلام

سنہ ۱۹۶۳ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جنگ اور انسان

(طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۶۳ء)

جیسا کہ میں نے ایک دفعہ اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا[1]۔

انسان بھی ایک طُرفہ تماشا ہے

اِسے عبادت گاہوں میں محوِ نیاز دیکھو تو آسمان کے فرشتے اس کے ذوقِ عبودیت پر نثار اور جنّت کی حوریں اس کی جُھکی ہوئی پیشانی پر تصدّق ہوتی ہیں۔ اس کا ایک ایک سجدہ، زمین اور آسمان کو وجد میں لاتا اور فضائے کائنات میں تھرتھری پیدا کر دیتا ہے۔

اور اگر اسے محبت کے حریمِ ناز میں سر بزانو دیکھو تو کسی کی یاد میں اس کے ڈھلکتے ہوئے آنسوؤں کو چاند اپنے بلوریں کٹورے میں بھر لیتا ہے کہ وہ شب کی تاریکیوں میں شمع کافوری کا کام دیں، آفتاب، اس کے دِل کی تپش و خلش سے حرارت مستعار لیتا ہے کہ وہ اس سے نبضِ ہستی میں تموّج پیدا کر دے۔ کائنات کا ذرّہ ذرّہ اس کے سوز و گداز سے، اپنے اندر نئی زندگی محسوس کرتا ہے۔

اور اگر اسے حیرت خانہ علوم و فنون میں سرگرمِ تحقیق دیکھو تو اس کا فکرِ فلک پیما، زمین کی پستیوں سے لیکر

---

[1] یہ مضمون فردوسِ گم گشتہ میں شائع ہو چکا ہے۔

آسمان کی بلندیوں تک کے راز فاش کرتا اور مہر و ماہ دستاروں پر کمندیں ڈالتا ہے۔ وہ زہر سے تریاق بناتا اور پتھر کو آئینے میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اس کی اختراعاتِ جمیلہ، تہذیب و تمدّن کے قصرِ رنگیں ہیں، نور و نگہت کی ندیاں رواں کر دیتی ہیں۔

لیکن ———— یہی انسان جب نشۂ قوّت سے بدمست اور ہوسِ خوں آشامی سے مدہوش ہو کر اپنے ہی جیسے انسانوں کے خلاف بپھرے ہوئے سیلاب کی طرح اُمڈتا ہے تو عبودیّت کا عجز و نیاز، محبت کا سوز و گداز اور علم و حکمت کا ساز و براق، سب اس کے سامنے خس و خاشاک کی طرح بہے چلے جاتے ہیں۔ یہ خود اپنے ہاتھوں کے تعمیر کردہ قصرِ تہذیب و تمدّن کو راکھ کا ڈھیر بنا دیتا ہے۔ آبادیاں ویرانوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں اور انسان کا خون پانی سے بھی زیادہ ارزاں ہو جاتا ہے۔

اس کی ساری تاریخ، اسی خوں ریزی اور آتش باری کی ہولناک داستان ہے۔ یہ جوں جوں علم و عقل میں آگے بڑھتا جاتا ہے، اس کی تباہ کاریوں کی وسعت حدود فراموش ہوتی چلی جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ جب

خوں ریزی کی وسعتیں

دارائے یونان کی طرف لشکر کشائی کی تو اس کے ساتھ صرف دس ہزار فوج تھی۔ جب اسکندر نے ایشیا کی طرف رُخ کیا تو اس کے جلو میں تیس ہزار کا لشکر تھا۔ جب نپولین نے روس پر حملہ کیا تو پانچ لاکھ فوج اس کے زیرِ کمان تھی۔ دوسری جنگِ عظیم میں، صرف مقتولین اور زخمیوں کی تعداد ایک کروڑ سے زائد تھی اور کہا جا رہا ہے کہ اگر اب کے جنگ چھڑی، تو ایک بم پورے کے پورے کرّۂ ارض کو بھک سے اڑا دے گا۔ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَ الْاِكْرَامِ (۵۵/۲۷) صرف خدا کی ذات باقی رہ جائے گی۔

یہ تو انسان کی سیاسی دنیا کی داستانِ خونریز تھی۔ اس کی فکری دنیا کی طرف آیئے تو وہاں بھی یہ عجیب مجموعۂ تضاد دکھائی دے گا۔ اگر ایک طرف اس نے یہ فلسفہ وضع کیا کہ ایک چیونٹی کا مارنا بھی مہا پاپ (گناہِ عظیم) ہے۔ اور انسان کو منہ پر کپڑا باندھے رکھنا چاہیئے تاکہ جراثیم، سانس کے ذریعہ اندر جا کر ہلاک نہ ہو جائیں اور اس طرح انسان، جیو ہتیا کے جرم کا مرتکب نہ ہو جائے، تو دوسری طرف ہم نیٹشے کے الفاظ میں یہ سنتے ہیں کہ

(MEN SHOULD BE EDUCATED FOR WAR AND WOMEN FOR THE REACTION OF THE WARRIORS: EVERYTHING ELSE IS FOLLY)

مردوں کو سپہ گری کی تعلیم دینی چاہیئے اور عورتوں کا مقصدِ زندگی، ان سپاہیوں کی تفریح کا سامان بننا۔ اس

کے سوا جو کچھ ہے سب بکواس ہے۔ مسولینی کا قول تھا کہ جنگ بالکل اخلاقی چیز ہے۔ ہٹلر کہا کرتا تھا کہ اب ایک نئی دنیا وجود میں آچکی ہے جس میں جنگ ایک بنیادی اصول کی حیثیت رکھتی ہے۔ جنگ ہر شے کے ماپنے کا معیار ہے اور قانون وہی ہے جسے ایک سپاہی وضع کرے۔ فرد اور معاشرے کے صرف وہی کام قابلِ ستائش قرار پا سکتے ہیں جو جنگ کی تیاری میں مدد دیں۔

(HEINRICH HAUSER) کا قول ہے کہ

"ہمیں چاہیئے کہ ان تمام اداروں کو توڑ ڈالیں جو انسان کو امن اور حفاظت کی ضمانت دیتے ہیں۔ زندگی اسی وقت محکم اور سادہ ہو سکے گی جسے بربریت کا عہد کہا جاتا ہے۔"

سوال یہ ہے کہ اس افراط و تفریط میں، قرآن، کیا فلسفہ اور مسلک پیش کرتا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ دنیا میں بالعموم ہر شخص امن اور سلامتی چاہتا ہے۔ جو لوگ اس سلسلہ میں کوئی نمایاں

اَمن و سلامتی کا دین

کام کرتے ہیں، دنیا کی ہر قوم انہیں واجب العزت سمجھتی اور ان کے مجسّمے کھڑے کرتی ہے۔ ہر سال کسی نہ کسی کو امن (PEACE) کا نوبل پرائز دیا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے خدا کی ایک صفت اَلسَّلَامُ اور دوسری اَلْمُؤْمِنُ بتائی ہے۔ اَلسَّلَامُ کے معنی ہیں وہ ذات جس سے ہر شے سلامتی حاصل کرے۔ اور اَلْمُؤْمِنُ کے معنی ہیں امن کی ضمانت دینے والا جس پر بھروسہ کرکے امن اور اطمینان حاصل ہو جائے۔ خود اس نظامِ زندگی کا نام .... جسے قرآن پیش کرتا ہے، اسلام ہے اور جن لوگوں کے ہاتھوں سلامتی کا یہ نظام متشکل ہوتا ہے، انہیں مؤمن کہہ کر پکارتا ہے۔ وہ اُس ضابطۂ حیات (قرآن) کے متعلق، جو اس نظام کا آئین و دستور ہے، کہتا ہے کہ يَّهْدِىْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ (5/16) اس کے ذریعے خدا، سلامتی کی راہیں کشادہ کرتا ہے۔ وہ اس کی دعوت کے متعلق کہتا ہے کہ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ (10/25) خدا سلامتی کے گھر کی طرف دعوت دیتا ہے۔ وہ مومنین کے مآلِ زندگی کے متعلق کہتا ہے کہ لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ (6/128)۔ ان کے لئے سلامتی کا گھر ہے۔ وہ جس معاشرہ میں رہتے ہیں، وہ معاشرہ امن اور سلامتی کا گہوارہ ہے اور اس دنیا سے چلے جانے کے بعد، فرشتے ان کا یہ کہہ کر استقبال کرتے ہیں۔ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ (13/24) تم نے دنیا میں امن و سلامتی قائم رکھنے کے لئے جس استقامت کا ثبوت دیا تھا، اس کے بدلے میں یہاں تمہارے لئے امن و سلامتی

کے تحائف ہیں۔ یہی امن و سلامتی کی حسین آرزو ہے جو صبح سے شام تک، ہر مسلمان کے وردِ زبان رہتی ہے جب وہ آنے والے کا استقبال "السلام علیکم" کی صدائے نشاط افزا سے کرتا ہے اور اس کے جواب میں وعلیکم السلام کی نشیدِ جانفزا سنتا ہے۔

جب معاشرہ کے امن اور سلامتی کی فضا میں بگاڑ پیدا ہو جائے تو اسے "فساد" کہا جاتا ہے، جو خدا کے نزدیک سخت ناپسندیدہ ہے وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ الْفَسَادَ (۲/۲۰۵)

فساد ناپسندیدہ ہے

وہ انسانوں کو تاکیداً حکم دیتا ہے کہ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ (۷/۵۶) زمین میں فساد مت برپا کرو۔ وہ مؤمنین کی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ لَا یُرِیْدُوْنَ عُلُوًّا فِی الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا (۲۸/۸۳) ان کا مسلک دنیا میں سرکشی اور فساد برپا کرنا نہیں ہوتا۔

اِن تصریحات سے ظاہر ہے کہ اسلام، امن و سلامتی کا پیامبر ہے اور دنیا میں فساد اور خلفشار کو قطعاً پسند نہیں کرتا۔ اس کا منتہائے نگاہ، دنیا سے فساد ختم کر کے، عالمگیر امن اور سلامتی کی فضا پیدا کرنا ہے۔

یہاں تک بات صاف ہے کہ ہر شخص امن اور سلامتی میں رہنا چاہتا ہے اور اسلام امن و سلامتی کا پیامبر ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص دوسروں کو امن کے ساتھ نہ رہنے دے اور معاشرہ کی سلامتی کو بگاڑنے کی کوشش کرے تو اس وقت کیا کیا جائے؟ اس کا جواب ہمارا ہر روز کا تجربہ اور طرزِ عمل دیتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس قسم کی حرکات پر اُتر آتا ہے تو سب سے پہلے اسے سمجھایا بجھایا جاتا ہے۔ اگر وہ اس پر بھی باز نہیں آتا تو اسے حوالۂ پولیس کر دیا جاتا ہے اور جب عدالت اُسے مجرم پاتی ہے، تو اُسے قید کر دیا جاتا ہے تاکہ امن پسند لوگ اس کی شرانگیزی سے محفوظ رہیں۔

لیکن سرکشی کا کیا علاج؟

یہ تو ہوا کسی کا انفرادی فعل۔ لیکن اگر کوئی قوم اس قسم کی حرکات کرنے لگ جائے تو اس کا کیا علاج؟ عیسائیت کی مرّوجہ تعلیم یہ کہتی ہے کہ ایسی صورت میں چاہیئے کہ اس قوم کی زیادتی کو برداشت کیا جائے۔ اس کے سامنے ہاتھ نہ اٹھایا جائے۔ اس کا مقابلہ نہ کیا جائے۔ اس طرح وہ خود ہی نادم اور پشیمان ہو کر اپنی زیادتی سے باز آجائے گی۔ ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسرا گال سامنے کر دینا۔ جو شخص تمہارا کوٹ اتارے، اُسے واسکٹ خود اُتار کر دے دینا۔ اس طرزِ عمل کو ظالم کی دراز دستیوں کا علاج بتایا جاتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے

کہ اس قسم کی تعلیم حضرت عیسےٰؑ کی نہیں ہو سکتی۔ یہ تجربہ پر صحیح ثابت نہیں ہوتی اور خود عیسائیت کی تاریخ

عیسائیت کی تعلیم

اس کی عملاً تردید کرتی ہے۔ اس سلسلے میں ڈین انگے (DEAN INGE) جو دنیائے عیسائیت کا ایک نامور ترجمان ہے، اپنی کتاب (THE FALL OF IDOLS) میں لکھتا ہے:-

"عدمِ مدافعت کا اصول، ایک چھوٹے سے گلّے کے لئے ناموافق حالات میں زندگی بسر کرنے کے لئے وضع کیا گیا تھا۔ لیکن ایک منظّم سوسائٹی تشدّد کے استعمال سے کبھی مجتنب نہیں رہ سکتی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ایک عیسائی حکومت کو اپنے حدودِ مملکت میں کسی جرائم پیشہ گروہ کو مغلوب نہیں کرنا چاہیئے اور جب اسے تسلیم کر لیا جائے کہ ایسا کرنا ضروری ہے تو پھر اس حکومت کو دشمن کے حملے کی مدافعت کرنی بھی ضروری ہوگی۔ فتنہ و فساد کی مدافعت نہ کرنے کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم ان لوگوں کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں جو کسی آئین و قانون کی پیروی نہیں کرتے۔ آگسٹائن کا بھی خیال تھا کہ ایسے حالات میں جنگ حق بجانب ہوتی ہے...... عدل کے بغیر سلطنت کیا ہے؛ ایک بڑے پیمانے پر قزاقی۔" (صفحہ ۱۷۵)

موجودہ اناجیل میں بھی بعض شہادات ایسی ملتی ہیں جن سے مترشح ہوتا ہے کہ حضرت عیسٰیؑ کی حقیقی تعلیم ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسرا گال سامنے کر دینے کی نہیں تھی۔ مثلاً انجیل متّی کے دسویں باب میں ہے کہ حضرت عیسےٰؑ نے فرمایا:-

• "یہ نہ سمجھ کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں۔ صلح کرانے نہیں بلکہ تلوار چلانے آیا ہوں۔ کیونکہ میں اس لئے آیا ہوں کہ آدمی کو اس کے باپ سے اور بیٹی کو اس کی ماں سے اور بہو کو اُس کی ساس سے جُدا کر دوں۔"

مہاتما گاندھی کا اہمسا

خود ہمارے زمانے میں، ہندوستان میں مہاتما گاندھی نے اہمسا (عدمِ تشدّد) کا پرچار بڑے شدّ و مد سے کیا اور اسے ایک خدائی فلسفۂ حیات کے طور پر پیش کیا۔ لیکن جب ملک میں عام بد امنی پھیلی اور عورتوں تک کی عزّت خطرہ میں نظر آئی تو اُسے مجبوراً یہ کہنا پڑا کہ

"بجائے اس کے کہ ہندوستان کی عورتیں محسوس کریں کہ وہ بے بس ہیں، اس سے کہیں بہتر ہے کہ انہیں

ہتھیاروں کا استعمال سکھایا جائے۔ اور عورتوں میں خنجر اور ریوالور رکھنے کا رواج ترقی پذیر ہو۔

(ہری جن، بابت ۲۷/۱۰/۴۶)

یعنی اہمسا کے پجاری کو یہاں تک کہنا پڑا کہ مرد تو ایک طرف، عورتوں کو بھی "تشدد" کا استعمال کرنا چاہیئے۔
یہی وہ حقیقت تھی جس کے پیشِ نظر علامہ اقبالؒ نے اسی زمانے میں کہا تھا کہ

رِشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم
عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد!

اور اُسی رِشی کے چیلے، آجکل بھارت میں جو کچھ کر رہے ہیں وہ اس کے پیش کردہ فلسفہ کے بطلان کی زندہ شہادت ہے۔

قرآن سطحی جذبات کو اپیل کر کے دوسروں کو وقتی طور پر خوش اور مطمئن نہیں کرتا۔ وہ زندگی کے حقائق کا سامنا کرتا اور اُن کا عملی حل پیش کرتا ہے۔

برائی کی روک مقام بھلائی سے

اس نے سب سے پہلے تلقین کی کہ جہاں تک ہو سکے، برائی کو بھلائی سے روکنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ۝ (۴۱/۳۴)

بُرائی کی مدافعت نہایت حسن کارانہ انداز سے کرو۔ اس سے یہ ممکن ہے کہ تمہارے اور جس شخص کے درمیان عداوت ہے وہ تمہارا گرم جوش دوست بن جائے۔

دوسرے مقام پر اس نے مومنین کی صفت یہ بتائی کہ یَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ (۲۸/۵۴) وہ برائی کو بھلائی سے روکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ برتاؤ ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جن سے نادانستہ بُرائی سرزد ہو جائے اور شریفانہ طرزِ عمل ان پر اصلاحی اثر کرے۔

جرم کی سزا

لیکن اگر اس سے کام نہ چلے اور جس سے شرافت کا سلوک کیا جاتا ہے وہ اس سے ناجائز فائدہ اٹھائے تو قرآن اس کی اجازت دیتا ہے کہ اس کی زیادتی کی روک تھام قوت سے کی جائے لیکن اس کا خیال رکھا جائے کہ سزا جرم سے بڑھنے نہ پائے۔ اس کا ارشاد ہے۔ وَجَزٰٓؤُا

سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا۔ جرم کی سزا جرم کے مطابق ہونی چاہیئے۔ لیکن یہاں بھی قرآن ایک قدم آگے بڑھتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر اس موقع پر بھی دیکھا جائے کہ مجرم اپنے کئے پر نادم ہے اور اگر اسے معاف کر دیا جائے تو اس کی اصلاح ہو سکتی ہے، تو ایسا کرنا بہتر ہے۔ فَمَنْ عَفَا وَ اَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ○ (۴۲/۴۰) غور کیجئے! قرآن اس شخص کو بھی ظالم قرار دیتا ہے جو ایسے مجرم کو معاف نہ کرے جو اپنے کئے پر نادم ہو اور معاف کر دینے سے اس کی اصلاح ہو سکتی ہو۔ اس سے اگلی آیت ہیں، اس نکتہ کی مزید وضاحت کر دی گئی جہاں فرمایا کہ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ○ جو شخص اس ظلم کا بدلہ لیتا ہے جو اس پر کیا گیا ہو، اس پر کوئی الزام نہیں۔ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ط الزام تو ان پر ہے جو لوگوں پر ظلم اور زیادتی کرتے ہیں۔ یہ لوگ الم انگیز سزا کے مستحق ہیں۔ اس کے بعد ہے۔ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ○ (۴۲/۴۱-۴۳) لیکن جو شخص دیکھے کہ عفو اور درگذر کر دینے سے مجرم کی اصلاح ہو سکتی ہے تو وہ اگر ہمت سے کام لے اور مجرم کو سزا سے بچا لے تو یہ بڑی خوبی کی بات ہے۔

قرآنی اقدامات

آپ نے غور فرمایا کہ معاشرہ میں امن قائم رکھنے کے لئے قرآن کیا کیا اقدامات تجویز کرتا ہے، وہ کہتا ہے کہ

(i) دوسروں کے امن میں خلل ڈالنے والوں کو سب سے پہلے حسنِ سلوک سے رام کرنے کی کوشش کرو۔ ان میں اگر شرافت کا مادہ ہے تو یہ حسنِ سلوک ان کی اصلاح کر دے گا۔

(ii) اگر یہ تدبیر مؤثر ثابت نہ ہو تو انہیں ان کے جرم کی سزا دی جائے، لیکن سزا جرم سے بڑھنے نہ پائے۔

(iii) اگر دیکھا جائے کہ مجرم اپنے کئے پر نادم ہے اور معاف کر دینے سے اس کی اصلاح کا امکان ہے تو اسے معاف کر دیا جائے۔

(iv) لیکن جو لوگ ناحق ظلم اور زیادتی کریں ——— اور معاشرہ کے امن کو بگاڑیں اور ان میں اصلاح کے امکانات بھی نہ ہوں تو انہیں سزا دی جائے، یعنی انکی زیادتی کی روک تھام کے لئے قوت کا استعمال کیا جائے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جہاں، السلام اور المؤمن، خدا کی صفات بتائی ہیں ان کیساتھ المھیمن العزیز الجبار المتکبر (۵۹/۲۳) کا بھی اضافہ کر دیا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ قیامِ امن و سلامتی کے لئے بعض اوقات قوت کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے۔

قانون کے ساتھ شمشیر کا نزول

اسی بنا پر اللہ تعالےٰ نے بتایا ہے کہ تنہا قانون، امن قائم رکھنے کے لئے کافی نہیں۔ اس کے ساتھ قوت کی بھی ضرورت ہے۔ سورۂ حدید میں ہے۔ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ ـــــ ہم نے اپنے رسول کو واضح دلائل دے کر بھیجا۔ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْمِيْزَانَ ۔ اور ان کے ساتھ ضابطۂ قوانین بھی نازل کیا اور میزانِ عدل بھی لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۔ تاکہ لوگ عدل پر قائم رہیں۔ وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ (۵۷/۲۵) اور اس کے ساتھ ہی ہم نے فولاد بھی پیدا کیا جس میں شدت کی سختی ہوتی ہے اور یہ لوگوں کے لئے بڑی منفعت بخش چیز ہے کیونکہ اس کی سختی سے دنیا کا امن قائم رہتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

سوچا بھی ہے اے مردِ مسلماں کبھی تو نے ۔۔۔ کیا چیز ہے فولاد کی شمشیرِ جگردار!
اس بیت کا یہ مصرعۂ اوّل ہے کہ جس میں ۔۔۔ پوشیدہ چلے آتے ہیں توحید کے اسرار

جس قانون کی پشت پناہ قوت نہیں، وہ قانون وعظ و نصیحت سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ قانون مؤثر ہی اس صورت میں ہوتا ہے جب اس کے ساتھ قوتِ نافذہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام، جو ایک نظامِ زندگی کا نام ہے، عملی شکل اختیار کرنے کے لئے ایک آزاد مملکت کا وجود ضروری سمجھتا ہے۔ اگر اس کی اپنی آزاد مملکت نہ ہو تو وہ مذہب بن کر رہ جاتا ہے، دین کی صورت اختیار نہیں کر سکتا۔ اور اس مملکت کی حفاظت، وہ اپنا اوّلین فریضہ قرار دیتا ہے۔ اسی لئے اس نے جماعتِ مؤمنین سے تاکیداً کہا ہے۔ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ ...... (۸/۶۰) جہاں تک بھی تمہارے بس میں ہو، قوت پیدا کر کے اور گھوڑوں کے رسالے تیار رکھ کر دشمنوں کے مقابلے کے لئے اپنا ساز و سامان مہیا کئے رہو اور اپنی سرحدوں کی پوری پوری حفاظت کرو تاکہ اس طرح مستعدہ کر تم، اپنے اور نظامِ خداوندی کے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھائے رکھو اور وہ تمہاری طرف قدم بڑھانے کی ہمت نہ کر سکیں۔

لیکن یہ قوت، اس مملکت کی حفاظت کے لئے ہوگی جس میں نظامِ خداوندی نے ایک عملی شکل اختیار کر کے

امنِ عالم کو قائم رکھنا ہے۔ اسے کمزور قوموں کو لوٹنے اور کچلنے کے لئے صرف نہیں کیا جائے گا۔ اس حقیقت پر قرآن کا وہ مقام شاہد ہے جہاں سب سے پہلے مسلمانوں کو جنگ کی اجازت دی گئی ہے۔ اسے غور سے سنیئے۔

جنگ کی پہلی اجازت

نبی اکرمؐ اور جماعتِ مومنین نے تیرہ برس مکہؐ میں گزارے اور مخالفین کے جور و ستم کو کامل صبر و سکون سے برداشت کیا۔ ان کی طرف سے ہر برائی کی مدافعت بھلائی سے کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن اس سے انہوں نے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ ان کی طرف سے شدائد اور مصائب کا سلسلہ دن بدن زیادہ ہوتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ حق پرستوں کی اس مختصر سی جماعت نے اپنا گھر بار چھوڑ کر دور مدینہ میں جاکر پناہ لی۔ لیکن ان مخالفین نے وہاں بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا اور تہیّہ کر لیا کہ یا تو انہیں مجبور کر دیا جائے کہ وہ اپنی دعوت کو چھوڑ دیں اور یا ان کا خاتمہ کر دیا جائے۔ چنانچہ وہ ایک لشکرِ جرّار لے کر ان کے خلاف چڑھ دوڑے۔ اب اس جماعت کے سامنے زندگی اور موت کا سوال تھا۔ یہ تھا وہ مقام جب انہیں پہلی مرتبہ، میدانِ جنگ میں آنے کی اجازت دی گئی۔ سورۂ حج میں ہے۔ اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا ط یہ لوگ جن پر اس قدر مظالم کئے گئے ہیں اب بالآخر انہیں جنگ کی اجازت دی جاتی ہے۔ یہ گھبرائیں نہیں۔ وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرُ ۙ خدا ان کی مدد کرنے پر یقیناً قادر ہے ۔ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ط ان پر مظالم اس انتہا کو پہنچ چکے تھے کہ ان بچاروں کو ان کے گھر بار سے بھی نکال باہر کیا گیا اور ناحق ایسا کیا گیا۔ ان کا جرم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ یہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ اس جرم کی پاداش میں انہیں ان کے وطن تک سے نکال دیا گیا۔ اور اب جبکہ یہ دیارِ غیر میں آکر پناہ گزین ہوئے ہیں تو انہیں یہاں بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیا جاتا۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا اس قسم کی سرکش قوموں کو بدلگام ہونے دیا جائے یا ان کی روک تھام کا کچھ انتظام کیا جائے۔ اس سلسلہ میں ایک بات بالکل واضح ہے اور وہ یہ کہ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ لَّھُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِیَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ یُذْکَرُ فِیْھَا اسْمُ اللّٰہِ کَثِیْرًا ط اگر اللہ ایسا انتظام نہ کرے کہ سرکش قوتوں کی روک تھام دوسرے لوگوں کے ہاتھوں ہو، تو پھر دنیا میں کوئی امن کی جگہ باقی نہ رہے، حتیٰ کہ مختلف اہلِ مذاہب کی پرستش گاہیں تک مسمار کر دی جائیں۔ راہبوں کی کوٹھڑیاں، یہودیوں کے صومعے، دیگر اقوام کی عبادت گاہیں، مسجدیں جن میں خدا کا نام بکثرت لیا جاتا ہے، یہ سب ڈھا دی جائیں۔ اس مقصد کے لئے ایسی جماعتوں کا وجود مزید برآں عند القدرت اپنی

جان تک دے کر لوگوں کی مذہبی آزادی برقرار رہنے کا انتظام کریں۔ وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ○ (۲۲/۳۹-۴۰) جو جماعت، اس مقصدِ عظیم کے حصول کیلئے خدا کی مددگار بنے گی، خدا یقیناً اس کی مدد کرے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا بڑی قوتوں اور غلبہ کا مالک ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ جماعت، جسے سرکش قوتوں کی روک تھام کے لئے جنگ کی اجازت دی جا رہی ہے، اگر اسے غلبہ حاصل ہو گیا تو اس کا طرزِ عمل کیا ہوگا۔ کیا اس کا غلبہ بھی اس طرح کمزوروں اور ناتوانوں کو کچلنے کے لئے ہوگا۔ قطعاً نہیں۔ الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ ۗ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ ○ (۲۲/۴۱) یہ

اسلامی مملکت کی غرض و غایت

وہ لوگ ہیں کہ اگر انہیں تمکن حاصل ہو گیا تو یہ ایسا نظام قائم کریں گے جس میں لوگ قوانینِ خداوندی کا اتباع کریں اور ہر شخص کو سامانِ نشو و نما حاصل ہو۔ یہ ان باتوں کا حکم دیں گے جنہیں خدا کا قانون صحیح قرار دیگا اور اُن سے روکیں گے جنہیں وہ ناپسندیدہ کہے گا۔ ان کی حکومت میں ہر معاملہ کا آخری فیصلہ، قانونِ خداوندی کے مطابق ہوگا۔ لہٰذا اس میں کسی قسم کی سرکشی اور دھاندلی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔

دوسرے مقام پہ کہا گیا کہ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْأَرْضُ۔ اگر اللہ سرکش قوتوں کی روک تھام کا انتظام نہ کرتا رہے تو دنیا میں فساد ہی فساد نظر آئے۔ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ ○ (۲/۲۵۱) لیکن خدا اس طرح اقوامِ عالم کو تباہ نہیں کرانا چاہتا۔ اس لئے اس نے ایسی جماعتیں بھی پیدا کر دی ہیں جو اپنی جان دے کر، امنِ عالم قائم رکھیں۔

لہٰذا قرآنِ کریم کی رُو سے، جنگ کی اجازت ان لوگوں کو دی گئی ہے جنہیں سرکش قوتیں کہیں جینے نہ دیں۔ وہ ان قوتوں سے مدافعت کے لئے جنگ کر سکتے ہیں۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ان بیچاروں میں اتنی سکت نہ ہو کہ یہ اپنی مدافعت کر سکیں تو پھر کیا ہو؟ کیا اس صورت میں انہیں ان جفا جو درندوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے گا؟ قرآن کہتا ہے کہ نہیں۔ ان مظلوموں اور لاوارثوں کی مدد کی جائے اور ان کی حفاظت

مظلوموں کی مدد کے لئے

کے لئے عندالضرورت میدانِ جنگ میں اترا جائے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں جماعتِ مؤمنین سے کہا جاتا ہے کہ، وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم خدا کی راہ میں جنگ کے لئے نہیں نکلتے۔

وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا۔ تم سنتے نہیں کہ کمزور اور ناتواں مرد، عورتیں، بچے، کس طرح چلا چلا کر پکار رہے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں اس بستی سے نکال لے جس کے باشندوں نے اس قدر ظلم برپا کر رکھا ہے۔ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ؕ (۴/۷۵) وہ فریاد کر رہے ہیں کہ ہمارے لئے کہیں سے کوئی سرپرست پیدا کر دے، کوئی مددگار بھیج دے جو ہمیں ان کے مظالم سے نجات دلائے۔ کیا ان کی فریاد تمہارے کانوں تک نہیں پہنچ رہی۔ یا تم نے سمجھ لیا ہے کہ چونکہ اب ہم محفوظ ہو گئے ہیں اس لئے ہمیں لڑنے کی ضرورت نہیں۔ یہ خیال غلط ہے۔ تمہارا مقصدِ زندگی، اپنی جان کی حفاظت ہی نہیں بلکہ دنیا میں ہر مظلوم کی حفاظت ہے۔ ظلم کی روک تھام، تمہارا فریضۂ زندگی ہے۔ اس لئے جہاں سے مظلوم کی آواز اٹھے گی، تمہیں اس کی مدد کے لئے پہنچنا ہوگا۔ یہی جنگ "قتال فی سبیل اللہ" اللہ کی راہ میں جنگ ہے۔ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ (۴/۷۶) جماعتِ مومنین، ظلم کی روک تھام کے لئے، خدا کی راہ میں جنگ کرتی ہے اور جو لوگ حق و صداقت سے انکار کرتے ہیں، وہ ظلم اور سرکشی کے لئے جنگ کرتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے یہاں جنگ کے مقاصد میں اصولی اور بنیادی فرق بتا کر یہ واضح کر دیا کہ کس مقصد کے لئے جنگ، جائز بلکہ ضروری ہو جاتی ہے اور کن مقاصد کے لئے ناجائز اور باطل۔

جائز اور ناجائز جنگ

اگر جنگ ظلم مٹانے اور مظلوم کی مدد کرنے کے لئے ہو تو جائز۔ اگر ظلم برپا کرنے کے لئے ہو تو ناجائز۔ ظلم کسے کہتے ہیں، اسے قرآنِ کریم نے مختلف مقامات پر نہایت وضاحت سے خود ہی بیان کر دیا ہے تاکہ ایسا نہ ہو کہ کوئی گروہ کسی بات کو یوں ہی ظلم قرار دے کر آمادۂ پیکار ہو جائے اور اپنے آپ کو برسرِ حق قرار دے لے۔ قرآن اپنی کسی بات کو مبہم اور وضاحت طلب چھوڑتا ہی نہیں۔ لیکن یہ الگ موضوع ہے جس کے متعلق میں مختلف مواقع پر بہت کچھ کہہ چکا ہوں۔ اس مقام پر صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ جن امور کو قرآن "بنیادی حقوقِ انسانیت" قرار دیتا ہے، کسی انسان یا انسانوں کے گروہ کو ان سے محروم کر دینا، ظلم قرار پائے گا۔ اور اس کی روک تھام جماعتِ مومنین کا فریضہ ہوگا، خواہ یہ ظلم کسی پر بھی کیوں نہ ہو رہا ہو۔ اس میں مسلم اور

غیر مسلم کی بھی تمیز نہیں ہوگی۔

یہاں تک سوال، جنگ کی ضرورت، مقاصدِ جواز یا عدمِ جواز کا تھا۔ اب یہ دیکھئے کہ جنگ کی صورت میں قرآن، جماعتِ مؤمنین پر کن شرائط کی پابندی ضروری قرار دیتا ہے۔ سب سے پہلے یہ کہ عدل کا

دشمن سے عدل

دامن جنگ میں بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا جائے گا۔ دشمن سے بھی عدل کیا جائے گا۔ اس کا تاکیدی حکم ہے کہ وَلَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۟ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی ۫ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ۔ (۵/۸) دیکھنا! کسی قوم کی تمہارے خلاف دشمنی کہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم اس سے عدل نہ کرو۔ دشمن سے بھی عدل کرو۔ یہی طرزِ عمل تقویٰ سے قریب تر ہے۔ عدل ظلم کی ضد ہے۔ لہٰذا جب ظلم کے معنی ہیں کسی کو انسانیت کے بنیادی حقوق سے محروم کر دینا تو عدل سے مراد ہوگی ان حقوق کی حفاظت کرنا۔ بنا بریں قرآنِ کریم کی رُو سے، جنگ کی حالت میں بھی دشمن کو حقوقِ انسانیت سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا کا عام چلن یہ ہے کہ جنگ اور معاشقہ میں ہر حربہ جائز ہے۔ (EVERTHING IS FAIR IN LOVE AND WAR) لیکن قرآن اسے حدیثِ بے خبراں قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک عدل کو ہاتھ سے چھوڑ دینا، جنگ میں بھی جائز نہیں۔

اب آگے بڑھئے۔ جنگ ہو یا صلح، ان میں معاہدات کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا امن معاہدات کے بھروسے پر قائم رہتا ہے۔ معاہدہ باہمی اعتماد کی ضمانت ہوتا ہے۔

معاہدات کی اہمیت

لیکن جب اصول یہ قرار دے لیا جائے کہ جنگ میں سب کچھ جائز ہے تو پھر معاہدات کا احترام کہاں باقی رہ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یونان کے مشہور مقنن، سولن نے کہا تھا کہ معاہدہ مکڑی کا جالا ہے جو اپنے سے کمزور کو تو پھانس لیتا ہے، لیکن قوت والے کے سامنے پرکاہ کی سی بھی حیثیت نہیں رکھتا۔ اور مغربی سیاست کا امام میکیاؤلی یہ تعلیم دیتا ہے کہ

"عقلمند بادشاہ وہ ہے کہ جب دیکھے کہ کوئی عہد یا پیمان اس کے خلاف جاتا ہے یا جن مصلحتوں

کے پیشِ نظر وہ معاہدہ کیا گیا تھا وہ باقی نہیں رہیں تو اُسے بلا تامّل توڑ ڈالے۔ لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ اس قسم کی عہد شکنی کے لئے نہایت نظر فریب دلائل بھی بہم پہنچائے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر وہ فریب جس سے مقصد حاصل ہو قابلِ تعریف ہوتا ہے۔"

اور اس امام کے مقتدی، فریڈرک دوم کا قول ہے کہ

"حکمتِ عملی یہ نہیں کہ پہلے سے متعین کر لیا جائے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ حکمتِ عملی یہ ہے کہ حسبِ موقعہ جو صورت اپنے فائدے کی نظر آئے' اسے اختیار کر لیا جائے۔ اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ، دوسری سلطنتوں سے معاہدات کر کے اپنے ہاتھ نہیں باندھ لینے چاہئیں۔ اپنے آپ کو آزاد رکھنا چاہیئے۔ اگر کبھی کسی سے معاہدہ کر بھی لیا جائے تو اُسے حسبِ مصلحت توڑ ڈالنا چاہیئے۔"

اٹلی کے میکیاوُلی سے بہت پہلے، بھارت (ہندوستان) میں ایک میکیاوُلی گزرا ہے جس کا لقب ہی کوٹلیہ (KAUTILYA) —— یعنی فریب کار —— ہے۔ وہ اپنی کتاب، ارتھ شاستر میں لکھتا ہے کہ

"معاہدات کو وقتی مصلحتوں کے تابع رہنا چاہیئے اور عندالضرورت ان سے بلا توقّف پھر جانا چاہیئے۔ لیکن یہ سب کچھ اس انداز سے کرنا چاہیئے کہ اپنوں اور بیگانوں میں سے کسی کو تمہاری چال کا علم نہ ہونے پائے۔"

ان سب کے برعکس، قرآنِ کریم نے معاہدات کی پابندی پر جس قدر زور دیا ہے، اس پر اس کا ایک ایک متعلّقہ مقام شاہد ہے۔ اس نے اصولی تاکید کی کہ اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ (۵/۱) عہد و پیمان کی پوری پوری پابندی کرو۔ دوسرے مقام پر ہے کہ یہ نہ سمجھو کہ معاہدہ کرنے کے بعد تم ایفائے عہد

معاہدہ کا احترام

کے لئے صرف اس پارٹی کے سامنے جواب دِہ ہو جس کے ساتھ تم نے معاہدہ کیا ہے۔ تم اس کے لئے اپنے خدا کے سامنے بھی جواب دِہ ہو۔ اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا۔ (۱۷/۳۴) عہد کی پابندی کرو۔ یاد رکھو! تم سے عہد و پیمان کے متعلق پوچھا جائے گا۔

قرآن کے ان تاکیدی احکام کی روشنی میں، جماعتِ مؤمنین کی طرف سے، معاہدات میں خیانت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن قرآن اس باب میں ایک قدم آگے بڑھتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر

فریقِ مخالف خیانت پر اُتر آئے تو پھر کیا کیا جائے؟ اس کا جواب عام طور پر یہی دیا جائے گا کہ پھر تم بھی اسی قسم کا طرزِ عمل اختیار کرو۔ لیکن قرآن کی یہ تعلیم نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ وَ اِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِیَانَةً۔ اگر تمہیں کسی پارٹی کی طرف سے عہد شکنی کا خطرہ ہو تو تم انہیں اطلاع دئیے بغیر، یونہی معاہدہ کالعدم نہ کر ڈالو۔ فَانْۢبِذْ اِلَیْهِمْ عَلٰی سَوَآءٍ۔ تم انہیں اس کی اطلاع دے کر معاہدہ ختم کرو اور اس طرح دونوں فریق برابر کی سطح پر آجاؤ۔ عَلٰی سَوَآءٍ کے یہ معنی بھی ہیں، کہ اگر اس طرح یک لخت معاہدہ توڑنے سے انہیں کوئی نقصان پہنچتا ہو تو اس کی تلافی کر کے اُن سے مساوات کا سلوک کرو۔ اس لئے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْخَآئِنِیْنَ (۸/۵۸) اللہ معاہدات میں خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

ہماری تاریخ کے اس عہدِ ہمایوں میں جب قرآنی نظام قائم تھا، کسی بین الاقوامی معاہدہ میں خیانت کا تو تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اُس زمانے میں، انفرادی عہد و پیمان کا بھی کس حد تک احترام کیا جاتا تھا، اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگائیے۔

عملی مثالیں

بدر کے میدان میں حالت یہ تھی کہ اِدھر تین سو تیرہ قریب قریب نہتے اور بے ساز و براق مجاہدین کی صف، مقابل میں قریش کا جمّ غفیر۔ اتنے میں دیکھا کہ دو صحابیؓ کہیں سے دوڑے دوڑے آئے اور مجاہدین کی صفوں میں شریک ہو گئے۔ اس وقت حالات ایسے نازک تھے کہ اسلامی لشکر میں ایک سپاہی کا اضافہ بھی موجب تقویت تھا۔ مجاہدین کو اس سے بڑی خوشی ہوئی۔ حضورؐ کے دریافت کرنے پر انہوں نے کہا کہ وہ کسی اور طرف سے آ رہے تھے۔ راستے میں کفار نے روکا کہ تم محمدؐ کی مدد کے لئے جا رہے ہو۔ انہوں نے انکار کیا اور وعدہ کیا کہ وہ اس جہاد میں شرکت نہیں کریں گے۔ اس طرح وہ میدانِ جنگ تک پہنچ سکے ہیں۔ حضورؐ نے سنا تو فرمایا جب تم نے ان سے جنگ میں عدمِ شرکت کا وعدہ کیا ہے تو اس کا ایفا کرنا ضروری ہے۔ تم جہاد میں شریک نہیں ہو سکتے۔ فکر نہ کرو۔ ہماری اللہ مدد کرے گا۔

یہ تو پھر بھی ایسے عہد کی پابندی ہے جو بہ حالاتِ مجبوری ہی سہی، مخالفین سے کر لیا گیا تھا۔ قرآنِ کریم اس باب میں اس سے بھی دو قدم آگے جاتا ہے۔ ہجرت کے بعد ایسی صورت پیدا ہو گئی تھی کہ بعض عورتیں مسلمان ہو گئیں، لیکن ان کے خاوند ہنوز غیر مسلم تھے۔ ان کفار کی طرف سے ان مسلمان بیویوں پہ

جو مظالم ہوتے ہوں گے وہ ظاہر ہیں۔ یہ عورتیں اپنے غیر مسلم خاوندوں کو چھوڑ کر کسی نہ کسی طرح ہجرت کر کے مدینے میں آجاتی تھیں اور اس طرح ان کے مظالم سے چھٹکارا حاصل کر لیتی تھیں۔ ان عورتوں کے متعلق قرآن نے کہا کہ انہیں واپس نہ بھیجو کیونکہ ان حالات میں، ان مسلم عورتوں کا ان کفّار کے نکاح میں رہنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اٰتُوْهُمْ مَّآ اَنْفَقُوْا۔ (۶۰/۱۰) انہوں نے ان کے نکاح پر جو کچھ خرچ کیا تھا وہ انہیں ادا کر دو۔ غور کیجئے کہ آپ کو ایفائے عہد اور عدل و انصاف کی اس قسم کی مثالیں کہیں اور بھی ملتی ہیں؟

صلح

اس کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے، جس قوم سے جنگ چھڑ جائے، اس جنگ کو کب تک جاری رکھا جائے؟ قرآن نے کہا ہے کہ وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا (۸/۶۱)۔ فریقِ مخالف جس وقت بھی صلح کی طرف جھکے تم اس کی طرف جھک جاؤ۔ اس وقت یہ نہ کہو کہ ہماری فتح ہونے لگی تھی تو دشمن نے صلح کی درخواست پیش کر دی۔ اب ہم صلح کیوں کریں۔ ہم انہیں مفتوح و مغلوب بنائیں گے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ اندازِ نگاہ غلط ہے۔ جنگ سے تمہارا مقصد نہ مالِ غنیمت تھا نہ کشورکشائی۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ سرکش قوتیں اپنی سرکشی سے باز آجائیں۔ سو وہ جس وقت بھی سرکشی چھوڑ کر قانون کے سامنے جھک جائیں، تمہارا مقصد حاصل ہوگیا۔ اس کے بعد جنگ جاری رکھنے کے معنی کیا ہیں؟ وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ـــــــ (۸/۶۲) اگر بفرضِ محال، وہ صلح کی درخواست کی آڑ میں تمہیں دھوکا دینے کا ارادہ رکھتے ہوں تو تمہیں پھر بھی گھبرانا نہیں چاہیئے۔ قانونِ خداوندی تمہاری حفاظت کے لئے کافی ہے۔ تم اپنی طرف سے پوری پوری احتیاطی تدابیر اختیار کرو، لیکن ان کی صلح کی درخواست کو اس بدگمانی کے ماتحت مسترد نہ کر دو کہ وہ اس باب میں نیک نیتی سے کام نہیں لے رہے۔

جنگ کب تک جاری رکھی جائے

اس کے بعد سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ صلح کے لئے آمادہ نہ ہوں تو جنگ کب تک جاری رکھی جائے۔ اس کے لئے کہہ دیا کہ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ۔ (۸/۳۹) جب تمہیں یقین ہو جائے کہ وہ فتنہ فرو ہو گیا ہے جس کی وجہ سے یہ جنگ کی گئی تھی تو جنگ ختم کر دو۔ اس لئے کہ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، جنگ سے مقصد فتنہ ختم کرنا تھا۔ لفظ فتنہ کے اندر ہر قسم کی سرکشی، استبداد، جور و ستم، مذہب

کے معاملہ میں سختی اور زبردستی سب آجاتے ہیں۔

یہ تو رہا صلح کی صورت میں، یا فتنہ فرو ہو جانے کی شکل میں جنگ کا اختتام۔ لیکن قرآنِ کریم، جنگ کے دوران امن و سلامتی کی فضا پیدا کرنے کے لئے ایک ایسی تدبیر اختیار کرتا ہے کہ جب نگہ بصیرت اس پر غور کرتی ہے تو وجد میں آجاتی ہے۔

جنگ کا التوا

جنگ اسی صورت میں جاری رکھی جا سکتی ہے کہ فریقین اپنی اپنی قوم اور سپاہیوں کے دل میں، فریقِ مخالف کے خلاف نفرت اور عداوت کے جذبات برابر مشتعل کرتے رہیں۔ اگر کسی جنگ میں وقفہ پیدا کر دیا جائے تو جذبات کا یہ اشتعال مدھم پڑ جاتا اور پھر ختم ہی ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد دوبارہ اس آگ کو بھڑکانا مشکل ہوتا ہے۔ یہی وہ مقصد ہے جس کے لئے ہمارے زمانہ میں متارکہ (یا (CEASE FIRE) کا طریق وضع کیا گیا ہے لیکن قرآنِ کریم نے، آج سے بہت پہلے، متارکہ کے اصول کو قوانینِ جنگ کے ضابطہ میں داخل کر دیا تھا۔ اس نے کہا کہ بین الاقوامی معاہدہ کی رُو سے یہ طے کر لینا چاہیئے کہ، سال میں کچھ مہینے ایسے رکھے جائیں گے جن میں جنگ بہرحال ملتوی کر دیتی ہوگی، خواہ وہ کہیں بھی ہو رہی ہو۔ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ (9/36) سال کے بارہ مہینوں میں چار ایسے ہیں جن میں لڑائی یکسر بند رہے گی۔ ظاہر ہے کہ جب سال میں، کچھ وقت کے لئے لڑائی بہرحال بند ہو گی تو جذباتِ منافرت و عداوت کی آگ کی شعلہ زنی خود بخود ماند پڑ جائے گی اور یہ فضا قیامِ امن و صلح کے لئے بڑی سازگار ہو گی۔

جنگ کے قیدی

جنگ کے سلسلے میں ایک اہم سوال جنگ کے قیدیوں کا ہوتا ہے۔ دنیا میں یہ روش، زمانہ قدیم سے چلی آرہی تھی کہ جنگ کے قیدیوں کو غلام اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنا لیا جاتا تھا۔ نزولِ قرآن کے وقت عربوں میں یہی رواج تھا۔ چنانچہ ان کے معاشرہ میں غلام اور لونڈیاں عام ملتی تھیں اور اسے ذرا بھی معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ قرآنِ کریم نے آکر یہ انقلاب آفریں اعلان کیا کہ کسی انسان کو غلام بنا لینا اسے حقِ انسانیت سے محروم کر دینا ہے جو بہت بڑا جرم ہے۔ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ۔ جب مخالفین سے تمہارا مقابلہ ہو، تو جیسا کہ جنگ میں ہوتا ہے ان کی سرکوبی کرو۔ حَتّٰٓى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ۙ پھر جب وہ مغلوب ہو جائیں تو انہیں قید کر لو۔ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً (47/4) اس کے بعد یا تو انہیں بطورِ احسان چھوڑ دو اور یا فدیہ لے کر۔ آپ دیکھئے کہ بات کس قدر صاف ہے۔

جنگ کے قیدیوں کو آزاد کرنا ہوگا۔ اگر تمہارے قیدی دشمن کے ہاں ہیں تو ان کے مبادلہ میں انہیں رہا کر دو۔ بہرحال انہیں آزاد کرنا ہے۔ جنگ کے قیدیوں کے متعلق قرآنِ کریم میں یہی ایک آیت ہے۔ اس میں آپ دیکھیے کہ انہیں غلام اور لونڈیاں بنا لینے کا اشارہ تک نہیں اور ایسا ہو بھی کس طرح سکتا تھا۔ وہ قرآن جو فَكُّ رَقَبَةٍ (۹۰/۱۳) یعنی غلاموں کو آزاد کرانے کو، جماعتِ مومنین کا فریضہ قرار دیتا ہے، جو جنگ کی ضرورت ہی اس لئے قرار دیتا ہے کہ جن لوگوں کو حقوقِ انسانیت سے محروم کر دیا گیا ہے انہیں وہ حقوق واپس دلائے جائیں، جو واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسان کو اپنا غلام اور محکوم بنائے۔ کیا وہ قرآن اس کا حکم دے گا کہ جنگ میں قید ہونے والے انسانوں کو غلام اور لونڈیاں بنا کر انہیں بھیڑ بکریوں کی طرح بیچا جائے! سُبْحَانَ اللّٰهِ تَعَالَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ (۲۸:۶۸)۔ جب تک جنگ کے قیدی نظامِ اسلامی کی تحویل میں رہیں گے ان کی حیثیت سرکاری مہمانوں کی ہوگی۔ اس لئے کہ وہ قیدی ہو کر بھی انسان تو رہتے ہیں۔ اس لئے انہیں حقوقِ انسانیت سے کسی صورت میں بھی محروم نہیں کیا جا سکتا۔ اس دوران میں ان سے کس قسم کا سلوک ہوگا اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جنگِ بدر کے قیدیوں میں ایک شخص ابو عزیز تھا۔ اس کا بیان ہے کہ میں جس انصاری کے گھر میں بطور مہمان رکھا گیا تھا ان کی حالت یہ تھی کہ وہ صبح شام کھانا لاتے تو کھانا میرے سامنے رکھ دیتے اور خود کھجوروں پر گزارہ کرتے۔ مجھے شرم آتی اور میں روٹی ان کے ہاتھ میں دے دیتا۔ لیکن وہ اُسے ہاتھ نہ لگاتے اور زبردستی مجھے کھلا دیتے۔

انہی قیدیوں میں ایک شخص سہیل بن عمر تھا جو فصیح اللسان ہونے کی وجہ سے، عام مجمعوں میں، نبی اکرمؐ کے خلاف تقریریں کیا کرتا تھا۔ کسی نے تجویز پیش کی کہ اس شخص کے سامنے کے دو دانت اکھڑوا دیئے جائیں تاکہ یہ آئندہ تقریر کرنے کے قابل نہ رہے۔ لیکن حضورؐ نے اس کی اجازت نہ دی۔

جنگِ بدر کے قیدیوں کو زرِ فدیہ لے کر چھوڑ دیا گیا تھا۔ جو ناداری کی وجہ سے زرِ فدیہ دے نہ سکے، ان سے کہا گیا کہ وہ دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔ یہی ان کا فدیہ ہو جائے گا۔ جو ایسا بھی نہیں کر سکتے تھے انہیں احساناً چھوڑ دیا گیا۔ جن سے زرِ فدیہ لیا گیا تھا ان سے بھی جاتے وقت کہہ دیا گیا کہ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ (۸/۷۰) اگر اس کے بعد اس مملکت کے متعلق تمہارے دل میں خیر سگالی کے جذبات پائے گئے، تو جو کچھ تم سے لیا گیا ہے تمہیں اس

سے بہتر واپس دیا جائے گا اور تمہاری حفاظت کا سامان بھی کر دیا جائے گا۔

"غلامی اور اسلام" ایک مستقل موضوع ہے جس پر تفصیل سے گفتگو کسی دوسرے وقت کی جا سکے گی۔ اس مقام پر ضمناً اتنا واضح کر دینا کافی ہوگا کہ قرآنِ کریم میں غلاموں اور لونڈیوں (مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ) کے ضمن میں جس قدر احکام اور ہدایات ہیں وہ ان غلاموں اور لونڈیوں سے متعلق ہیں جو نزولِ قرآن کے وقت عربوں کے معاشرہ میں موجود تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تمام احکام ماضی کے صیغے (PAST TENSE) میں ہیں۔ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ۔ یعنی جو اس سے پہلے غلام بنائے جا چکے ہیں۔ یہ نہیں کہا گیا کہ جنہیں تم اس کے بعد غلام بناؤ اُن کے متعلق یہ احکام ہیں۔ قرآن نے ان غلاموں اور لونڈیوں کو جو اس وقت اس معاشرہ میں موجود تھے، آہستہ آہستہ آزاد کرا دیا یا انہیں مختلف خاندانوں کا جزو بنا دیا۔ اور اس کے بعد غلامی کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا۔ لیکن اس بدقسمتی کا کیا علاج کہ ہمارے اربابِ مذہب، اب بھی بڑے فخر سے کہتے ہیں اسلام میں دشمن کے قیدیوں کو غلام اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنا لینے کی اجازت ہے اور اگر اب بھی پاکستان کی جنگ کسی اور ملک سے ہوئی تو ہم ان کے مردوں کو غلام اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنائیں گے۔ وہ کہتے ہیں کہ

> "حکومت کو اختیار ہے کہ (جنگ میں گرفتار شدہ عورتوں کو) چاہے رہا کر دے، چاہے ان سے فدیہ لے، چاہے ان کا تبادلہ مسلمان قیدیوں سے کرے جو دشمن کے ہاتھ میں ہوں اور چاہے انہیں سپاہیوں میں تقسیم کر دے اور سپاہی انہیں اپنے استعمال میں لائیں۔"

(تفہیم القرآن از ابوالاعلیٰ مودودی صاحب، جلد اوّل ص ۳۴۰)

اس کی مزید تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

> "جنگ میں پکڑی ہوئی عورتوں سے تمتع کے معاملہ میں یہ شرط نہیں کہ وہ اہلِ کتاب ہی میں سے ہوں۔ ان کا مذہب خواہ کوئی ہو، بہرحال جب وہ تقسیم کر دی جائیں گی تو جن کے حصے میں جو آئیں وہ ان سے تمتع کر سکتے ہیں۔" (ایضاً۔ ص ۳۴۰)

یعنی نکاح تو صرف مسلمان عورتوں سے یا اہلِ کتاب کی عورتوں سے ہو سکتا ہے، کفّار اور مشرکین کی عورتوں سے نکاح نہیں ہو سکتا لیکن جنگ میں گرفتار شدہ لونڈیوں کے لئے یہ بھی شرط نہیں کہ وہ اہلِ کتاب سے ہوں۔

اِس کے بعد لکھتے ہیں :-

"جس طرح شریعت نے بیویوں کی تعداد پر چار کی پابندی لگائی ہے اس طرح لونڈیوں کی تعداد پر نہیں لگائی۔"

حتیٰ کہ جن لوگوں کے حصے میں یہ لونڈیاں آئیں گی انہیں اس کا بھی اختیار ہوگا کہ استعمال کرنے کے بعد انہیں دوسروں کے ہاتھ فروخت کر دیں۔ چنانچہ اس باب میں تحریر ہے کہ

اس قسم کے لونڈی غلاموں کو بیچنے کی اجازت دراصل اس معنی میں ہے کہ ایک شخص کو ان سے فدیہ وصول کرنے اور فدیہ وصول نہ ہونے تک ان سے خدمت لینے کا جو حق حاصل ہے اس کو وہ معاوضہ لے کر دوسرے شخص کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔　　(تفہیمات، حصہ دوم، ص ۳۲۳)

یہ ہے جنگ میں گرفتار زندہ قیدیوں اور ان کی عورتوں کے ساتھ وہ سلوک جسے یہ حضرات، اسلام کا منشاء اور حکم قرار دے کر دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں[۱]۔

بہرحال، یہ بات ضمناً سامنے آ گئی تھی۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ قرآن نے حکم یہ دیا کہ جنگ کے قیدیوں کو یا تو فدیہ لے کر رہا کر دو اور یا بطورِ احسان۔

یہ تو ان لوگوں کے متعلق ہے جو مغلوب و مفتوح ہو کر گرفتار ہو جائیں۔ لیکن جو لوگ مسلمانوں کی پناہ میں آنا چاہیں، ان کے متعلق قرآن کا فیصلہ اُس کی کشادہ نگہی کی زندہ شہادت ہے۔

پناہ میں آنے والے

آج کل ایک نئی ٹیکنیک رائج ہوئی ہے جسے (BRAIN WASHING) کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو شخص تمہارے قابو آ جائے ——— خواہ وہ تمہارے اپنے لوگوں میں سے ہو اور اس کے خلاف کوئی بدگمانی ہو، یا دشمن کا کوئی آدمی ——— اُسے دردناک عذاب کی بھٹیوں میں سے اس طرح گزارو کہ اس کے تمام سابقہ خیالات اس کے دماغ سے محو ہو جائیں اور وہ اس طرح سوچنے لگ جائے جس طرح تم چاہو۔ اس کے برعکس دیکھئے کہ قرآنِ کریم کی تعلیم کیا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ

وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّىٰ يَسْمَعَ كَلَامَ اللَّهِ۔

---

[۱] تفصیل ان امور کی، ادارہ طلوعِ اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتاب "قتلِ مرتد اور غلام اور لونڈیاں" میں ملے گی۔

اور اگر مخالفین (مشرکین) میں سے کوئی شخص تم سے پناہ مانگے، تو اسے اپنے ہاں پناہ دو۔ پھر اسے قرآن سناؤ۔ اگر قرآن کی تعلیم اسے اپیل کرے اور وہ دل کے کامل اطمینان اور سکون کے ساتھ اسے قبول کرنا چاہے تو خیر ـــــ لیکن اگر وہ اس کے بعد چلے جانا چاہے تو اسے روکو نہیں بلکہ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ۔ اسے اپنی حفاظت میں، اس کے امن کی جگہ تک پہنچا دو۔ ذَالِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ٥ (۹/۶) اس لئے کہ یہ لوگ جاہل ہیں؛ جانتے نہیں کہ قرآن انہیں کیا مقام دینا چاہتا ہے۔ لیکن قرآن کسی سے زبردستی نہیں منوایا جاتا۔ اس لئے اگر بطیب خاطر، قرآن کو ماننا نہیں چاہتے، تو انہیں اپنی حفاظت میں انکے مامن تک پہنچا دو۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس باب میں قرآنِ کریم کی تعلیم کس قدر بلند اور انسانیت ساز ہے[۱]۔

اس کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیا قرآنِ کریم جنگ کو انسان کی تمدنی زندگی کے لئے لاینفک قرار دیتا ہے یا ایسے معاشرہ کا بھی تصوّر دیتا ہے جس میں جنگ کا امکان نہ رہے۔ وہ ایسے معاشرہ کا تصوّر دیتا ہے۔ جو آیت اوپر درج کی گئی ہے، اس میں کہا گیا ہے کہ جب تمہیں حق کی مدافعت کے لئے میدانِ جنگ میں نکلنا پڑے تو دشمن کی سرکوبی کرو۔ اور جب ان کی طاقت ٹوٹ جائے تو بقیۃ السیف کو قید کر لو اور قیدیوں کو فدیہ لے کر یا احساناً چھوڑ دو۔ اس کے بعد ہے۔ حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا۔ (۴۷/۴) تاآنکہ خود جنگ اپنے ہتھیار رکھ دے، دنیا سے جنگ کا خاتمہ ہو جائے۔ قرآن جس جنّتی معاشرہ کا تصوّر پیش کرتا ہے اس میں ہر طرف سے سلاماً سلاماً کی زندگی بخش اور امن افروز صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ اس میں ہر انسان، دوسرے انسان کی سلامتی کا آرزو مند ہوتا ہے۔ وہ ایسی انسانیت ساز فضا کس طرح پیدا کرتا ہے جس میں بدامنی کا خدشہ تک نہ ہو، یہ ایک الگ موضوع ہے جو تفصیل چاہتا

جنگ کا خاتمہ

---

[۱] قرآن تو پناہ گزین مشرک کے متعلق یہ حکم دیتا ہے کہ اگر وہ قرآن سننے کے بعد اسے برضا و رغبت تسلیم نہ کرنا چاہے تو اُسے کچھ نہ کہو۔ اسے اپنی حفاظت میں اس کے ہاں پہنچا دو۔ اس کے برعکس، ہمارے ارباب شریعت کا فتویٰ یہ ہے کہ اگر ایک مسلمان ان باتوں سے مطمئن نہ ہو جنہیں وہ اسلام کہہ کر منوانا چاہتے ہیں اور اس لئے وہ انہیں تسلیم کرنے سے انکار کر دے تو اسے قتل کر دیا جائے گا۔

ہے۔ اسے ہم کسی دوسرے وقت پر اٹھا رکھتے ہیں۔ اس وقت صرف اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ وہ ان غیر فطری حدود و خطوط کو مٹا کر جن کی بنا پر انسان مختلف گروہوں اور قوموں میں بٹ رہا ہے، تمام انسانوں کی ایک عالمگیر برادری متشکّل کر دینا چاہتا ہے اور اس کی بنیاد ایک مشترکہ آئیڈیالوجی قرار دیتا ہے جسے دنیا کا ہر انسان علیٰ وجہ البصیرت اختیار کرے۔ جب تک ایسی فضا پیدا نہ ہو، وہ ان سرکش قوتوں کے مقابلے کے لئے، جو دوسروں پر ظلم کریں، جنگ کو ناگزیر قرار دیتا ہے — خواہ یہ ظلم جماعتِ مومنین کے خلاف ہو یا دنیا کے کسی اور انسان یا انسانوں کے گروہ کے خلاف — قرآنی نقطۂ نگاہ سے جنگ کا مقصود، دنیا سے ظلم مٹا کر اس کی جگہ نظامِ عدل و احسان قائم کرنا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے ترمذی کی ایک حدیث میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جنگ کا مقصد یہ ہے کہ ظالم کا ہاتھ پکڑ کر اُسے حق کے سامنے جھکا دیا جائے۔ اسی طرح بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ سے پوچھا گیا کہ ایک شخص مالِ غنیمت کے لئے لڑتا ہے، ایک شخص شہرت کے لئے لڑتا ہے، ایک شخص بہادری کے لئے لڑتا ہے، ایک شخص ذاتی انتقام کے لئے لڑتا ہے، ان میں سے کس کا جہاد صحیح ہے؟

اس کی عملی شکل

آپؐ نے فرمایا کہ

مَنْ قَاتَلَ لِتَکُوْنَ کَلِمَۃُ اللّٰہِ ھِیَ الْعُلْیَاءَ فَھُوَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ

جو اس لئے لڑتا ہے کہ دنیا میں خدا کا قانون غالب رہے، اس کی جنگ، اللہ کی راہ میں ہے۔

انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین صرف اپنے گروہ کے مفاد کا تحفّظ کرتے ہیں اور چونکہ انسان مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں، اس لئے ان کے باہمی مفاد میں تصادم ہوتا ہے اور اس کا لازمی نتیجہ جنگ ہے۔ خدا، ربّ العالمین — تمام انسانوں کا یکساں نشوونما دینے والا ہے۔ اس لئے اس کے عطا کردہ قوانین کی رُو سے تمام انسانوں کے مفاد کا تحفّظ ہو جاتا ہے اور یہی وہ بنیاد ہے جس پر امنِ عالم کی عمارت استوار ہو سکتی ہے۔ اس بنیاد کو توحید کہا جاتا ہے — یعنی تمام انسانوں پر ایک خدا کے قوانین کا اقتدار — جو نظام اس بنیاد پر متشکّل ہوتا ہے، اسے قرآنِ کریم دین کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی تمام انسانوں کے لئے ایک نظامِ زندگی۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کا احساس، اب رفتہ رفتہ، خود مغرب کے مفکّرین کو بھی ہوتا جا رہا ہے۔ مثلاً پروفیسر الفریڈ کوبن اپنی کتاب

(THE CRISES OF CIVILIZATION) میں، عصرِ حاضر کے ہمہ گیر اضطراب پر تفصیلی بحث کرنے کے بعد، آخر میں لکھتا ہے کہ

"دُنیا کے مصائب کا جو حل سامنے آرہا ہے وہ یہی ہے کہ ایک عالمگیر مملکت کی تشکیل کی جائے۔"

مسٹر ایمری ریوز (EMREY REVES) اس نکتہ کی وضاحت ان الفاظ میں کرتا ہے کہ

"کھُلے کھُلے الفاظ میں بیسویں صدی کی قیامت خیزیوں کے بعد انسان لامحالہ اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اس کرّۂ ارض کو کسی ایک اقتدار کے تابع لانا ضروری ہے۔ ہمارا فریضہ یہ ہے کہ ہم کسی نہ کسی طرح جمہوری انداز سے اس اقتدارِ واحد کی تشکیل کریں۔ اس کے لئے، ان بنیادی اصولوں کا اعلان کرنا چاہیئے جن پر یہ اقتدار قائم ہوگا۔ اور اس کے بعد لوگوں کو اس کی طرف راغب کرنا چاہیئے تاکہ یہ مقصود خوں ریزی کے بغیر حاصل ہو جائے۔" (ANATOMY OF PEACE)

یہ خیال اب دنیا کے چیدہ چیدہ مفکرین تک ہی محدود نہیں رہا، بلکہ عام ہوتا چلا جا رہا ہے۔ چنانچہ مسٹر (W.A. GAULD) اپنی کتاب (MAN, NATURE AND TIME) میں لکھتا ہے:-

"مجھے تسلیم ہے کہ "گھر اور وطن" کا خیال سب سے پہلے ہمارے سامنے آتا ہے، لیکن ایک عالمگیر انسانی معاشرہ کی رکنیت کا تصوّر ہماری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونا چاہیئے۔ ابھی تک اس قسم کے عالمگیر نظام کا احساس کچھ زیادہ شدّت سے اُبھر کر سامنے نہیں آیا۔ اس لئے اس کے متعلق زیادہ حسنِ ظن قبل از وقت ہوگا۔ لیکن یہ حقیقت کہ کم و بیش ہر ملک میں ایسے افراد موجود ہیں جن کے دل میں یہ خیال کروٹیں لے رہا ہے، اس امر کی ضمانت ہے کہ کچھ وقت کے بعد یہ خیال عملی شکل اختیار کرے گا۔"

اگر اس قسم کے عالمگیر نظام کا احساس زیادہ شدّت سے اُبھر کر سامنے نہیں آیا تو اس کی ذمّہ دار (فلہٰذا انسانیت کی بارگاہ میں مجرم) وہ قوم ہے جسے اس عالم گیر نظام کا تصوّر، آج سے چودہ سو سال پہلے دیا گیا تھا۔ قرآن نے اس زمانے میں کہا تھا کہ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً (۲/۲۱۳) انسانی معاشرہ کی آخری شکل یہی ہوتی ہے کہ تمام انسان ایک عالمگیر برادری بن جائیں۔ اس کے علاوہ دُنیا میں امن و سلامتی کی کوئی صورت نہیں۔ یہی وہ مقصد تھا جس کے لئے تمام نوعِ انسان کے لئے دین ——— یعنی نظامِ زندگی ———

بھی ایک تجویز کیا گیا۔ قرآن سے پہلے مختلف انبیاء کرامؑ۔۔۔۔ خاص قوموں کی طرف آتے تھے۔ نبی اکرمؐ کے متعلق ارشاد ہوا کہ قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا۔ (۷/۱۵۸) ان سے کہہ دو کہ میں تمام نوعِ انسان کی طرف رسول ہوں۔ یہی وہ بنیاد ہے، جس پر انسانوں کی عالمگیر برادری کی تشکیل ہوسکتی ہے۔ خود قرآنِ کریم کے متعلق بھی کہا گیا کہ يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُورِ (۱۰/۵۷) اے ساری دنیا کے انسانو! تمہارے پاس خدا کی طرف سے ایک ضابطۂ حیات آگیا ہے جس میں تمہاری تمام اُلجھنوں کا علاج ہے۔ انسانی مشکلات کا علاج ہی یہ ہے کہ تمام انسان ایک برادری کی شکل میں زندگی بسر کریں۔ اور اس کا طریق یہ ہے کہ ان سب کا ضابطۂ قوانین ایک ہو۔ یہ تھا وہ تصوّرِ حیات جو اُمّتِ مسلمہ کو چودہ سو سال پہلے دیا گیا تھا، لیکن اس نے اس تصوّر کو اس طرح پسِ پُشت ڈال رکھا ہے کہ آج جب کہ دُنیا کی دیگر اقوام کے دل میں یہ خیال، کسی نہ کسی انداز سے، کروٹیں لے رہا ہے، یہ اس سے اس طرح بے بہرہ ہے گویا اس کی آواز تک کبھی اس کے کانوں میں نہیں پڑی تھی۔ لیکن قرآن کے ان تصوّرات پر کسی خاص قوم کی اجارہ داری تھوڑی ہے کہ کوئی دوسرا ان میں شریک نہیں ہوسکتا۔ یہ تو سورج کی روشنی کی طرح، فضائے عالم میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جس کا جی چاہے ان سے بہرہ یاب ہو جائے۔

هست این میکده و دعوتِ عام است این جا
قسمتِ باده باندازۂ جام است این جا!

پاکستان کا خطّۂ زمین اسی مقصد کے لئے حاصل کیا گیا تھا کہ یہ اس عالمگیر نظامِ انسانیت کا اوّلین گہوارہ بنے اور یہاں سے اس شجرِ طیّب کی شاخیں پھوٹیں جو دنیا کے ستائے ہوئے انسانوں پر امن و سلامتی کا سایہ کریں۔

اِس نظام کا گہوارہ

یہی وہ نظام تھا جس کے متعلق اعلان کیا گیا تھا کہ مَنْ دَخَلَهُ كَانَ اٰمِنًا (۳/۹۶) جو اس میں داخل ہوگیا اُسے امن نصیب ہو جائے گا۔ اور جس کی خصوصیّت یہ بتائی گئی تھی کہ قِيَامًا لِلنَّاسِ (۵/۹۷) یہ انسانیت کے قیام کا باعث ہے۔ یہی وہ امنِ عالم کی ضمانت دینے والا نظام ہے کہ اگر سرکش قوتیں، عالمگیر مفادِ انسانیت کے خلاف، اپنے ذاتی مفاد کی خاطر، اس کے قیام کی راہ میں سنگِ گراں بن کر حائل ہو جائیں تو انہیں راستے سے ہٹایا جائے اور اس کے لئے اگر جنگ ناگزیر ہو تو اُسے اسی طرح روا رکھا جائے جس طرح ڈاکٹر ایسی انگلی کو مجبوراً کاٹ ڈالتا ہے جس کا

ناسور لاعلاج ہو چکا ہو اور جس کا زہر سارے جسم میں سرایت کئے جا رہا ہو۔ قرآن، قوت کے استعمال کی اسی مقصد کے لئے اجازت دیتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ ہیں۔

تاریخِ امم کا یہ پیامِ ازلی ہے صاحب نظراں! نشۂ قوت ہے خطرناک
اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک
لادیں ہو تو ہے زہرِ ہلاہل سے بھی بڑھ کر ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاک

"دین کی حفاظت" سے مراد ہی عالمگیر انسانیت کے نظامِ امن و سلامتی کی حفاظت ہے۔ اسلام میں اسی مقصد کے لئے جنگ کی اجازت ہے۔ جو جنگ، استبداد اور جوع الارض کی تسکین کے لئے کی جائے، وہ جنگ حرام ہے۔

صلح شر گردد چو مقصود است غیر گر خدا باشد غرض، جنگ است خیر
گر نہ گردد حق ز تیغِ ما بلند!!
جنگ باشد قوم را نا ارجمند (اقبالؒ)

(۱۹۶۳ء)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بنیادی حقوقِ انسانیّت
اور
قرآن

(طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۶۳ء)

علمائے حیاتیات اور علم النفس، اس پر متفق ہیں کہ تحفّظِ خویش (SELF-PRESERVATION) کا جذبہ، ہر ذی حیات میں جبلّی طور پر پایا جاتا ہے۔ بلکہ یوں کہیئے کہ جبلّی جذبات میں اسے بنیادی حیثیّت حاصل ہے۔ اسی جذبہ کا تقاضا ہے کہ انسان اپنی ہر متاعِ عزیز کو محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔ جب انسانوں نے مِل جُل کر تمدّنی زندگی بسر کرنی شروع کی تو ان کے مفاد میں تصادم ہونے لگا۔ اس سے افراد نے محسوس کیا کہ انفرادی زندگی بسر کرنے سے ان کی وہ چیزیں محفوظ نہیں رہ سکتیں، جنہیں وہ اپنی متاعِ عزیز اور سرمایۂ گراں بہا سمجھتے ہیں۔ اس کے لئے انہوں نے اجتماعی نظم و نسق کا تصوّر وضع کیا، جسے اب حکومت کہا جاتا ہے۔ اس نظمِ اجتماعی کا مقصدِ اوّلیں یہ تھا کہ افراد کی وہ چیزیں محفوظ رہیں جنہیں وہ اپنا حق سمجھتے تھے۔

حکومت کی بنیاد

حکومت کی بنیاد تو اس مقصد کے ماتحت رکھی گئی تھی، لیکن تھوڑے سے ہی عرصے کے بعد یہ تلخ حقیقت سامنے آگئی کہ حکمران طبقہ کے ہاتھوں لوگوں کا کوئی حق بھی محفوظ نہیں رہا۔ اس طبقہ نے تقسیم یوں کی کہ حقوق

سب کے سب اربابِ حکومت کے ہیں اور ذمہ داریاں تمام کی تمام رعایا کی۔ لوگ اس تقسیم کو گوارا نہ کرتے۔

حقوق طبقۂ حکمران کے

لیکن مذہبی پیشوائیت آگے بڑھی اور یہ کہہ کر عوام کو اس تقسیم کے سامنے جھکا دیا کہ راجہ ایشور کا اوتار ہوتا ہے۔ بادشاہ خدائی حقوق (DIVINE RIGHTS) کا حامل ہوتا ہے۔ سلطان، زمین پر خدا کا سایہ ہوتا ہے۔ اس لئے فرمانروائی اس کا حق اور اطاعت گذاری تمہارا فریضہ ہے۔ وہ جو کچھ تمہیں دے اس کی عنایت اور احسان ہے۔ تم اس سے بطورِ حق کچھ نہیں مانگ سکتے۔ تم اس کے حضور جھکو۔ اسے سجدے کرو۔ اس کی خیریت کی دعائیں مانگو۔ اس کے ہر حکم کی اطاعت کرو اور اس اطاعت کو اپنے لئے سرمایۂ ہزار سعادت سمجھو۔ تم اور جو کچھ تمہارا ہے وہ اُس سب کا مالک ہے۔ اسے ان تمام چیزوں پر کُلّی اختیار حاصل ہے۔ وہ تمہارا اَن داتا (رزّاق) اور پالن ہار (پروردگار) ہے۔ تم اس سے خیرات مانگ سکتے ہو، کوئی شے بطورِ حق کے طلب نہیں کر سکتے۔

حاکم اور محکوم کے باہمی تعلّق کا یہ تصوّر اسی طرح چلا آ رہا تھا کہ سترہویں صدی عیسوی میں یورپ کے سیاسی نظریات میں ایک انقلاب آیا جس کی رُو سے اس تعلّق کو ازسرِ نو متعیّن کرنے کی کوشش کی گئی۔ کہا یہ گیا کہ ان دونوں (فریقوں) کا تعلّق، ایک معاہدہ کی رُو سے متعیّن ہونا چاہیئے۔ اسے نظریّۂ میثاق (CONTRACT THEORY) کہا جاتا ہے۔ اس نظریہ کی بنیاد اس مفروضہ پر ہے کہ

(۱) تمدّنی زندگی بسر کرنے سے پہلے انسان فطری حالت پر تھا۔

(۲) اس فطری حالت میں انسان کے کچھ حقوق تھے، جنہیں ہنوز کسی نے غصب نہیں کیا تھا۔

(۳) جب انسان کو اپنے فطری حقوق کے تحفّظ کے متعلق خطرہ لاحق ہوا تو اس نے معاشرتی زندگی اختیار کی۔ لہٰذا، معاشرہ (سوسائٹی) کا وجود انسان کے فطری حقوق کے تحفّظ کے جذبہ کا رہینِ منّت ہے۔

(۴) بنابریں، معاشرہ کا فریضہ ہے کہ انسان کے فطری حقوق کا تحفّظ کرے۔

(۵) ان فطری حقوق کا نام ہے "بنیادی حقوقِ انسانیت"

مغربی مفکّرین کے نظریات

اس نظریّہ کا اوّلین داعی، یورپ کا مشہور مفکّر ہابز (HOBBES-1588-1679) تھا۔ وہ کہتا ہے کہ اپنے حکم کو دوسروں سے منوانا، انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی "قیامِ امن" بھی انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ لیکن یہ دونوں باتیں یک جا نہیں رہ سکتیں۔ جب ہر فرد اپنا حکم،

دوسروں سے منوانے پر تل جائے تو امن کہاں باقی رہ سکتا ہے؟ لہٰذا انسان کو اس دوسرے مقصد کے حصول کے لئے اپنے پہلے حق سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ بنابریں، ہابز کے نزدیک، قیامِ امن انسان کا واحد بنیادی حق ہے جس کے لئے وہ اپنے دیگر حقوق سے دستکش ہو جاتا ہے۔

نظریۂ میثاق کا دوسرا علمبردار لاک (LOCKE-1632-1704) ہے۔ اس کے نزدیک، انسان کے بنیادی حقوق "زندگی، صحت، آزادی اور املاک ہیں"۔ ان کے تحفّظ کے لئے انسان صرف اپنا ایک حق چھوڑتا ہے اور وہ ہے متنازعہ فیہ معاملات میں خود فیصلہ کرنے کا حق۔ لاک کہتا ہے کہ افراد کو چاہیئے کہ اپنے اس حق کو معاشرہ کے سپرد کر دیں۔ اور اس کے بعد معاشرہ کا فریضہ ہے کہ وہ افراد کے دیگر حقوق کا تحفّظ کرے۔

چونکہ ہابز اور لاک کے ہاں، بنیادی حقوق کا تصوّر، ان کے نظریۂ میثاق کی ایک ذیلی شق کے طور پر آتا ہے اس لئے یہ چنداں واضح اور متعیّن نہیں۔ اسے ایک جداگانہ اور مستقل نظریّہ کی حیثیّت سے (TOM PAINE-1737-1809) نے پیش کیا جس کی کتاب (RIGHTS OF MAN) آج بھی دلچسپی سے پڑھی جاتی ہے۔ اس نے زندگی، آزادی، املاک، حفاظت اور استبداد کی روک تھام کو بنیادی حقوقِ انسانیّت قرار دیا ہے۔ یہی تھے وہ حقوق جنہیں انقلابِ فرانس کے بعد، فرانس کی نیشنل اسمبلی نے اپنے چارٹر میں درج کیا تھا۔ امریکہ کا منشورِ آزادی (۱۷۷۶ء) بھی بین ہی کے فطری حقوق کے نظریّہ پر مبنی تھا۔ اس میں زندگی اور آزادی کے ساتھ "حصولِ مسرّت کو بھی بنیادی حق تسلیم کیا جاتا ہے۔ ۱۹۱۸ء میں روس کی کانگریس نے مزدوروں اور کسانوں کے سلسلہ میں بنیادی حقوق کا ایک منشور مرتّب کیا جس میں کہا گیا کہ اس منشور سے مقصود یہ ہے کہ ایک انسان، کسی دوسرے انسان کو نہ لوٹ سکے، معاشرہ کی طبقاتی تقسیم کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے اور تمام ممالکِ عالم میں معاشرہ کی تشکیل اشتراکی خطوط پر کی جائے"۔

مجلسِ اقوامِ متحدہ

کچھ عرصہ ہوا مجلسِ اقوامِ متحدہ (U.N.O.) نے (HUMAN RIGHTS COMMISSION) کے نام سے ایک تحقیقاتی بورڈ قائم کیا تھا کہ وہ تحقیق کے بعد سفارشات کرے کہ انسانیّت کے بنیادی حقوق کیا ہیں۔ ان سفارشات کو اقوامِ عالم کی نمائندہ جماعت (U.N.O) نے خود جانچا اور پرکھا۔ اس کے بعد ۱۹۴۸ء میں وہ چارٹر شائع کیا۔ جسے "منشورِ حقوقِ

انسانیت" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اقوامِ متحدہ کی اس کوشش کو، اس وقت تک، اس باب میں حرفِ آخر سمجھا جاتا ہے۔ جو حقوق اس چارٹر میں درج ہیں وہ مختصر الفاظ میں حسبِ ذیل ہیں:۔

۱۔ تمام انسان آزاد پیدا ہوتے ہیں اور بنیادی حقوق کے یکساں حق دار ہیں۔
۲۔ زندگی، آزادی اور حفاظتِ جان کا حق۔
۳۔ غلامی کی ممانعت۔
۴۔ بے رحمی کے سلوک سے حفاظت کا حق۔
۵۔ قانون کے معاملہ میں یکساں سلوک کا حق۔
۶۔ کسی شخص کو بلاقصور گرفتار نہیں کیا جائے گا، نہ نظر بند یا جلاوطن کیا جائے گا۔
۷۔ جب تک الزام ثابت نہ ہو، ملزم کو بے قصور تصوّر کئے جانے کا حق۔
۸۔ مسائلِ زندگی اور خط و کتابت میں عدم مداخلت کا حق۔
۹۔ نقل و حرکت کی آزادی۔
۱۰۔ ایک ملک کو چھوڑ کر دوسرے ملک میں بسنے کی آزادی۔
۱۱۔ حقِ قومیت۔
۱۲۔ شادی کا حق۔
۱۳۔ حقوقِ جائیداد۔
۱۴۔ خیالات، ضمیر اور مذہب کی آزادی، نیز اظہارِ خیالات اور اجتماعات میں شرکت کی آزادی۔
۱۵۔ اپنے ملک کی حکومت میں شرکت کا حق۔
۱۶۔ تعمیرِ خویش کے لئے وسائل و ذرائع کی آزادی۔
۱۷۔ حسبِ منشاء کام کاج کی آزادی۔
۱۸۔ آرام اور فرصت کی آزادی، نیز معیارِ زندگی اور تعلیم کا حق۔
۱۹۔ جماعتی اور ثقافتی زندگی میں شرکت کا حق۔

یہ ہے مختصراً ان حقوق کی فہرست جسے اقوامِ عالم کے نمائندگان نے اپنے مسلّمہ چارٹر میں داخل کر رکھا ہے۔ ان حقوق سے کن شرائط کے ماتحت بہرہ یاب ہوا جا سکتا ہے، اس کے متعلق ذرا آگے چل کر ذکر کیا جائے گا۔ سرِ دست

اتنا اضافہ کافی ہوگا کہ اس فہرست کے بعد چارٹر میں یہ تحریر ہے کہ ان حقوق اور اختیارات کو ان حدود کے تابع استعمال کیا جا سکتا ہے، جو مختلف ممالک میں از روئے قانون عائد کی جائیں ——— چونکہ اپنی اپنی مرضی کے مطابق قوانین سازی کا حق ہر ملک کو حاصل ہے، اس لئے ان قوانین کے تابع بنیادی حقوقِ انسانیت کی جو حیثیت رہ جاتی ہے، وہ ظاہر ہے۔

یہ ہے اجمالی سا تذکرہ ان کوششوں کا جو انسان کے بنیادی حقوق متعین اور تسلیم کرنے کے سلسلے میں انسانی فکر نے آج تک کی ہیں۔ اب ان کے مقابلہ میں اس ضابطۂ حقوق کو سامنے لائیے جو چھٹی صدی عیسوی میں جب

قرآن کا اعلان

دنیا، انسان کے بنیادی حقوق کے تصوّر تک سے نا آشنا تھی ——— تمام نوعِ انسان کی راہ نمائی کے لئے خدا کی طرف سے دیا گیا اور جس پر عمل کر کے اس ضابطۂ آسمانی کے لانے والے پیغمبرِ آخر الزّمانؐ نے، دنیا کو پہلی بار اس حقیقتِ کبریٰ سے روشناس کرایا کہ دنیا میں انسان کا مقام کیا ہے اور اس کے وہ حقوق کیا جنہیں دنیا کی کوئی طاقت چھین نہیں سکتی۔ ان حقوق کا تفصیلی تذکرہ، اس مختصر سے وقت میں مشکل ہے، اس لئے میں ان کے اجمالی تعارف پر ہی اکتفا کروں گا۔

سب سے پہلے اس بات کو دیکھئے کہ نظریۂ میثاق، جسے عصرِ حاضر کی سیاسی فکر کا معرکہ آرا کارنامہ قرار دیا جاتا ہے، اس کا تصور بھی قرآنِ کریم ہی نے پیش کیا تھا۔ لیکن وہ اس میثاق کو حاکم اور محکوم میں استوار نہیں کرتا۔

قرآنی نظریۂ میثاق

اس کے نزدیک انسانوں میں حاکم اور محکوم کا تصوّر ہی باطل ہے۔ جیسا کہ میں ذرا آگے چل کر بیان کروں گا، اس کی رُو سے، کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں پر حکومت کرے۔ وہ اس میثاق کو خدا اور بندے کے درمیان معاہدہ قرار دیتا ہے۔ لیکن چونکہ اس میثاق کے لئے خدا خود بندوں کے سامنے نہیں آتا اس لئے یہ میثاق افراد اور اس معاشرہ کے درمیان طے پاتا ہے جو نظامِ خداوندی کو متشکل کرنے کے لئے وجود میں آتا ہے۔ میثاق کے الفاظ یہ ہیں کہ

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ط (۹/۱۱۱)

افرادِ معاشرہ اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ اگر دنیا میں نظامِ عدل و احسان کے قیام اور استحکام کی خاطر ضرورت پڑے تو ان کا مال اور ان کی جان، اس مقصد کے لئے نظامِ خداوندی کے سپرد ہوں گے اور نظامِ خداوندی (یا معاشرہ) ان سے وعدہ کرتا ہے کہ وہ انہیں، اس کے عوض "اَلْجَنَّۃ" عطا کرے گا۔ اس دنیا میں بھی جنّت کی زندگی

اور اُخروی زندگی میں بھی جنّت۔ جہاں تک اس دنیا کا تعلق ہے اَلْجَنَّۃ میں وہ تمام خوش حالیاں اور خوش گواریاں، سرفرازیاں اور سربلندیاں، اطمینان اور سکون، امن اور سلامتی، غرضیکہ وہ سب کچھ آتا ہے جس کی انسان آرزو کر سکتا ہے۔ اس میثاق کی رُو سے ان تمام چیزوں کا حصول، ان لوگوں کا بنیادی حق ہو جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے جنّتی معاشرہ کی جو تفاصیل بیان کی ہیں اگر میں ان کا ذکر کروں تو اس سے ایک ایسی جامع فہرست مرتّب ہو جائے گی جسے ان افرادِ معاشرہ کے بنیادی حقوق کا چارٹر سمجھا جائے گا، لیکن میں اس وقت اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ اس لئے کہ یہ حقوق ان لوگوں کے ہوں گے جو اُس میثاقِ خداوندی کا ایک فریق ہوں گے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ اور میرا موضوع ان حقوق سے متعلّق ہے جو قرآن کی رُو سے دنیا کے ہر انسان کو محض انسان ہونے کی حیثیّت سے حاصل ہیں۔ یہ حقوق کسی معاہدہ

قرآنی حقوقِ انسانیت

یا میثاق سے مشروط نہیں ہوں گے نہ کسی خدمت کا معاوضہ۔ یہ بلا مشروط ہوں گے اور بلا مزدُ و معاوضہ، ہر انسان کو —— بلاتخصیصِ مذہب، ملّت، زبان، رنگ، نسل، وطن، محض انسان ہونے کی جہت سے حاصل ہوں گے۔ دیکھئے یہ حقوق کیا ہیں؟ جنہیں ہر انسان قرآنی معاشرہ سے، ہر وقت طلب کر سکتا ہے۔

(۱) احترامِ آدمیّت

پہلا حق یہ ہے کہ ہر انسانی بچّہ، پیدائش کے اعتبار سے یکساں طور پر عزّت کا مستحق ہے۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰) قرآن کا ارشاد ہے، یعنی ہم نے تمام فرزندانِ آدم کو واجب التکریم پیدا کیا ہے۔ اگر حسب و نسب کے اعتبار سے کسی انسان کو بہ نظرِ حقارت دیکھا جائے اور دوسرے کو زیادہ واجب العزّت سمجھا جائے، یا خاندانی نسبت کی بنا پر کسی سے، کسی قسم کی رعایت برتی جائے تو یہ تفریق و تخصیص جس انسان کے خلاف جائے اُسے حق حاصل ہو گا کہ وہ اس کا مداوا طلب کرے اور قرآنی معاشرہ کا فریضہ ہو گا کہ وہ اس کے نقصان کی تلافی کرے۔ 'آدمیّت احترامِ آدمی' قرآن کا پہلا اصول، اور ہر انسان کا اوّلین بنیادی حق ہے۔

(۲) جنسی مساوات

قرآن کی رُو سے جنسی تفریق نہ وجہِ ذلّت ہے نہ باعثِ امتیاز' یعنی نہ مرد محض مرد ہونے کی حیثیّت سے

عورتوں سے افضل ہیں اور نہ ہی عورتیں، محض عورت ہونے کی بنا پر، مردوں سے کہتر۔ زندگی کی ابتدا نفسِ واحدہ سے ہوئی ہے (خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ۔ ۴/۱) قرآن کا ارشاد ہے۔ ہر انسانی بچہ ہیں، خواہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی ——— کچھ حصہ مرد کا ہوتا ہے اور کچھ حصہ عورت کا ——— اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى ۔ (۴۹/۱۳) اس لئے نہ مرد، عورتوں سے الگ کوئی نوع ہیں نہ عورتیں، مردوں سے الگ کوئی جنس۔ دونوں نوعِ انسان کے افراد ہیں اور جس مقام کا مستحق ایک انسان ہے اس میں مرد اور عورت دونوں یکساں طور پر شریک ہوتے ہیں۔ زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس کے دروازے ایک صنف کے لئے کھلے رکھے جائیں اور دوسری پر بند کر دیئے جائیں۔ حیاتیاتی طور پر (BIOLOGICALLY) مرد اور عورت کی ساخت میں جو فرق ہے اس کا تعلق ان کے طبیعی وظائفِ حیات سے ہے۔ انسانیت کی سطح پر دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ اس میں عمل کا میدان دونوں کے لئے یکساں ہے اور اعمال کے نتائج بھی یکساں لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ (۳/۱۹۴) تم میں سے کسی کام کرنے والے کے کام کا اجر ضائع نہیں ہو سکتا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ مرد اور عورت کی تخصیص کے معنی کیا؛ تم ایک دوسرے کے اجزا ہو۔ تم خلقت اور سیرت کے اعتبار سے ایک ہو۔ زندگی کے تمام معاملات میں یکساں طور پر شریک رہتے ہو۔ تم ایک نوع کے فرد ہو۔ پھر اعمال کے نتائج میں فرق کس طرح ہو سکتا ہے؟

لہٰذا جنسی مساوات، انسانیت کا بنیادی حق ہے جسے کسی صورت میں بھی غصب نہیں کیا جا سکتا۔ قرآنی معاشرہ اس حق کو برقرار رکھنے کا ذمہ دار ہے۔

(۳) مدارج علیٰ قدرِ اعمال

احترامِ آدمیت کے بعد، معاشرہ میں مختلف افراد کے مدارج کا سوال سامنے آتا ہے۔ اس کے لئے اصول یہ ہے کہ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۔ (۴۶/۱۹) ہر ایک کا درجہ اور مرتبہ، اس کے اعمال و کردار کے مطابق متعین کیا جائے گا۔ یعنی سب سے پہلے ہر انسان کی عزت بہ حیثیتِ انسان ہوگی اور اس کے بعد اس کے جوہرِ ذاتی اور حسنِ سیرت و کردار کو دیکھا جائے گا اور ان کے مطابق سوسائٹی میں ہر ایک کا مقام اور درجہ مقرر کیا جائے گا۔ جو جتنی زیادہ خوبیوں کا مالک، وہ اتنے ہی اونچے مقام کا مستحق حتیٰ کہ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (۴۹/۱۳) جو

سب سے زیادہ حسنِ عمل کا پیکر، وہ سب سے زیادہ واجب العزت۔ نیچے سے اوپر تک معزت کا ہر مقام ہر شخص کے لئے کھلا ہوگا جسے وہ اپنی قابلیت اور حسنِ سیرت کی رُو سے بطورِ حق حاصل کر سکے گا۔ اس کا یہ حق اس سے کوئی نہیں چھین سکتا، نہ ہی تعیّنِ مدارج کا کوئی اور معیار مقرر کیا جا سکتا ہے۔

(۴) حقِ آزادی

"آزادی ہر شخص کا پیدائشی حق ہے"۔ یہ نعرہ اور اعلان تو آپ نے ہر جگہ سے بلند ہوتا سنا ہوگا، لیکن اس کا صحیح مفہوم بہت کم سامنے آیا ہوگا۔ جس جگہ سے آپ نے یہ نعرہ بلند ہوتے دیکھا ہوگا، وہیں سے آپ نے آئے دن ایسے احکام نافذ ہوتے بھی دیکھے ہوں گے جو ہر شخص کی آزادی پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کرتے چلے جائیں۔ لہٰذا یہ بات کسی کی سمجھ میں ہی نہیں آتی کہ اگر آزادی، انسان کا پیدائشی حق ہے، تو پھر اس پر یہ پابندیاں کیوں عائد کی جاتی ہیں۔ اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ یہ پابندیاں قانون کی رُو سے عائد کی جاتی ہیں اور قانون کی رُو سے عائد کردہ پابندیاں، انسانی آزادی کو سلب نہیں کرتیں۔ اس لئے کہ اگر پابندیاں عائد نہ کی جائیں تو کسی کا کچھ بھی محفوظ نہ رہے۔ لہٰذا صحیح آزادی کے لئے قانونی پابندیاں لاینفک ہیں۔ یہ درست ہے کہ معاشرہ کے قیام اور افراد کی حفاظت کے لئے قانونی پابندیاں ضروری ہیں، لیکن یہ بھی تو ظاہر ہے کہ اربابِ اقتدار جنہیں قانون سازی کا اختیار حاصل ہوتا ہے، جس قدر ظلم اور زیادتی، قانون کے پردے میں کر سکتے ہیں، لاقانونیت کا استبداد اس کے سامنے ہیچ ہوتا ہے۔ لاقانونیت کے دور میں یہ استبداد کھلے بندوں ہوتا تھا اور اس دورِ دستور و آئین میں یہ، قانون کے پردے میں ہوتا ہے۔ صاحبِ اقتدار طبقہ نے جو کچھ کرنا ہوتا ہے اس کے لئے وہ پہلے قانون سازی کی رسم ادا کر لیتا ہے۔ اور پھر یہ، شاہ مدار کی بسم اللہ پڑھ کر پھونکی ہوئی چھری، جس جانور کے گلے پر پھیر دی جائے، وہ ذبیحہ حلال قرار پا جاتا ہے[1]، یہ سوال بڑا

---

[1] یو۔پی (بھارت کا موجودہ صوبہ اُتر پردیش) کے عام دیہات میں یہ رواج تھا ـــــ شاید اب بھی ہو ـــــ کہ گاؤں کا جاہل ملّا جسے ذبح کے وقت تکبیر پڑھنی نہیں آتی تھی ایک چھری شاہ مدار کی خانقاہ پر لے جاتا۔ وہاں کا مجاور بسم اللہ پڑھ کر چھری پھونک دیتا۔ اس چھری سے جو جانور ذبح کیا جاتا اُسے حلال سمجھ لیا جاتا۔ سال کے بعد پھر چھری کی تجدید کرالی جاتی۔

اہم اور بنیادی ہے جس کا دنیا کو آج تک خاطر خواہ حل نہیں مل سکا کہ انسانی آزادی اور قانون کی پابندی میں ایسی مفاہمت کی صورت کس طرح پیدا کی جائے کہ قانونی پابندیاں بھی اپنی جگہ قائم رہیں اور افراد کے حقوق بھی پامال نہ ہوں۔ اس کا حل قرآنِ کریم نے بتایا۔ اس نے اس ضمن میں پہلے یہ واضح کر دیا کہ مَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّؤْتِیَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ یَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۳/۷۸) کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں، خواہ اسے کتاب اور حکومت اور نبوّت بھی کیوں نہ ملی ہو کہ وہ لوگوں سے کہے کہ وہ اس کے محکوم اور تابع فرمان ہو جائیں۔

قرآنِ کریم کے اس اعلانِ عظیم نے انسانی آزادی کا ایسا بلند منشور عطا کر دیا جس کا تصوّر بھی ذہنِ انسانی نہیں کر سکتا تھا؎۔ یہ تو رہی کامل آزادی کی شکل۔ اب قانونی پابندی کو دیکھئے۔ اس کے لئے اسی آیت میں پہلے "مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ" کہہ کر یہ بات سمجھائی گئی کہ افراد کی آزادی پر پابندیاں لگانا تو ضروری ہے لیکن یہ پابندیاں کوئی انسان نہیں لگا سکتا۔ اس کا حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ خدا کی طرف سے یہ پابندیاں کس طرح لگائی جائیں گی۔ کیا یہ وہی تھیاکریسی ہوگی جس میں مذہبی پیشوائیت خدا کے نام کی آڑ میں ہر قسم کی من مانی کرتی ہے؟ قرآن نے کہا کہ بالکل نہیں۔ تھیاکریسی تو استبداد کی بدترین شکل ہے۔ اسی لئے اس نے فرعون کے ساتھ ہامان کو بھی برابر کا مجرم قرار دیا ہے جو مذہبی پیشوائیت کا نمائندہ تھا۔ قانونی پابندیوں کے لئے اس نے کہا کہ

وَ لٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِیّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (۳/۷۸)

خدا نے ان حدود اور پابندیوں کو، جو انسانی آزادی پر عائد کی جائیں گی، اپنی کتاب میں وضاحت سے بیان کر دیا ہے۔ کسی کو حق حاصل نہیں ہوگا کہ ان پابندیوں میں کسی قسم کی کمی بیشی کر سکے، یا ان کے علاوہ کوئی اور پابندی عائد کرے۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا عملی مفہوم ہی یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی اور کو یہ اقتدار اور اختیار نہیں کہ وہ کسی انسان کو اپنا محکوم اور تابع فرمان (چہ جائیکہ غلام) بنا سکے۔ اب رہا یہ کہ کتاب اللہ

؎ ظاہر ہے کہ جو قرآن ایک انسان کو دوسرے انسان کا محکوم بنانے کی بھی اجازت نہیں دیتا، وہ ایک انسان کو دوسرے انسان کا غلام بنانے کی اجازت کب دے گا۔ قرآن نے غلامی کو ختم کر دیا تھا۔ اس کی وضاحت "انسان اور جنگ" کے عنوان میں کی جا چکی ہے۔

میں بیان کردہ حدود اور پابندیوں کی عملی تشکیل اور تنفیذ کی صورت کس طرح متعین کی جائے تو اس کے لئے واضح طور پر بتا دیا گیا کہ یہ حق بھی کسی خاص گروہ اور جماعت کو نہیں دیا گیا، بلکہ یہ تمام افرادِ معاشرہ کا اجتماعی فریضہ ہے۔ یہ امور ان کے باہمی مشورے سے طے پائیں گے ـــــ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ۔ (۴۲/۳۸) یہ حقِ مشاورت بھی، بنیادی حقوق کی فہرست میں داخل ہے جس میں مرد اور عورت، امیر اور غریب، سب شریک ہیں۔ اس مشاورت کی عملی مشینری، اپنے اپنے حالات کے مطابق خود مرتب کی جاسکتی ہے۔

لہٰذا، قرآنِ کریم نے یا تو وہ قوانین دے دیئے ہیں جن کی پابندی کرائی جائے گی اور یا وہ حدود متعین کر دی ہیں جن کے اندر رہتے ہوئے افرادِ معاشرہ، باہمی مشاورت سے وقتاً فوقتاً قوانین مرتب کر سکیں گے۔ ان حدود سے تجاوز کرنے یا ان کے علاوہ اور حدود و قیود متعین کرنے کا حق کسی کو حاصل نہیں ہوگا کیونکہ یہ انسانی آزادی کو سلب کر لینے کے مرادف ہوگا جس کی اجازت کسی انسان کو نہیں دی جاسکتی۔ اسے وہ شرک قرار دیتا ہے۔ سورۂ شوریٰ میں ہے۔ اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ (۴۲/۲۱) کیا ان کے کوئی اور شریک ہیں جو ان کے لئے دینِ خداوندی میں ایسے قوانین بناتے ہیں جن کی اجازت خدا نے نہیں دی۔ لہٰذا انسانی معاشرہ کے لئے کوئی ایسا قانون مرتب نہیں کیا جاسکتا جس کی اجازت قرآن نے نہ دی ہو۔

یہ ہے وہ طریق جس سے قرآنِ کریم، انسانی آزادی پر بھی کوئی حرف نہیں آنے دیتا اور اس کے ساتھ ہی، معاشرہ میں لاقانونیت بھی نہیں پھیلنے پاتی۔ یہ قرآن کے منشورِ حقوقِ انسانیت کی منفرد خصوصیت ہے۔

(۵) حقِ محنت

قرآن کا ارشاد ہے کہ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ ـــــ (۳۹/۷۰) ہر شخص کو اس کے کام کا پورا پورا معاوضہ ملے گا۔ کوئی کسی کی محنت کے ماحصل کو نہ غصب کر سکے گا نہ اس میں کمی۔ اسی سلسلے میں اس نے دوسری طرف یہ کہہ دیا کہ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (۵۳/۳۹) بجز ان لوگوں کے جو کام کرنے سے معذور ہوں (جن کا ذکر آگے چل کر آتا ہے) کوئی شخص محنت اور کوشش کے بغیر کچھ حاصل نہیں کر سکے گا یعنی اس معاشرہ میں، ایسے خون آشام طبقہ (PARASITES) کے لئے قطعاً گنجائش نہیں ہوگی جو دوسروں کی محنت پر تن آسانی اور عیش پرستی کی زندگی بسر کریں اور یہ ظاہر ہے کہ جب کوئی کسی کی محنت کو سلب (EXPLOIT) نہیں کر سکے گا، تو ہر کام کرنے والا اپنی محنت کے ماحصل کا حقدار ہوگا۔ (تفصیل اس کی میری کتاب، نظامِ ربوبیت، میں ملے گی)۔

(۶) عدل و احسان

اسی کا نام عدل ہے، یعنی ہر شخص کو اس کا حق مِل جانا۔ قرآن کی رُو سے عدل ایک بڑی جامع اصطلاح ہے جس میں ہر قسم کے حقوق کا تحفّظ شامل ہے۔ جیسے ہم قانونِ عدل کہتے ہیں اس سے بھی یہی مقصد ہوتا ہے کہ اگر کسی کا کوئی حق غصب ہوتا ہو، تو عدالت کی مشینری اسے وہ حق دلا دے۔ عدل کے معاملہ میں قرآن اتنا محتاط اور جزرس ہے کہ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ دیکھنا! اس باب میں دوست اور دشمن میں تمیز نہ کرنے لگ جانا۔ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی قوم کی طرف سے دشمنی کا برتاؤ تمہیں اس پر آمادہ کر دے کہ تم اس کے ساتھ عدل نہ کرو۔ اِعْدِلُوْا۔ وہ کچھ بھی کریں، تم ان کے ساتھ عدل کرو۔ اس لئے کہ یہ ادلے بدلے کی بات نہیں، یہ انسان ہونے کی حیثیت سے ان کا حق اور اس کی ادائیگی تمہارا فریضہ ہے۔ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (۵/۸)

لیکن قرآن عدل تک ہی نہیں رہتا، اس سے بھی آگے جاتا ہے۔ (جیسا کہ ابھی کہا جا چکا ہے) عدل سے مراد یہ ہے کہ جو کچھ کسی کا واجب (DUE) ہو وہ اسے دے دیا جائے۔ لیکن اگر اس سے کسی کی ضروریات پوری نہ ہوتی ہوں اس میں کمی رہ جاتی ہو تو پھر کیا ہو؟ قرآن کہتا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (۱۶/۹۰) اس صورت میں تم اس کمی کو پورا کرو اس کے، اور خود معاشرہ کے توازن کو بگڑنے سے بچاؤ۔ اسے احسان کہتے ہیں۔ یہ بھی بنیادی حقوقِ انسانیت میں شامل ہے۔ دنیا ایسے مواقع پر خیرات کی تلقین کرتی ہے لیکن خیرات سے جس طرح شرفِ انسانیت پامال ہوتا ہے اور خیرات لینے والے کی عزتِ نفس جس طرح مجروح ہوتی ہے وہ ظاہر ہے۔ اس لئے قرآن نے احسان کو خیرات نہیں قرار دیا بلکہ کہا ہے کہ جس کی کمی رہ جائے وہ اس کمی کو پورا کرنے کے اسباب و ذرائع بطور حق طلب کر سکتا ہے۔ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ۔ (۷۰/۲۴-۲۵) وہ لوگ جن کی محنت سے ان کی ضروریات پوری نہ ہوں یا جو محنت کرنے سے معذور ہوں، ان کا، ان لوگوں کے مال میں حق ہے جن کے پاس ان کی ضروریات سے زیادہ ہے اور یہ حق ڈھکا چھپا نہیں، قرآنی معاشرہ میں سب کو معلوم ہے۔ افراد کی ہر قسم کی کمی پوری کرنے کو بنیادی حقوق کی فہرست میں شامل کرنا قرآن کے سوا آپ کو کہیں نظر نہیں آئے گا۔

(۰)

(۷) رزق کا حق

انسان (ہر ذی حیات) کی زندگی کا مدار، سامانِ زیست پر ہے۔ دنیا کا فیصلہ یہی ہے کہ یہ ہر فرد کی اپنی اپنی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے اور اپنی اولاد کے لئے سامانِ زیست خود پیدا یا مہیا کرے۔ لیکن قرآنِ کریم اس باب میں ساری دنیا سے منفرد ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (۱۱/۶) دنیا میں کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق یعنی سامانِ زیست کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو۔ اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ جن ذمہ داریوں کو اللہ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے، قرآنی نظام میں وہ ذمہ داریاں خود نظامِ مملکت کی ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا یہ قرآنی مملکت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسا انتظام کرے کہ کوئی ذی حیات اپنی بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہنے پائے اور وہ تمام افرادِ معاشرہ سے اعلانیہ کہہ دے کہ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ (۶/۱۵۲) ہم تمہاری ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کی ضروریات پوری کرنے کے بھی۔ بنیادی ضروریاتِ زندگی کا پورا کئے جانا ہر انسان کا بنیادی حق ہے جسے وہ قرآنی نظامِ معاشرہ سے ہر وقت طلب کر سکتا ہے۔ یہ حق آپ کو دنیا کے کسی چارٹر میں نہیں ملے گا۔

جہاں تک اولاد کے رزق مہیا کرنے کا تعلق ہے اس میں ان کی صحیح تعلیم و تربیت بھی شامل ہے۔ کیونکہ جہاں قرآن نے کہا ہے کہ وَلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ (۶/۱۵۲) اپنی اولاد کو مفلسی کی وجہ سے قتل نہ کر دو۔ تو اس میں قتل کے معنی جان سے مار ڈالنا ہی نہیں، اس سے مراد علم و تربیت سے محروم رکھنا بھی ہے۔ لہٰذا قرآنی معاشرہ کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ایسا انتظام کرے جس سے تمام بچوں کی عمدہ تعلیم و تربیت ہو۔ بنابریں قرآن کی رُو سے، سب بچے عمدہ پرورش اور صحیح تعلیم و تربیت بطور اپنے حق کے طلب کر سکتے ہیں اور کوئی انہیں اس حق سے محروم نہیں کر سکتا۔

(۸) جان کی حفاظت

لیکن ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کی ذمہ داری سے پہلے، انسانی جان کی حفاظت کی ضمانت سامنے آتی ہے۔ قرآن نے اس باب میں واضح طور پر کہہ دیا کہ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا

بِالْحَقِّ ﷺ۔ (۶/۱۵۲) خدا نے انسانی جان کو واجب الاحترام قرار دیا ہے اس لئے کسی کو اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ کسی کو جان سے مار دے۔ ہاں اگر حق کا تقاضا ہو تو ایسا کیا جا سکتا ہے۔ حق کے تقاضے کے کیا معنی ہیں؟۔ اسے دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کر دیا کہ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ط۔ اگر کوئی کسی کو ناحق قتل کر دے تو اس جرم کی پاداش میں اسے سزائے موت دی جا سکتی ہے یا اگر کوئی شخص معاشرہ کے نظامِ عدل و امن کو تہس نہس کرنے کی کوشش کرے اور کسی طرح اپنی اس تباہ کن روش سے باز نہ آئے تو اسے بھی موت کی سزا دی جا سکتی ہے۔ ایسی صورتوں کے سوا، اگر کوئی شخص کسی انسانی جان کو ناحق تلف کر دے تو یوں سمجھو کہ اس نے ایک جان کو تلف نہیں کیا پوری نوعِ انسان کو تلف کر دیا۔ اس کے برعکس وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَا اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا (۵/۳۲) جس نے کسی انسان کی جان بچائی تو یوں سمجھو گویا اس نے پوری نوعِ انسان کی جان بچائی۔

آپ نے غور فرمایا کہ جن مخصوص حالات میں قرآنِ کریم نے کسی انسان کی جان لینے کی اجازت دی ہے، (یعنی قانونِ خداوندی کی رُو سے سزائے موت) وہ بھی درحقیقت عالمگیر انسانی حقوق کی محافظت کے لئے ہے۔ اسی کو بالحق کہا گیا ہے۔

(۹)۔ مال کی حفاظت

جان کی حفاظت کے بعد ان چیزوں کی حفاظت بھی بنیادی حقوق میں داخل ہے جو قانونِ خداوندی کی رُو سے افراد کے ذاتی تصرّف میں رہیں۔ کسی کو اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ دوسروں کی ان چیزوں کو ناجائز طور پر اپنے تصرّف میں لے آئے۔ اسی لئے فرمایا کہ لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (۴/۲۹) تم آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طریق سے مت کھاؤ۔ "مال" ایک جامع اصطلاح ہے جس میں ہر قسم کی مقبوضات آجاتی ہیں۔

(۱۰)۔ سکونت کی حفاظت

جان اور مال کی حفاظت کے بعد، قرآنِ کریم، ہر فرد کو سکونت کی حفاظت کی ضمانت دیتا ہے۔ اس نے یہودیوں کے خلاف جو فردِ جرم مرتّب کی ہے اس میں یہ بھی کہا ہے کہ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ

اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ (۲/۸۵) تم وہ ہو جو اپنے لوگوں کو ناحق قتل کر دیتے ہو۔ اور انہیں ان کے گھروں سے نکال دیتے ہو۔ لہٰذا کسی کو بے گھر، بے در، بنا دینا اس کے اِس بنیادی حق کو غصب کر لینا ہے۔

(۱۱) عصمت کی حفاظت

عصمت انسان کی بے بہا متاع ہے۔ یہ وہ بلند ترین قدر ہے جو صرف انسان کا خاصہ ہے۔ حیوانات میں اس کا احساس نہیں ہوتا۔ جنسی اختلاط ایک طبیعی جذبہ ہے جس میں انسان اور حیوان سب شریک ہیں لیکن عصمت کا جذبہ صرف انسانی سطحِ زندگی کا تقاضا ہے۔ لہٰذا قرآن اس کی حفاظت کو مستقل حقِ انسانیت قرار دیتا ہے۔ اسی لئے اس نے اس حق کی پامالی کو ایک ایسا جرم قرار دیا ہے جس کی سزا بڑی سخت ہے۔ اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ (۲۴/۲) زانی مرد ہو یا عورت، انہیں سو سو کوڑوں کی سزا دو۔

صرف جرمِ زنا کا ارتکاب ہی نہیں، اس کے نزدیک، شریف عورتوں کے خلاف تہمتِ بے جا بھی سنگین جرم ہے جس کی سزا اسّی کوڑے ہے (۲۴/۴)۔ اس لئے کہ اس سے بھی ان کی عصمت پر حرف آتا ہے۔ اور شریف زادیوں کو چھیڑنا اور تنگ کرنا، ان کے خلاف طعن آمیز اور اضطراب انگیز باتیں پھیلا کر لوگوں کے جذبات کو ان کے خلاف مشتعل کرنا، اس کے نزدیک اس سے بھی بڑا جرم ہے۔ اس جرم کی پاداش میں اس نے کہا ہے کہ ایسے لوگوں کو شہر بدر کر دیا جائے۔ انہیں حقوقِ شہریت سے محروم کر دیا جائے۔ اگر وہ اس پر بھی باز نہ آئیں تو ان کے خلاف وارنٹ بلا ضمانت جاری کر کے انہیں گرفتار کیا جائے اور جرم ثابت ہونے پر انہیں قتل کیا جائے اس طرح کہ ان کی پارٹی کا کوئی فرد بھی سزا سے بچنے نہ پائے۔ وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا۔ (۳۳/۶۱) یہ وہ قانونِ خداوندی ہے جس کے متعلق کہا کہ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا۔ (۳۳/۶۲) یہی قانون، خدا نے وحی کے ذریعے اقوامِ سابقہ کو بھی دیا تھا اور یہ ایسا محکم قانون ہے جس میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

(۱۲) شادی میں انتخاب کا حق

تعلقِ زوجین کے سلسلے میں قرآنِ کریم نے اس امر کی صراحت بھی کر دی کہ شادی میں، اپنی مرضی سے انتخاب بھی بنیادی حق

ہے۔ اس نے مردوں سے کہا کہ فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ ــــ (۴/۳) تم اپنی پسند کی عورتوں سے شادی کرو۔ دوسری طرف یہ کہہ کر عورتوں کے حقِ انتخاب کی حفاظت کر دی کہ لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ط (۴/۱۹) تم عورتوں کے زبردستی مالک نہیں بن سکتے۔ نکاح ایک معاہدہ ہے جس میں فریقین کی رضامندی بنیادی شرط ہے۔

اس سلسلہ میں ضمناً اتنا اور واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے، معاہدۂ نکاح کے بعد خاوند اور بیوی کے حقوق اور ذمہ داریاں یکساں ہوتی ہیں ـــــ صرف ایک بات میں مرد کو رعایت دی گئی ہے ــ اور وہ یہ کہ طلاق (یا بیوگی) کی صورت میں، عورت کو عدت کی مدت میں نکاحِ ثانی کی اجازت نہیں ہوتی اور مرد کے لئے کوئی عدت نہیں۔ اور اس کی وجہ ظاہر ہے، یعنی اس دوران میں یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ عورت حمل سے تو نہیں۔ یہ حکم پیدا ہونے والے بچے کے حق کی حفاظت کے لئے ہے، یعنی یہ متعین کرنے کے لئے کہ وہ کس کا بیٹا ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے۔ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (۲/۲۲۸) عورتوں کے حقوق بھی اتنے ہی ہیں جتنی ان کی ذمہ داریاں ہیں۔ صرف ایک معاملہ ایسا ہے جس میں مرد کو ایک خصوصی درجہ حاصل ہے اور وہ یہ کہ اسے عدت نہیں گزارنی پڑتی۔

۱۳۔ حسنِ ذوق کا حق

قرآن، انسان کے انفرادی حسنِ ذوق (AESTHETIC TASTE) کا بڑا احترام کرتا ہے اور کسی کو اجازت نہیں دیتا کہ وہ اسے، اس کے حق سے محروم کر دے۔ اس نے بڑی تحدی سے کہا ہے کہ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ط ـــ (۷/۳۲) ان سے کہو کہ وہ کون ہے جو زیب و زینت کی ان چیزوں کو جنہیں خدا نے اپنے بندوں کے ذوق کی تسکین کے لئے بنایا ہے اور رزق کے خوشگوار سامانِ زیست کو حرام قرار دینے کا حق یا اختیار حاصل ہے؟ کسی کو نہیں۔ حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے، ان سے لطف اندوز اور کیف یاب ہونا، ہر فرد کا بنیادی حق ہے جس سے اسے کوئی محروم نہیں کر سکتا۔ اصولاً یہ سمجھ لیجئے کہ جس چیز کو خدا نے حرام قرار نہیں دیا، اسے کوئی حرام قرار نہیں دے سکتا۔ یہ انسانی آزادی کو سلب کر لینے کے مترادف ہے جس کا حق کسی انسان کو نہیں پہنچتا۔ اسی ضمن میں یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ قرآن کھانے پینے کے انداز[1] اور

---

[1] یعنی حلال چیزوں کے کھانے پینے کے انداز اور طریق پر۔

رہنے سہنے کے طریق پر بھی کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کرتا بلکہ اس میں ہر ایک کو اس کے ذوق کے مطابق حقِ انتخاب دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم اپنے عزیزوں، رشتہ داروں اور دوستوں کے گھروں میں سے جس کے ہاں جی چاہے کھاؤ پیو اور خواہ اکٹھے مل کر بیٹھ کر کھاؤ یا الگ الگ کھاؤ، اس میں کچھ مضائقہ نہیں۔ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِيْعًا اَوْ اَشْتَاتًا ط (۲۴/۶۱) اسی طرح وہ لباس کے معاملہ میں بھی وضع قطع اور تراش خراش پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کرتا اور ہر ایک کے حسنِ ذوق کی رعایت رکھتا ہے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ لباس کا مقصد ستر پوشی کے علاوہ زینت بھی ہے۔ يٰبَنِيْۤ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ط (۷/۲۶) وہ سونے کے زیورات، چاندی اور شیشے کے برتن، بار یک اور دبیز ریشمی ملبوسات، اعلیٰ درجے کے صوفے (۱۸/۳۱ و ۷۶/۱۵-۱۳) اور اسی قسم کا دیگر سامانِ آرائش و زیبائش، جنّتی زندگی کا خاصہ قرار دیتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ یہ ہیئتِ مجموعی، معاشرہ کا تمدنی معیار اتنا بلند ہونا چاہیئے کہ یہ چیزیں تمام افرادِ معاشرہ کو میسّر ہوں۔ جنّتی زندگی میں یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ ایک خاص طبقہ ان آسائشوں سے بہرہ یاب ہوگا اور دوسرے لوگ ان سے محروم ہوں گے۔ جنّتی زندگی میں ہر ایک کو یہ کچھ میسّر ہوگا۔

(۱۴)۔ مذہبی آزادی کا حق

مذہب کے معاملہ میں قرآن، ہر انسان کو پوری پوری آزادی دیتا ہے۔ اس کے نزدیک ایمان نام ہے کسی بات کو عقل و فکر کی رُو سے علیٰ وجہ البصیرت ماننے کا ——— لہٰذا اس میں جبر و اکراہ کا کوئی دخل نہیں ہو سکتا، قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (۱۸/۲۹) "ان سے کہہ دو کہ حق تمہارے رب کی طرف سے (اس قرآن میں) آچکا ہے۔ تم اس پر غور و فکر کرو۔ اور اس کے بعد جس کا جی چاہے اسے تسلیم کرے، جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے"۔ اس نے واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ خارجی کائنات اور انسان میں بنیادی فرق ہی یہ ہے کہ کائنات کی ہر شے اس راستے پر چلنے کے لئے مجبور ہے جو اس کے لئے تجویز کیا گیا ہے۔ لیکن انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا ہے۔ اسے راستہ دکھا دیا گیا ہے اور اس کے بعد، یہ اس کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ اس راستے کو اختیار کرے یا اس سے انحراف برتے۔ وہ اگر اسے اختیار کرے گا تو اس کی زندگی خوشگواریوں میں گزرے گی۔ اس سے سرتابی

برتنے کا تو نقصان اٹھائے گا۔ اگر اسے مجبوراً صحیح راستے پر چلانا مقصود ہوتا تو اسے بھی دیگر اشیائے کائنات کی طرح، مجبور پیدا کر دیا جاتا۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ اسے صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا ہے۔ اب یہ بات منشائے خداوندی کے خلاف ہوگی کہ اسے ایک خاص راستہ اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے۔ قرآنِ کریم نے نبی اکرمؐ کو مخاطب کر کے فرمایا: وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ؕ اگر تمہارے خدا کے پروگرام میں یہ ہوتا کہ انسان کو ایمان کے راستے پر مجبوراً چلایا جائے تو اس کے لئے ایسا کرنا کیا مشکل تھا؛ وہ انسانوں کو پیدا ہی ایسے کرتا کہ وہ سب کے سب، آنکھ بند کئے، بھیڑ بکریوں کی طرح اسی راستے پر چلے جاتے۔ لیکن اس نے انسان کو ایسا پیدا نہیں کیا۔ اسے اس باب میں اختیار دیا گیا ہے۔ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (۱۰/۹۹) تو کیا تو انہیں مجبور کرے گا کہ وہ بالضرور ایمان لے آئیں۔ یہ تو مشیّتِ خداوندی کے خلاف ہوگا۔ اس لئے تیرا کام یہ ہے کہ تو اس پیغام کو ان لوگوں تک پہنچائے جا۔ اس سے زیادہ کا تو مکلف نہیں۔ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (۲/۲۵۶) غلط اور صحیح راستہ (اس قرآن کے ذریعے) متمیز ہو کر سامنے آچکا ہے۔ اس کے بعد، دین کے معاملہ میں کسی پر کوئی جبر نہیں ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام ایک مذہب نہیں (مذہب کا لفظ سارے قرآن میں کہیں نہیں آیا) اس لئے وہ مذاہبِ عالم میں سے کسی کو اپنا حریف نہیں قرار دیتا۔ وہ ایک دین، یعنی ضابطۂ زندگی یا مملکتی نظام ہے۔ وہ اس کی اجازت نہیں دے سکتا کہ اس کی حدودِ مملکت میں رہنے والے کوئی دوسرا نظامِ مملکت قائم کریں۔ یہ تو "ریاست درونِ ریاست" (STATE WITHIN A STATE) قائم کرنے کے مرادف ہوگا، جس کی کہیں بھی اجازت نہیں مل سکتی۔ لیکن وہ اس سے کچھ بھی تعرض نہیں کرتا کہ اس کے حدودِ مملکت میں رہنے والے اپنے لئے مذہب کونسا پسند کرتے ہیں ـــــ اتنا ہی نہیں کہ وہ ہر ایک کو مذہبی آزادی عطا کرتا ہے ـــــ وہ جہاں اپنے نظام کے مراکز، یعنی مساجد کی حفاظت کرتا ہے، وہاں، تمام اہلِ مذاہب کی پرستش گاہوں کی بھی حفاظت اپنے ذمہ لیتا ہے۔ وہ اسلامی مملکت کے وجود کی ایک وجہ جواز یہ بھی بتاتا ہے کہ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ؕ (۲۲/۴۰) اگر اللہ انسانوں کے ذریعے سرکش قوتوں کی روک تھام کا انتظام نہ کرتا تو یقیناً راہبوں کی خانقاہیں، عیسائیوں کے گرجے، دیگر

اقوام کی پرستش گاہیں اور مسجدیں جن میں بہ کثرت خدا کا نام لیا جاتا ہے ڈھا دی جائیں۔ لہٰذا، ان تمام معبدوں کی حفاظت، قرآنی مملکت کی ذمّہ داری ہے، جس کا ہر غیر مسلم، بطور اپنے حق، کے مطالبہ کر سکتا ہے۔

اتنا ہی نہیں بلکہ اس نے جماعتِ مومنین سے تاکیداً کہا ہے کہ وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ۔ تم غیر مسلموں کے معبودوں کو گالی مت دو۔ تم ایسا کرو گے تو وہ، اس کے مقابلے میں بر بنائے جہالت، اللہ کو گالی دیں گے سو جس طرح تمہیں یہ بُرا لگے گا، اسی طرح انہیں، ان کے معبودوں کو تمہارا گالی دینا بھی بُرا لگتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ كَذَٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ أُمَّةٍ عَمَلَهُمْ (۶/۱۰۸) ہر ایک کو اپنا اپنا مسلک اور اپنا اپنا معبود پسند ہوتا ہے۔ تم ان تک حق کی بات پہنچاؤ۔ جب یہ بر بنائے علم و بصیرت، غلط اور صحیح میں تمیز کرنے کے قابل ہو جائیں گے تو خود بخود اپنے معبودانِ باطل کو چھوڑ کر صحیح نظامِ زندگی اختیار کر لیں گے۔

لہٰذا، قرآن نوعِ انسان کو، مذہبی آزادی کا حق ہی نہیں دیتا بلکہ اس کی ضمانت بھی دیتا ہے کہ کوئی ان کے معبودوں کے خلاف زبان درازی یا ان کی شان میں گستاخی نہ کرے۔

اس مقام پر میں، آپ حضرات سے، اپنے موضوع سے ذرا سے گریز (DIGRESSION) کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ خدا نے تو مذہب کے معاملہ میں انسان کو اس قدر آزادی عطا کی ہے، لیکن ہمارے اربابِ شریعت کا فتویٰ ہے کہ غیر مسلموں کو تو اس کا حق دیا جا سکتا ہے کہ وہ چاہے اپنے مذہب میں رہیں اور چاہے اسے تبدیل کر لیں، لیکن ایک مسلمان کو اس کا حق نہیں دیا جا سکتا۔ اگر مسلمان مذہب تبدیل کرے گا تو اُسے قتل کر دیا جائے گا۔ یہی نہیں کہ وہ اسلام چھوڑ کر اگر کوئی اور مذہب اختیار کر لے تو اسے قتل کر دیا جائے گا بلکہ یہاں تک بھی کہ اگر کسی معاملے میں اس کے خیالات ان حضرات سے مختلف ہوں اور اس بنا پر یہ اُسے مرتد قرار دے دیں تو بھی اسے قتل کر دیا جائے گا۔

اس سلسلے میں یہ اہم سوال سامنے آتا ہے کہ اس وقت پاکستان میں جس قدر مسلمان بستے ہیں، اگر کل کو یہاں، ان حضرات کے تصوّر کا اسلامی نظام قائم ہو گیا تو ان "پیدائشی مسلمانوں" کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے گا۔ اس ضمن میں سیّد ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) کا فیصلہ ملاحظہ فرمایئے۔ وہ اپنے رسالہ

"مرتد کی سزا" کے صفحہ ۸۰ پر ارشاد فرماتے ہیں:۔

"میرے نزدیک اس کا حل یہ ہے (واللہ الموفق للصواب) کہ جس علاقے میں اسلامی انقلاب رونما ہو، وہاں کی مسلمان آبادی کو نوٹس دے دیا جائے کہ جو لوگ اسلام سے اعتقاداً اور عملاً منحرف ہو چکے ہیں اور وہ منحرف ہی رہنا چاہتے ہیں وہ تاریخِ اعلان سے ایک سال کے اندر اندر اپنے غیر مسلم ہونے کا باقاعدہ اظہار کر کے ہمارے اجتماعی نظام سے باہر نکل جائیں۔ اس مدت کے بعد ان سب لوگوں کو جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہوئے ہیں مسلمان سمجھا جائے گا۔ تمام قوانینِ اسلامی ان پر نافذ کئے جائیں گے۔ فرائض و واجباتِ دینی کے التزام پر انہیں مجبور کیا جائے گا اور پھر جو کوئی دائرۂ اسلام سے باہر قدم رکھے گا اسے قتل کر دیا جائے گا۔ اس اعلان کے بعد انتہائی کوشش کی جائے کہ جس قدر مسلمان زادوں اور مسلمان زادیوں کو کفر کی گود میں جانے سے بچایا جا سکتا ہے بچا لیا جائے۔ پھر جو کسی طرح نہ بچائے جا سکیں انہیں دل پر پتھر رکھ کر ہمیشہ کے لئے اپنی سوسائٹی سے کاٹ پھینکا جائے اور اس عملِ تطہیر کے بعد اسلامی سوسائٹی کی نئی زندگی کا آغاز صرف ایسے مسلمانوں سے کیا جائے جو اسلام پر راضی ہوں۔"

یعنی صرف انہیں زندہ رکھا جائے جو ان حضرات سے متفق الخیال ہوں۔ جو ان سے اختلاف کریں انہیں زیادہ سے زیادہ ایک سال تک زندہ رہنے کی اجازت دی جائے۔ اس کے بعد، یا وہ (مثلاً) ہندو یا عیسائی ہو جائیں یا اپنی گردن ان کی تلوار کے سامنے جھکا دیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ اگر وہ اس وقت ان کے ہم خیال بھی ہو جائیں تو بھی انہیں ساری عمر اطمینان سے جینے کی اجازت نہیں ہو گی۔ اس کے بعد بھی جب یہ حضرات کہہ دیں کہ اس کا فلاں عقیدہ اِن کے خیال کے مطابق اسلام کے خلاف ہے اُسے مرتد قرار دے کر قتل کیا جا سکتا ہے۔

یہ ہو گی مسلمانوں کی حالت اس اسلامی نظام میں جسے یہ حضرات پاکستان میں قائم کرنے کے درپے ہیں!
اس گریز کے بعد، میں پھر اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔ قرآن کی رُو سے، اگلا بنیادی حق ہے:۔

(۱۵)۔ سچی بات کہنے کا حق

قرآنِ کریم نے افراد کو سچی بات کہنے کا حق ہی عطا نہیں کیا بلکہ اس کا حکم دیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے

اِسے افراد کی مرضی پر نہیں چھوڑا کہ وہ حق بات کہیں یا نہ کہیں۔ اس نے حکم دیا ہے کہ وہ، جہاں بھی ضرورت ہو، حق بات کہنے کے لئے اپنے آپ کو خود پیش کریں۔ اس کا حکم ہے کہ یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰامِیْنَ بِالْقِسْطِ۔ اے جماعتِ مومنین! تمہارا فریضہ ہے کہ تم عدل و انصاف کو دنیا میں قائم رکھو۔ اس کے لئے بنیادی ضرورت اس امر کی ہے کہ سچی بات بلا رُو رعایت کی جائے۔ اس ضمن میں تم سمجھ لو کہ جب کسی معاملہ کے متعلق کچھ کہنے کا وقت آئے تو یہ خیال کرو کہ تم کسی پارٹی یا فریق کی طرف سے شہادت دینے کے لئے آئے ہو، تم یہ سمجھو کہ تم صرف اپنے خدا کی طرف سے شاہد بن کر آئے ہو۔ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ پھر سچی بات کہہ دو۔ وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ۔ خواہ وہ تمہارے اپنے خلاف ہی کیوں نہ جائے۔ (آپ نے غور فرمایا کہ اس باب میں قرآن انسان کو کس مقام تک لے جاتا ہے؟) اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ۔ خواہ وہ تمہارے والدین یا دیگر عزیز رشتہ داروں کے خلاف کیوں نہ جائے۔ اِنْ یَّکُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا۔ جس کے خلاف بات جاتی ہے وہ امیر ہو یا غریب، اس کی پروا مت کرو۔ اس لئے کہ فَاللّٰہُ اَوْلٰی بِھِمَا۔ اللہ کا حق ان دونوں کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔ یاد رکھو! اپنے مفاد کا تحفظ، عزیز رشتہ داروں کی محبت اور تعلقات، اس پارٹی سے نقصان کا احتمال جو دولت مند ہے، یہ تمام جذبات تمہاری راہ روک کر کھڑے ہو سکتے ہیں۔ لیکن فَلَا تَتَّبِعُوا الْھَوٰٓی اَنْ تَعْدِلُوْا۔ تم ان جذبات کا اتباع قطعاً نہ کرو اور ہمیشہ عدل کے تقاضے کو ملحوظ رکھو۔ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا ○ (۴/۱۳۵) نہ ہی تم توڑ مروڑ کر، ذو معنی بات کرو اور نہ ہی اس سے پہلو تہی کرو۔ ایسا کرنے سے ہو سکتا ہے کہ تم دوسرے لوگوں کو دھوکا دے سکو۔ لیکن تم اللہ کو دھوکا نہیں دے سکتے۔ اسے سب کچھ معلوم ہے۔ اس لئے سچی بات کہنے کے لئے دھڑلّے سے سامنے آؤ اور لگی لپٹی بغیر، صاف صاف دوٹوک بات کرو۔

اِدھر یہ کہا اور دوسری طرف معاشرہ سے تاکید کی کہ اس کا انتظام کرو کہ حق بات کی شہادت دینے والے کو، کوئی کسی قسم کا نقصان نہ پہنچائے۔ وَلَا یُضَآرَّ کَاتِبٌ وَّلَا شَھِیْدٌ ۵ (۲/۲۸۲)۔

(۱۶) مظلوم کو فریاد کا حق

قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ تم کسی کی برائی کی خواہ مخواہ تشہیر مت کرو۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے

مظلوم کو اس کا حق دیا ہے کہ اس کے ساتھ جو زیادتی ہوئی ہے وہ اس کے مداوا کے لئے اس کا اعلان اور فریاد کر سکتا ہے۔ لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ (۴/۱۴۸) اللہ اسے پسند نہیں کرتا کہ تم بُری بات کی خواہ مخواہ تشہیر کرتے پھرو۔ (یہ اربابِ نظم و نسق کا کام ہے کہ وہ اس برائی کے انسداد کا بندوبست کریں)۔ ہاں! جس شخص پر کوئی زیادتی ہوئی ہو وہ اس کا چرچا کر سکتا ہے تاکہ اس کی زیادتی کا مداوا ہو سکے۔

(۱۷) رازوں کی حفاظت کا حق

قرآنِ کریم نے اس سے منع کیا ہے کہ کسی کے رازوں کی خواہ مخواہ ٹوہ لگائی جائے۔ وَلَا تَجَسَّسُوْا (۴۹/۱۲) اس کا ارشاد ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ افراد کو اس کا حق دیتا ہے کہ ان کے راز، افشا نہیں کئے جائیں گے۔ (جرائم کی تحقیق کے سلسلے میں ایسا کرنا کچھ اور معنی رکھتا ہے) خط و کتابت کی حفاظت کا حق بھی اسی ذیل میں آجاتا ہے۔ اسی طرح وہ ہر شخص کو پرائیویسی کا حق بھی دیتا ہے جب کہتا ہے کہ لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا۔ (۲۴/۲۷) تم اپنے گھروں کے علاوہ، کسی اور کے گھر میں، ان کی اجازت کے بغیر مت داخل ہو۔

(۱۸) حیثیّتِ عرفی کے تحفّظ کا حق

جس چیز کو عام طور پر حیثیّتِ عرفی کہا جاتا ہے، قرآن اس کی حفاظت کا بھی حق دیتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ۔ (۴/۱۴۸) اللہ اسے پسند نہیں کرتا کہ کسی کی بُری بات کو خواہ مخواہ اُچھالا جائے۔ اس کی اصلاح مطلوب ہو تو خاموشی سے ایسا کیا جائے۔ پھر ارشاد ہے کہ لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ (۴۹/۱۱) کوئی پارٹی کسی دوسری پارٹی کا مذاق نہ اڑائے۔ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ (۴۹/۱۱) کسی کے الٹے پلٹے نام نہ رکھے جائیں۔ محض ظن اور گمان کی بنا پر کسی کو مطعون نہ کیا جائے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ز۔ (۴۹/۱۲) اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ جب تک کسی کے خلاف کوئی جرم ثابت نہ ہو جائے اسے مجرم نہ سمجھا جائے بلکہ کہا یہ جائے۔ هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ۔ (۲۴/۱۲) هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ۔ (۲۴/۱۶) اور یہی نہیں کہ

ظن اور قیاس کی بنا پر، کسی کے سامنے اس کی برائی نہ کی جائے بلکہ اس کی پیٹھ پیچھے بھی ایسا نہ کیا جائے کہ یہ غیبت ہوگی اور غیبت سے قرآن نے سختی سے روکا ہے۔ وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ط (۴۹/۱۲) اس قسم کے تاکیدی احکامات سے، قرآن، افراد کی حیثیتِ عرفی کا تحفظ کرتا ہے۔

(۱۹) امن کی ضمانت

ان تمام حقوق سے آگے بڑھ کر، قرآنِ کریم یہ ضمانت دیتا ہے کہ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ (۲/۳۸) انہیں کسی قسم کا خوف اور حزن نہیں ہوگا۔ خوف خارجی خطرات کی طرف سے اندیشہ کا نام ہے۔ لہٰذا، اس معاشرہ میں، ہر فرد، ہر قسم کے بیرونی خطرات سے محفوظ ہوگا اور حزن اس افسردگی کو کہتے ہیں جو پریشانیوں کی وجہ سے دل میں پیدا ہوتی ہیں۔ لہٰذا جہاں اس معاشرہ کا یہ فریضہ ہوگا کہ وہ ایسا انتظام کرے کہ افرادِ معاشرہ، بیرونی خطرات سے امن میں رہیں، وہاں اس کی یہ ذمہ داری بھی ہوگی کہ وہ ان پریشانیوں کو دور کرے جو لوگوں کے لئے وجہ افسردگی بنتی ہیں۔ خوف اور حزن سے مامونیت، ایسی جامع کیفیت ہے جس میں داخلی اور خارجی، ہر قسم کے اندیشوں اور پریشانیوں سے حفاظت کا تصور آجاتا ہے۔ اسی حفاظت میں یہ چیز بھی شامل ہے کہ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی۔ (۶/۱۶۵)۔ اس میں کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ یہ نہیں ہوگا کہ کرے کوئی اور بھرے کوئی۔ فریضہ کسی کا ہو اور اسے سرانجام کوئی اور دے۔ کام کسی کا ہو اور مفت میں بیگار کوئی اور بھگتے۔ جرم کسی نے کیا ہو اور دھبّہ کسی اور کو لگا ہوا ہو۔ یہ ہے امن کی وہ ضمانت جس سے ہر شخص کو حقیقی اطمینان حاصل ہو سکتا ہے۔

⁂

یہ ہیں وہ بنیادی حقوق جنہیں قرآن، حقوقِ انسانیت کی حیثیت سے تسلیم کرتا اور جن کی ضمانت قرآنی معاشرہ دیتا ہے۔ یہ صرف بڑے بڑے حقوق کی فہرست ہے، ورنہ چھوٹے چھوٹے کئی اور حقوق ہیں جن کا یہاں ذکر نہیں کیا گیا۔ آپ ان حقوق کو سامنے رکھئے اور پھر ان کا موازنہ ان حقوق سے کیجئے جن کا ذکر اقوامِ متحدہ (U.N.O) کے چارٹر میں کیا گیا ہے۔ آپ پر یہ حقیقت خود بخود واضح ہو جائے گی کہ انسانی فکر، اپنی (اس وقت تک کی) انتہائی بلندیوں کے باوجود، کہاں تک جا سکی ہے۔ اور وحیِ خداوندی، اس باب میں انسان کو کہاں لے جاتی ہے ـــــ اور اس کے ساتھ

حقوق کا موازنہ

ہی اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھیئے کہ وحی خداوندی (قرآن کریم) نے انسانوں کو یہ حقوق اس زمانے (چھٹی صدی عیسوی) میں عطا کئے تھے جب انسان اپنے بنیادی حقوق کے تصوّر تک سے نا آشنا تھا۔

قرآنِ حقوقِ انسانیت کی فہرست کا، اقوامِ متحدہ کے مرتّب کردہ منشور کے ساتھ موازنہ کے بعد ایک اور اہم حقیقت پر بھی غور کیجئے۔ جس زمانے میں یو۔ این۔ او کا منشور زیرِ تحقیق تھا، انجمن اقوامِ متحدہ کی (EDUCATIONAL. SCIENTIFIC AND CULTURAL ORGANISATION) نے (جسے عام طور پر (UNESCO) کہا جاتا ہے)، اس موضوع پر ایک سوالنامہ مرتّب کیا اور اسے دنیا بھر کے مشہور ارباب فکر و نظر کے پاس بھیجا کہ وہ ان حقوق کے متعلق اپنی آراء کا اظہار کریں۔ (UNESCO) نے ان میں سے بلند پایہ مشاہیر کے مقالات کو ایک مجموعہ کی شکل میں شائع کیا جس کا تعارف (JACQUES MARITIAN) نے لکھا ہے۔ ان مقالات میں جس بات کو نمایاں طور پر

کوئی حق مطلق نہیں

تسلیم کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ انسان کے کوئی حقوق مطلق (ABSOLUTE) ہیں ہی نہیں۔ مسٹر (MARITIAN) کے الفاظ ہیں:۔

"یہ حقیقت بدیہی ہے کہ تمام حقوق، بالآخر انسانی حقوق ہیں۔ (خدائی حقوق نہیں) اور دیگر تمام انسانی حقوق کی طرح ایسے کہ ان پر حدود و قیود عائد کی جائیں اور انہیں قابل ترمیم و تبدّل قرار دیا جائے۔ حتیٰ کہ جن حقوق کو غیر مشروط کہا جاتا ہے ان میں بھی، ان حقوق کے مالک ہونے میں اور ان کے استعمال کا حق رکھنے میں بنیادی فرق ہے ملکیت بجا ہے لیکن انکا استعمال ان حدود اور پابندیوں کے مطابق ہوگا جو ان پر از روئے عدل عائد کی جائیں گی۔"

لیجئے! ایک ہی نشتر نے، بنیادی حقوقِ انسانیت کی رفیع الشّان عمارت، دھڑام سے نیچے گرا دی۔ انسان جس بات کی ضمانت چاہتا ہے اور جس ضمانت سے اُسے حقیقی اطمینان حاصل ہو سکتا ہے، یہ ہے کہ اس

مشروط حقوق

کے کچھ حقوق ایسے ہیں جو اسے محض انسان ہونے کی حیثیت سے غیر مشروط حاصل ہیں۔ نہ ان حقوق میں کوئی ردّ و بدل کر سکتا ہے نہ من مانی حدود و قیود عائد کر سکتا ہے۔ لیکن جب ایک طرف اس کے ہاتھ میں حقوق کی فہرست دے دی جائے اور دوسری طرف اس سے یہ کہہ دیا جائے کہ اربابِ اقتدار (PARTY IN POWER) کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ "از روئے عدل" ان حقوق پر جو پابندیاں چاہے لگا دے، تو اس سے اسے خاک اطمینان حاصل

ہوگا؛ وہ اربابِ اقتدار کی دخل اندازی سے بچنے کے لئے ہی تو حقوق چاہتا تھا۔ اگر وہ دخل اندازی بدستور قائم ہے تو اسے اس قسم کے حقوق سے حاصل کیا ہوگا؛ مختلف اقوامِ عالم کے ہاں، اربابِ اقتدار کے ہاتھوں، ان حقوق کی جس قدر مٹی پلید ہوتی ہے، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں اور یہ سب کچھ "عدل و انصاف" کی خاطر اور آئین و قانون کے نام سے کیا جاتا ہے۔

قرآنِ کریم نے اس باب میں، بات بالکل واضح کر دی۔ اس نے بیشتر حقوق کو حقوقِ مطلق قرار دیا جن پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جا سکتی۔ (مثلاً رزق، یعنی بنیادی ضروریاتِ زندگی حاصل ہونے کا حق؛ احترامِ انسانیت کا حق، صحیح تعلیم و تربیت کا حق، عدل و احسان کا حق، تحفظِ عصمت کا حق اور اسی قسم کے دیگر حقوق جو یکسر غیر مشروط ہیں)۔ اور جو حقوق مشروط ہیں ان کی شرائط اور حدود کو بھی خود ہی متعین کر دیا۔ اور ان دونوں چیزوں کو یکسر مکمّل اور غیر متبدّل قرار دیا کہ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ـــ (۶/۱۱۶) تیرے رب کی بات صدق اور عدل کے ساتھ مکمّل ہو گئی۔ اب ان امور میں کوئی تبدیلی کرنے والا نہیں۔ اسی مکمّل اور غیر متبدّل ضابطۂ حیات کا نام قرآن ہے۔ جو دنیا میں حقوقِ انسانیت کا واحد ضامن ہے۔

اقوام اس چارٹر پر عمل نہیں کرتیں

یہ تو رہا ان حقوق کے مشروط اور قابلِ تغیّر و تبدّل ہونے کے متعلق جو اقوامِ متحدہ کے چارٹر میں مذکور ہیں۔ اس کے بعد، اس سے بھی زیادہ اہم بات سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ، ہر چند اس چارٹر کو اقوامِ عالم کے نمائندوں نے منظور اور تسلیم کیا ہے لیکن اس کی کیا ضمانت ہے کہ وہ قومیں اس پر عمل بھی کریں گی۔ اس ضمن میں شکاگو یونیورسٹی کا پروفیسر (QUINCY WRIGHT) اپنے مقالہ میں لکھتا ہے:-

"تجربہ نے بتایا ہے کہ اس باب میں کسی قوم پر بھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ہر حال میں حقوقِ انسانیت کا احترام کرے گی۔ گزشتہ دنوں اقلیتوں پر جس قدر مظالم کئے گئے ہیں اس سے انسانی ضمیر کانپ اٹھتا ہے۔ اگر مجلسِ اقوامِ متحدہ فی الواقعہ چاہتی ہے کہ ان حقوق کا احترام ہو تو اسے چاہیئے کہ یہ تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لے۔ اور اقوامِ عالم کے اقتدارِ اعلیٰ ـــ (SOVEREIGNTY) کے تصوّر میں اس کے مطابق تبدیلی پیدا کرے۔"

پروفیسر رائٹ، ان حقوق کے تحفظ کے لئے، یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ اقوامِ عالم، اس باب میں اپنے اقتدارِ اعلیٰ کو اقوامِ متحدہ کی تحویل میں دے دیں۔ اور یہیں سیاسی اُفق پر یہ دکھائی دیتا ہے کہ، مرحوم لیگ اوف نیشنز کی طرح انجمنِ اقوامِ متحدہ کا وجود ہی خطرہ میں ہے۔ کئی اقوام نے انجمن کو اپنے واجبات تک ادا نہیں کئے۔

اس مقام پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ جب حالات یہ ہیں تو پھر وہ کونسی صورت ہے جس میں ان حقوق کے احترام اور تحفظ کا خاطر خواہ انتظام ہو سکتا ہے۔ اس باب میں مسٹر (MARITIAN) نے اپنے تعارفی مقالہ میں جو کچھ کہا ہے وہ قابلِ غور ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

پس چہ باید کرد؟

انسانیت کے حقوق کی تعریف (DEFINITION) نہیں، بلکہ روزمرّہ کی زندگی میں ان کے استعمال کے مسئلہ پر متفق ہونے کے لئے سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ اقدار کے پیمانوں پر متفق ہوا جائے۔ حقوقِ انسانیت کے احترام کے لئے ضروری ہے کہ لوگوں کے نزدیک، انسانی زندگی کا عملی تصوّر مشترک ہو۔ اسی کو فلسفۂ زندگی کہتے ہیں [1]۔

یعنی احترامِ حقوقِ انسانیت کے لئے ضروری ہے کہ تمام اقوام کا فلسفۂ زندگی (یا آئیڈیالوجی) مشترک ہو۔ جبتک ایسا نہیں ہوگا، تحفظِ حقوقِ انسانیت کی کوشش کامیاب نہیں ہو سکے گی۔ قرآنِ کریم اس کو ایمان کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ تمام نوعِ انسان کے لئے اقدار (VALUES) کے یکساں پیمانے مقرر کرتا ہے وہ عالمگیر انسانیت کو مخاطب کرکے کہتا ہے کہ

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (۱۰/۵۷)

اے نوعِ انسان! تمہارے پاس، تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے، ایک ضابطۂ ہدایت آگیا ہے۔ اس میں ہر اس نفسیاتی کش مکش کا علاج ہے جو انسانوں کے دل کو وقفِ اضطراب رکھتی اور اس طرح ان کے معاشرہ میں فساد پیدا کرنے کا موجب بنتی ہے۔ جو اس ضابطہ کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں یہ ان پر کامیابیوں اور خوشگواریوں کی راہیں کشادہ کر دیتا ہے۔

---

[1] ان تمام امور کی وضاحت کے لئے میری کتاب "انسان نے کیا سوچا" میں سیاست کے متعلق باب دیکھئے۔

اس ایمان کی بنیاد اس علیٰ وجہ البصیرت یقین پر ہے کہ انسان (یا اقوام) کے ہر عمل کا نتیجہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے متعیّن ہوتا ہے اور اسی کے مطابق اقوام کی موت اور حیات کے فیصلے ہوتے ہیں ــــ جو قومیں حقوقِ انسانیّت کا احترام اور تحفّظ نہیں کرتیں وہ تباہ اور برباد ہو کر رہ جاتی ہیں اور ان کا عسکری سازوسامان اور سیاسی مہرہ بازیاں انہیں اس تباہی سے نہیں بچا سکتیں۔ یہ خدا کا اٹل قانون ہے جو نہ کبھی کسی کی خاطر بدلا ہے نہ کبھی بدلے گا۔ یہی وہ ایمان (یا فلسفۂ زندگی) ہے جس سے حقوقِ انسانیّت کا تحفّظ ہو سکتا ہے ــــ

پاکِستان کی ضرُورت

اسی ایمان کو ایک زندہ حقیقت بنانے اور اسے عملی پیکر میں لانے کے لئے ہم نے پاکستان کا مطالبہ کیا تھا، تاکہ اس آزاد مملکت میں انسانی حقوق کا تحفّظ ہو سکے۔ اسلامی مملکت کا بنیادی فریضہ ان حقوق کا تحفّظ ہے، بلکہ اس کی ہستی کی وجہ جواز ہی یہ ہے۔ یہی وہ مقصد تھا جس کے لئے طلوعِ اسلام نے تحریکِ پاکستان کی اس شدّومد سے حمایت کی تھی اور یہی وہ نصب العین ہے جس کی طرف یہ مسلسل دعوت دیتا چلا آرہا ہے۔ یہ مقصدِ عظیم اُس وقت حاصل ہوگا جب اس خطۂ زمین میں قرآنی نظامِ زندگی قائم ہوگا کہ وہی، اور صرف وہی نظام، احترامِ آدمیّت کا ضامن اور حقوقِ انسانیّت کا محافظ ہو سکتا ہے۔

اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

ہم میں کیریکٹر کیوں نہیں؟

(نومبر ۱۹۶۰ء)

آپ کسی سے بات کیجئے اور زندگی کے کسی شعبے سے متعلق کیجئے، حاصلِ گفتگو یہ ہوگا کہ ہمارے ہاں لوگوں میں کیریکٹر نہیں رہا۔ گھر کے افراد میں کیریکٹر نہیں، اہلِ محلّہ میں کیریکٹر نہیں، کاروباری دنیا میں کیریکٹر نہیں۔ دفاتر میں، عدالتوں میں، ایوانِ حکومت میں، اربابِ نظم ونسق میں، غرضیکہ کہیں بھی کیریکٹر نہیں ملتا۔ آپ کسی خرابی کا تجزیہ کریں، کسی شکایت کے بنیادی سبب کا سراغ لگائیں، آخرالامر آپ اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ یہ سب کیریکٹر کے فقدان کی وجہ سے ہے۔ قوم کے زوال کا باعث ہے تو یہی مرض اور پاکستان کی تباہی کا موجب ہے تو یہی علّت۔ یہ روگ، قوم اور ملک کو گھن کی طرح اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے قصرِ حیات کا ہر ستون کھوکھلا ہو چکا ہے اور ہر قلبِ حسّاس اس خطرے سے متوحّش ہے کہ کہیں ذرا سا بھی جھٹکا لگا تو یہ عمارت چھت سمیت نیچے آ گرے گی۔

کیریکٹر نہیں کیریکٹر کے متعلق ہم گفتگو تو اس شرح و لبط' سے کرتے ہیں، لیکن اگر کسی سے پوچھا جائے کہ کیریکٹر کہتے کسے ہیں تو شاید سو میں سے ایک آدھ بمشکل بتا سکے گا کہ اس کا متعیّن مفہوم کیا ہے۔ جو کچھ عام طور پر کہا جائے گا وہ یہی ہوگا کہ جب تک کسی کو رشوت نہ دی جائے کوئی کام نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی آپ لوگوں کو یہ بھی کہتے سنیں گے کہ صاحب! اس موجودہ افسر سے تو وہی افسر اچھا تھا جو دس روپے لے کر کام کر دیتا تھا۔ اس کے ہاتھوں تو دنیا تنگ آ چکی ہے۔ جس کی مسل اس

کے سامنے ہو، اس کے متعلق یہ پہلے پتہ کرتا ہے کہ اس نے پچھلے الیکشن میں ووٹ کسے دیا تھا؟ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ جس مقام پر کسی کے کام میں کوئی رکاوٹ پڑے یا اسے کوئی نقصان ہو، تو وہ کہہ دیگا کہ لوگوں میں کیریکٹر نہیں رہا۔ لیکن ظاہر ہے کہ کیریکٹر کی یہ تعریف (DEFINITION) تو بے معنی ہے؛ لہٰذا، سوال یہ ہے کہ کیریکٹر کہتے کسے ہیں؟

کیریکٹر کی تعریف

علمی نقطۂ نگاہ سے اس سوال کا تعلق اخلاقیات (ETHICS) سے ہے لیکن علمائے اخلاقیات بھی جس انداز سے کیریکٹر کی تعریف (DEFINITION) بیان کرتے ہیں، اس سے عام لوگوں کے لئے بات صاف نہیں ہوتی۔ مثلاً (SOREY KIERKE GARRD) کے نزدیک:-

"اخلاق کیریکٹر کا نام ہے اور کیریکٹر وہ ہے جو انسان کی ذات کے اندر منقوش ہے۔ کیریکٹر درحقیقت داخلیت کا نام ہے۔ بداخلاقی بھی توانائی کی حیثیت سے کیریکٹر ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص نہ تو اچھے اخلاق کا مالک ہے اور نہ ہی بُرے کا، تو وہ انسان نہیں حیوان ہے۔"

(THE PRESENT AGE)

پروفیسر وہائٹ ہیڈ کے نزدیک کیریکٹر، صداقت (TRUTH) کے مظاہرہ کا نام ہے اور

"جب ظاہر (APPEARANCE) حقیقت (REALITY) کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے تو اسے صداقت کہتے ہیں۔"

(ADVENTURES OF IDEAS)

مارٹن بوبر کہتا ہے کہ کیریکٹر درحقیقت خیر (GOOD) اختیار کرنے کا نام ہے۔

خیر کے معنی ہیں ایسا سفر جس میں ہر قدم منزلِ مقصود کی طرف اُٹھے اور شر کے معنی ہیں انسانی ممکنات کا بگولے کا سا رقص۔

(BETWEEN MAN AND MAN)

بالڈیو کے نزدیک "اپنے آپ پر قابو پانے کا نام کیریکٹر ہے"۔ اس کی تائید (ALEXANDAR LOVEDAY) بھی کرتا ہے۔ (TEINER) کا قول ہے کہ

"انسانی ماحول کے متعلق انسان کا وہ رویّہ جو مستقل ہو اور اس کا مظاہرہ اس کے اعمال سے ہوتا رہے، کیریکٹر کہلاتا ہے۔"

(THE CONCEPT AND EDUCATION OF CHARACTER)

آپ نے دیکھا کہ کیریکٹر کی ان (DEFINITIONS) سے بات صاف نہیں ہوتی۔ آئیے ذرا عام فہم الفاظ میں دیکھیں کہ کیریکٹر کا مفہوم کیا ہے۔

ہمارے ہاں ایک عام محاورہ ہے ——— مال صدقۂ جان، جان صدقۂ آبرو ——— اس محاورہ کا پہلا حصّہ بالکل واضح ہے، یعنی مال بھی اپنی قیمت رکھتا ہے۔ یہ ایسی چیز ہے جسے حاصل کرنا اور سنبھال کر رکھنا چاہیئے۔ لیکن اگر کبھی ایسا ہو کہ مال اور جان میں سے ایک ہی چیز باقی رہ سکتی ہے تو اُس وقت جان کی حفاظت کے لئے مال کی پرواہ نہیں کرنی چاہیئے۔ لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص ایسا کرتا ہے ——— یعنی جان کی حفاظت کے لئے مال قربان کر دیتا ہے ——— تو اس کے متعلق یہ نہیں کہا جاتا کہ اس کا کیریکٹر بڑا ابلند ہے، نہ ہی اس شخص کے متعلق جو جان دے دیتا ہے لیکن پیسہ ہاتھ سے نہیں چھوڑتا یہ کہا جاتا ہے کہ اس کا کیریکٹر بہت پست تھا۔ آپ نے اس بنیئے کا قصّہ سنا ہو گا جو سخت بیمار ہو گیا اور اس کا بیٹا سول سرجن کو بلا لایا ——— اس لئے نہیں کہ اس کے علاج سے اس کے باپ کو شفا ہو جائے گی بلکہ اس لئے کہ برادری والے یہ نہ کہیں کہ اِس نے باپ کا اچھی طرح علاج نہیں کرایا ——— سول سرجن نے مریض کو دیکھا، مرض کی تشخیص کی، پھر نسخہ لکھا جس میں مختلف قسم کی قیمتی دوائیں تجویز کیں۔ ڈاکٹر رخصت ہوا تو بیٹا نسخہ لے کر بازار کو چلا گیا باپ نے آواز دی اور پوچھا کہ کہاں چلے جا رہے ہو؟ اس نے کہا کہ بازار سے دوائیاں خرید نے جا رہا ہوں تاکہ علاج شروع کیا جائے۔ باپ نے کہا کہ یونہی بلا پوچھے گچھے دوائیاں نہ خریدنا۔ پہلے پنڈت جی کے پاس جانا اور معلوم کرنا کہ کریا کرم، (تجہیز و تکفین) پر کیا خرچ ہو گا اور پھر دوائیوں کی قیمت دریافت کرنا۔ دونوں میں سے جو طریق سستا ہو اُسے اختیار کرنا۔

مال صدقۂ جان

آپ کو بنیئے کی اس بات پر بے اختیار ہنسی آ جائے گی۔ لیکن آپ اس کے متعلق یہ نہیں کہیں گے کہ اس کا کیریکٹر پست تھا۔ آپ یہی کہیں گے کہ وہ بڑا بے وقوف تھا۔ جان کی حفاظت ——— (PRESERVATION OF SELF) ایک جذبہ ہے جو ہر ذی حیات میں جبلّی طور پر ——— (BY INSTINCT) پایا جاتا ہے۔ چیونٹی کو دیکھئے ننھی سی جان ہے، لیکن اگر کوئی اس کے راستے میں ذرا سی رکاوٹ بھی ڈالے جس سے اسے خطرہ محسوس ہو تو وہ اپنی حفاظت کے لئے کس قدر ہاتھ

پاؤں مارتی ہے؟ یہ جذبہ تمام حیوانات میں پایا جاتا ہے۔ اس لئے اگر انسان بھی اپنی حفاظت کے لئے مال قربان کر دیتا ہے تو اس میں بلندیٔ اخلاق کی کوئی بات نہیں۔ یہ حیوانی سطحِ زندگی کے ایک جبلّی جذبہ کا مظاہرہ ہے۔ جو انسان اس کے خلاف کرتا ہے اسے عقل و ہوش سے عاری سمجھا جاتا ہے۔ جو اپنے آپ کو نقصان پہنچائے اُسے پاگل کہتے ہیں۔

جان صدقۂ آبرو

اب اس محاورے کے دوسرے حصّے کو لیجئے، یعنی "جان صدقۂ آبرو" اس کا مطلب یہ ہے کہ جان بھی اپنی قیمت رکھتی ہے اور اس کا تحفّظ نہایت ضروری ہے۔ لیکن اگر ایسا وقت آجائے کہ جان اور آبرو میں (TIE) پڑ جائے یعنی جب ان دونوں میں سے صرف ایک کو بچایا جاسکتا ہو تو پھر انسان کو چاہیئے کہ جان دے دے، لیکن آبرو پر آنچ نہ آنے دے۔ جو شخص آبرو کو بچانے کے لئے جان دے دیتا ہے، ساری دنیا اس کے متعلق کہتی ہے کہ اس نے بلند کیریکٹر کا ثبوت دیا ہے۔ اس کے برعکس، جو شخص آبرو کو جانے دے اور اپنی جان بچالے، اسے انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کے متعلّق ہر شخص کہتا ہے کہ اس کا کیریکٹر بہت پست ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، جان بچانے کا جذبہ ہر انسان میں جبلّی طور پر پایا جاتا ہے۔ اس لئے جو شخص (مثلاً مال کی قربانی سے) جان بچا لیتا ہے اس کے متعلّق یہ نہیں کہا جاتا کہ اس کا کیریکٹر بہت بلند ہے۔ اس کے برعکس، آبرو کا تعلّق حیوانی دنیا سے نہیں۔ حیوانات، آبرو کے تصوّر سے بھی آشنا نہیں ہوتے۔ یہ صرف انسانی خصوصیّت ہے۔ اس کا تعلّق شرفِ انسانیّت سے ہے۔

کیریکٹر کی تعریف

اس لئے جو شخص جان دے کر شرفِ انسانیّت کو بچا لیتا ہے، اس کے متعلّق کہا جاتا ہے کہ اس کا کیریکٹر بہت بلند ہے۔ آبرو انسانی قدر (HUMAN VALUE) ہے۔ اس قسم کی اور اقدار بھی ہیں، جن کا تعلّق انسانیّت سے ہے۔ ان اقدار کا تحفّظ زندگی کو حیوانی سطح سے بلند کر کے انسانی سطح پر لے جاتا ہے۔ لہٰذا بات یوں ہوئی کہ جو شخص کسی انسانی قدر کی حفاظت کے لئے اپنے طبعی تقاضے کو قربان کر دیتا ہے، اسے کیریکٹر والا انسان کہتے ہیں۔ آئندہ سطور میں اسی اجمال کی تفصیل آپ کے سامنے آئے گی۔

ہم نے اوپر دیکھا ہے کہ آبرو کے تحفّظ کے لئے جان دے دینے والا، صاحبِ کردار کہلاتا ہے۔ آبرو ایک جامع لفظ ہے جس کا اطلاق انسانیّت کے مختلف گوشوں پر ہوتا ہے۔ مثلاً جب یہ کہا جائے کہ خدا نے میری آبرو

رکھ لی تو اس سے مطلب یہ ہوتا ہے کہ مجھے اپنے ہم عصروں میں شرمندہ نہیں ہونا پڑا۔ لیکن آبرو کا ایک مفہوم ایسا ہے جو بہت نمایاں ہے۔ اس کا تعلق عِفّت و عِصمت سے ہے۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ اس لڑکی نے اپنی آبرو بچانے کے لئے جان تک دے دی تو اس سے عِفّت و عِصمت ہی مقصود ہوتی ہے۔ آبرو کے اس مفہوم کو سامنے رکھئے اور پھر ان مثالوں پر غور کیجئے جو ابھی بیان کی جاتی ہیں۔ ہمارے ہاں اگر کوئی بدباطن کسی شریف زادی کے بُرقعے کی طرف بھی بُری نگاہ سے دیکھے تو اس لڑکی کا باپ یا بھائی اس شخص کو گولی مار دے گا، خواہ اس کے لئے اسے پھانسی کے تختے پر بھی کیوں نہ چڑھنا پڑے —— لیکن یورپ

آبرو کا معیار

میں کوئی لڑکی اپنے آپ کو کسی نوجوان کی آغوش میں بھی کیوں نہ دے دے اُس کے باپ یا بھائی کی پیشانی پر شکن تک نہیں پڑے گی، بلکہ وہ خوش ہوں گے کہ ان کی لڑکی (یا بہن) سوسائٹی میں بڑی ہر دلعزیز (POPULAR) ہو رہی ہے۔ اس نے اپنا (BOY FRIEND) تلاش کر لیا ہے۔

اس سے ایک اہم سوال ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ ہم نے اوپر دیکھا ہے کہ جو شخص کسی انسانی قدر (HUMAN VALUE) کی حفاظت کرتا ہے اسے کیریکٹر کا مالک قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن جو مثال ابھی ابھی ہمارے سامنے آئی ہے اس سے مترشح ہوتا ہے کہ "انسانی اقدار" ہر معاشرہ (SOCIETY) کی اپنی اپنی ہیں۔ ایک قدر جو ہمارے معاشرہ میں اس قدر اہمیت رکھتی ہے، دوسرے معاشرہ میں اسے قدر ہی نہیں سمجھا جاتا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مختلف معاشروں میں کیریکٹر کا معیار مختلف ہوگا۔ اور ہم کسی چیز

اقدار مختلف ہیں

کو انسانی کیریکٹر یا عالمگیر کیریکٹر قرار نہیں دے سکیں گے۔ ہم ماں باپ کی اس قدر عزّت اور تعظیم کرتے ہیں، لیکن ایسے قبائل بھی گذرے ہیں جو ماں باپ کو کھا جانا ایک مقدّس فریضہ سمجھتے تھے۔ مقدس (PURITANS) حبشی بچّوں کو چرا کر لے جانے اور آئرستان کے باشندوں کو گولی مار دینے میں کوئی قباحت نہیں سمجھتے تھے۔ یہودیوں کے ہاں ایک دوسرے سے سود لینا معیوب بلکہ جرم تھا لیکن غیر یہود سے سود لینے کی عام اجازت تھی۔ بحرالکاہل کے قریب ایک قبیلہ ہے جس کے نزدیک بددیانتی پسندیدہ ترین اخلاق سمجھی جاتی ہے جو شخص جس قدر کامیابی سے دھوکا دے سکتا ہو اسے اسی قدر عزّت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ ٹھگوں کے ہاں وہ نوجوان سب سے زیادہ قابلِ فخر سمجھا جاتا ہے جو مظلوم راہرو کو پُرفریب طریق پر قتل کر ڈالے۔[1]

---

[1] انسان نے کیا سوچا؟ - ص ۱۳۵

نیشنلزم آج ساری دنیا کا مسلّمہ اندازِ سیاست و اجتماعیّت ہے۔ اس مسلک کی رُو سے جو شخص دوسری قوموں کو لوٹ کھسوٹ کر اپنی قوم کی مرفہ الحالی کا سامان بہم پہنچائے، اسے سب سے بڑا محبِّ وطن سمجھا جاتا ہے۔ اس کے مجسّمے نصب ہوتے ہیں اور اس کا شمار بلند ترین انسانوں میں کیا جاتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا عقیدہ (RUMELIN) کے الفاظ میں یہ ہے کہ

"مملکت کا بنیادی فریضہ اپنے مفاد کے تحفّظ اور اپنی قوّت کی نشوونما ہے۔ اسے کسی دوسری مملکت کے مفاد کا خیال صرف اسی صورت میں رکھنا چاہیئے جب اس سے اس کے اپنے مفاد پر زد نہ پڑتی ہو۔ مملکت کا استحکام ہر اخلاقی تقاضے پر مقدّم ہے اور اس کے لئے ہر قربانی جائز ہے[1]"

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ

(۱) کیریکٹر نام ہے انسانی اقدار کے تحفّظ کا ـــــــ لیکن

(۲) یہ اقدار ہر معاشرہ میں مختلف ہیں، حتیٰ کہ نیشنلزم کے مسلک کی رُو سے اپنی قوم کے مفاد کا تحفّظ بلند ترین قدر ہے، خواہ اس کے لئے کچھ بھی کیوں نہ کرنا پڑے۔

لہٰذا، اس تصوّر کی رُو سے، دنیا میں نہ کوئی عالمگیر مستقل اقدار ہیں اور نہ ہی کیریکٹر کا کوئی عالمگیر مستقل معیار۔ کیریکٹر کے معنی ہوں گے ان اقدار سے ہم آہنگ رہنا جنہیں کوئی معاشرہ کسی وقت اپنے ہاں مستحسن قرار دے لے۔ سپارٹا میں چوری کرنا مستحسن خیال کیا جاتا تھا۔ اس لئے وہاں سب سے بڑا چور سب سے بلند کیریکٹر کا انسان تصوّر ہوتا تھا۔ آج چوری کرنا جرم ہے، اس لئے چور بدترین کیریکٹر کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں کسی کنواری لڑکی کا حاملہ ہوجانا سارے خاندان کی رسوائی کا موجب قرار پا جاتا ہے، لیکن یورپ میں کسی بالغ جوڑے کا باہمی رضامندی سے اختلاط نہ عیب سمجھا جاتا ہے نہ جُرم۔ حتیٰ کہ اب وہاں تراضیٔ مابین سے اغلام کو بھی معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ اس کی وہاں قانوناً اجازت ہے۔

قرآنی نقطۂ نگاہ

یہ ایک نقطۂ نگاہ ہے، یعنی جس بات کو کوئی معاشرہ معیوب قرار دے، تو اس کا ارتکاب قابلِ نفرت اور مستوجبِ سزا ہے۔ جب وہ ایسا تصوّر نہ کرے، اس کا ارتکاب نہ بے عزّتی کا باعث ہے نہ موجبِ عقوبت۔ لیکن قرآن کا نقطۂ نگاہ

[1] "انسان نے کیا سوچا؟" - ص ۱۹۵ -

دوسرا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مختلف ممالک میں بسنے والے انسانوں کا طرزِ معاشرت اور اندازِ بود و باش مختلف ہو سکتا ہے لیکن ان کی اقدار مختلف نہیں ہو سکتیں۔ انسانی اقدار ہر جگہ ایک ہی ہونی چاہئیں اور ایسی ہونی چاہئیں جن میں کوئی ردّ و بدل نہ کر سکے۔ یہ اقدار عقلِ انسانی وضع نہیں کر سکتی۔ یہ وحی کے ذریعے ملتی ہیں۔ آج یہ اقدار قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہیں جو تمام نوعِ انسانی کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ضابطۂ ہدایت ہے۔ انہیں مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کہا جاتا ہے۔ ان اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نام کیریکٹر ہے۔ قرآن اسے "تقویٰ" کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ مغرب کے مشہور عالمِ اخلاقیات راشڈل (HASTING RASHDAL) کے الفاظ ہیں :-

"اخلاقیات سے مفہوم ہی یہ ہے کہ دنیا میں اقدار کے لئے ایک مطلق معیار ہے جو ہر انسان کے لئے یکساں ہے۔" (THE THEORY OF GOOD AND EVIL VOL.II P-286)

جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے یہ اقدار عقلِ انسانی کی وضع کردہ نہیں ہو سکتیں۔ یہ وحی کے ذریعہ ملتی ہیں۔ اس باب میں راشڈل کہتا ہے :-

"اس قسم کا اخلاقی قانون کسی انسانی شعور سے نہیں مل سکتا۔ انسان اخلاقی مسائل کے متعلق الگ الگ نگاہ رکھتا ہے اور اس امر کی ہمارے پاس کوئی خارجی دلیل نہیں کہ دنیا کے تمام انسان اخلاقیات میں کبھی ایک ہی نگاہ رکھیں گے۔" (ایضاً۔ ص ۲۱۱)

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ ان اقدار کا تعلق انسان کی انسانی سطحِ زندگی (HUMAN LEVEL OF LIFE) سے ہے حیوانی سطح سے نہیں۔ حیوانی سطحِ زندگی کو طبیعی زندگی (PHYSICAL LIFE) کہہ لیجئے۔ قرآن اسے "حیوٰۃ الدنیا" کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے، جس سے مراد ہے ایسی زندگی جس میں انسان کی نگاہ قریبی یا پیش پا افتادہ مفاد پر ہی رہے۔ (لفظ دنیا کے معنی "قریب تر" کے ہیں) انسان کو اپنے حیوانی تقاضوں کی تسکین میں بڑی لذت ملتی ہے۔ (اگرچہ یہ لذت بڑی سطحی ہوتی ہے) قرآن کی رو سے ان لذات کا حصول بُری چیز نہیں، وہ انہیں وجہِ جاذبیت قرار دیتا ہے۔ لیکن اصل سوال وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں اس سطحِ زندگی کے کسی تقاضے اور "انسانی قدر" میں (TIE) پڑتی ہے۔ اس وقت اگر کوئی شخص اِس حیوانی تقاضے کو ترجیح دے کر انسانی قدر کو قربان کر دیتا ہے تو وہ بلندیٔ کردار کا ثبوت نہیں دیتا لیکن اگر وہ انسان قدر کے تحفظ کو حیوانی تقاضے پر ترجیح دیتا ہے تو اسے کیریکٹر کہا جائے گا۔ مثلاً قرآن کریم میں

ہے۔ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ۔ اے ایمان والو! تم عدل و انصاف کی پوری پوری حفاظت کرو۔ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ۔ اگر تمہیں کبھی ـــــ گواہی دینی پڑے تو اپنے اور بیگانے سب کے خیال سے بلند ہو کر صرف اللہ کے لئے شہادت دو۔ وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ۔ خواہ یہ شہادت خود تمہارے اپنے خلاف ہی کیوں نہ جائے یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں کے خلاف۔ اِنْ یَّکُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا۔ فَاللّٰہُ اَوْلٰی بِھِمَا۔ اس کا بھی خیال نہ کرو کہ جس کے حق میں تمہاری شہادت جا رہی ہے، وہ امیر ہے یا غریب۔ قانونِ خداوندی، امیر اور غریب دونوں کا سب سے زیادہ محافظ اور چارہ ساز ہے۔ لہٰذا خدا کا حق سب سے زیادہ ہے۔ فَلَا تَتَّبِعُوا الْھَوٰٓی اَنْ تَعْدِلُوْا۔ دیکھو! کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اپنے مفاد، رشتہ داری کے تقاضے، یا دولتمندی کی وجاہت کا خیال، تمہیں انصاف سے روک دے۔ اس باب میں تم اپنے کسی جذبے کی پروا مت کرو۔ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا۔ (۴/۱۳۵) ایسا بھی نہ ہو کہ تم شہادت دیتے وقت کوئی گول مول یا پیچدار بات کہو یا ویسے ہی ٹال جاؤ۔ یاد رکھو! اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔

آپ دیکھئے کہ یہاں حیوانی اور انسانی اقدار میں کس طرح (TIE) پڑتی ہے۔ عدل کی پاسبانی اور اس کے لئے سچی شہادت مستقل اقدار میں سے ہے۔ اس کے برعکس، مفادِ خویش، اعزاء و اقرباء کے تعلقات کا خیال، فریقِ مخالف کی دولت اور وجاہت کے اثرات کا تصور، قدم قدم پر عناں گیر ہو رہا ہے کہ اگر سچی گواہی دی تو یہ نقصان ہوگا' وہ ضرر پہنچے گا۔ لیکن ان تمام نقصانات کا تعلق انسان کی طبیعی زندگی سے ہے۔ اس کش مکش میں جو شخص ان طبیعی تقاضوں کو ترجیح دے کر جھوٹی شہادت دیتا ہے' یا شہادت دینے سے پہلوتہی کرتا ہے' اس کا کیریکٹر پست ہے (قرآن اسے اتّباعِ ہوٰی سے تعبیر کرتا ہے۔ ہوٰی کے بنیادی معنوں میں پستی کی طرف لے جانے کا مفہوم ہے)۔ لیکن جو شخص ان تمام امیال و عواطف کو نظر انداز کر کے حق کی گواہی دیتا ہے' وہ بلند کردار کا حامل ہے۔ حیوانی جذبات اور انسانی اقدار کی یہ جنگ زندگی کے ہر دوراہے پر ہوتی ہے۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ ان دوراہوں پر آپ کا قدم کس طرف اٹھتا ہے۔

انسان ایسا کیوں کرے؟

اس مقام پر یہ اہم سوال سامنے آتا ہے کہ انسان اپنے طبیعی (حیوانی) تقاضے کو قربان کر کے انسانی اقدار کی حفاظت کیوں کرے؟ طبیعی تقاضوں میں بڑی کشش و جاذبیت ہوتی ہے۔ دولت، ثروت، عیش و آرام کی زندگی' عزت اور نام

کی شہرت، بلند مناصب و مدارج، قوّتِ اقتدار، حکومت، ان سب میں بڑی جاذبیت ہے۔ ان کے مقابلہ میں انسانی اقدار کے تحفّظ میں کونسی لذّت یا منفعت ہے، جس کی خاطر انسان ان تمام مفاد و منافع اور لذّات و حظائظ کو قربان کر دے؟ یہ سوال بڑا اہم ہے اور جب تک اس کا اطمینان بخش جواب سامنے نہ آئے انسان اس قدر منافع و لذّات کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا۔ آج دنیا میں جو اس قدر کیریکٹر کا فقدان نظر آتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کو اس سوال کا اطمینان بخش جواب نہیں ملتا۔ انسان مفاد پرست واقع ہوا ہے۔ ذاتی مفاد کا خیال اس کے دل سے نکالا نہیں جا سکتا۔[1] وہ مفادِ خویش کی خاطر انسانی اقدار کی اس لئے پروا نہیں کرتا کہ اسے ان اقدار کی نگہبانی میں اپنا کوئی فائدہ دکھائی نہیں دیتا۔ اگر اسے اس امر کا یقین ہو جائے کہ انسانی اقدار کا تحفّظ، حیوانی تقاضوں کی تسکین کے مقابلے میں زیادہ منفعت بخش ہے تو وہ یقیناً ان اقدار کے تحفّظ کے لئے وہ سب کچھ کر گزرے گا جو وہ آج اپنے حیوانی مفاد کے تحفّظ کے لئے کرتا ہے ——— بلکہ اس سے بھی زیادہ ——— اس حقیقت کو ایک مثال سے سمجھیئے۔

ایک شخص کئی دنوں کا بھوکا ہے، اتنا بھوکا کہ نقاہت کی وجہ سے اس سے اٹھا تک نہیں جاتا۔ اتنے میں ایک آدمی، گرم گرم پلاؤ کا قاب اس کے سامنے لا کر رکھ دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اس قاب پر جھپٹ پڑیگا۔ وہ جلدی سے لقمہ اٹھاتا ہے اور اُسے منہ کے قریب لے جاتا ہے کہ دوسرا شخص اس سے کہتا ہے کہ اس پلاؤ میں اور تو ہر چیز نہایت عمدہ اور خالص ہے لیکن غلطی سے اس میں نمک کی جگہ سنکھیا پڑ گیا ہے۔

آپ کا کیا خیال ہے کہ یہ سننے کے بعد، وہ اس لقمہ کو منہ میں ڈال لے گا یا قاب اٹھا کر باہر پھینک دیگا؟ وہ یقیناً قاب اٹھا کر پھینک دے گا۔ وہ اس پلاؤ کو ہاتھ تک نہیں لگائے گا۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ اسے یقین ہے کہ اس کے کھانے سے اس کی موت واقع ہو جائے گی۔ وہ بھوک کی تکلیف اور زندگی کے زیاں کا مقابلہ کرے گا اور اپنا فائدہ اسی میں دیکھے گا کہ بھوک کی تکلیف برداشت کر لے لیکن اپنی جان ضائع نہ کرے۔

اب اسی مثال میں اتنی سی تبدیلی کر لیجئے کہ جب اس نے پلاؤ کا لقمہ اٹھایا تو دوسرے شخص نے کہا کہ بھئی! یہ پلاؤ ویسے تو بالکل ٹھیک ہے لیکن ہے حرام کی کمائی کا۔ اب سوچیئے کہ وہ شخص اس لقمہ کو منہ میں ڈال لے گا یا قاب اٹھا کر باہر پھینک دے گا؟ وہ پلاؤ ضرور کھا لے گا اور اس بات کی ہزار تاویلیں کرے گا کہ

---

[1] مفادِ خویش کا تحفّظ درحقیقت جذبۂ تحفّظِ خویش (PRESERVATION OF SELF) ہی کی شاخ ہے۔

وہ جائز کمائی کا ہے۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ اسے پلاؤ کھا لینے میں تو اپنا فائدہ نظر آتا ہے لیکن اسے چھوڑ دینے میں کوئی فائدہ دکھائی نہیں دیتا۔ اگر اسے یقین ہوتا کہ اس پلاؤ کے کھانے سے بھی اس کی ہلاکت ہو جائے گی تو وہ اُسے اسی طرح اٹھا کر پھینک دیتا جس طرح اس نے سنکھیا والے پلاؤ کو اٹھا کر پھینک دیا تھا۔

سوال سارا یہ ہے کہ جب جسم کے کسی تقاضے اور انسانی قدر میں تصادم ہو جائے، اگر اس وقت انسان کو یہ یقین ہو کہ اس قدر کی حفاظت میں اس کا زیادہ فائدہ ہے تو وہ یقیناً اس کے تحفظ کے لئے جسم کے تقاضے کو قربان کر دے گا۔ آیئے یہ دیکھیں کہ اس مقصد کے لئے عام طور پر کیا کہا جاتا ہے اور قرآن اس اہم گتھی کو کس طرح سلجھاتا ہے۔ اخلاقیات کا سارا راز اسی میں ہے۔

مذہب پرست طبقہ کی طرف سے جواب

جن لوگوں کے نزدیک انسانی اقدار اپنا وجود ہی نہیں رکھتیں، سرِدست انہیں چھوڑیئے اور ان کی طرف آیئے جو ان اقدار کو تسلیم کرتے ہیں۔ ان میں ایک طبقہ وہ ہے جسے عام طور پر "مذہب٭ پرست" یا خدا پرست کہا جاتا ہے۔ ان کی طرف سے اس سوال کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ جن امور کو انسانی اقدار کہا جاتا ہے وہ خدا کے احکام ہیں۔ ان کی اطاعت سے خدا خوش ہو جاتا ہے اور اگر اس کے احکام کو نہ مانا جائے تو وہ ناراض ہو جاتا ہے اور مرنے کے بعد جہنم میں ڈال دیتا ہے۔ لہٰذا انسان کو خدا کی ناراضگی اور اس کے عذاب سے ڈرتے رہنا چاہیئے اور اس کے احکام کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہیئے۔

ظاہر ہے کہ اس انداز کے جواب سے انسان اُس زمانے میں تو مطمئن ہو سکتا تھا، جب اس کا ذہن ہنوز عہدِ طفولیت میں تھا، لیکن اب یہ جواب اس کے لئے وجہِ اطمینان نہیں ہو سکتا۔ آپ ایک بچے سے تو ڈرا دھمکا کر اپنا حکم منوا سکتے ہیں، بڑے آدمی سے نہیں منوا سکتے۔ بڑا آدمی اگر بعض حالات میں اس کے لئے آمادہ ہو بھی جائے، تو بھی اس کا دل اس کے خلاف بغاوت کرتا رہے گا اور اِس موقع کی تلاش میں رہے گا کہ وہ ڈر کے بندھنوں کو توڑ کر آزاد ہو جائے۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ جو بات محض کسی کے ڈر سے کی جائے، اس میں کیریکٹر کی بلندی کا کیا سوال؟ لہٰذا مذہب پرست طبقہ کا یہ جواب، اس مقصد کے حصول کے لئے اطمینان بخش ثابت نہیں ہو

٭ اسلام، دین ہے مذہب نہیں۔ اس لئے اسلام کا شمار مذاہب میں نہیں ہوتا۔

سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ آجکل مذہب کی گرفت دلوں پر سے ڈھیلی پڑ رہی ہے۔

مفکّرین کا طبقہ

دوسرا طبقہ مفکّرین کا ہے۔ اس باب میں ان کا کیا خیال ہے، اس کے متعلق بہت سے مفکّرینِ مغرب کے اقوال پیش کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس سے بات لمبی ہو جائے گی۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر ہم اس ضمن میں ایک آدھ مفکّر کا نظریہ پیش کر دیں تو مقصد پیشِ نظر کے لئے وہی کافی ہوگا۔ مغربی مفکّرین میں جو مقام کانٹ کو حاصل ہے وہ اربابِ فکر سے پوشیدہ نہیں ——— کانٹ کے نزدیک اخلاقیات کی ساری عمارت انسان کے نیک ارادے (GOOD WILL) کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

"اس دنیا میں، بلکہ اس سے باہر بھی کوئی چیز ایسی نہیں جسے بلا مشروط خیرِ محض کہا جا سکے، سوائے نیک ارادے کے"

اور نیک ارادے کی تعریف (DEFINITION) کانٹ کے نزدیک یہ ہے کہ

"وہ ارادہ جو کسی کام کو محض اس لئے کرتا ہے کہ اس کا کرنا فرض (DUTY) ہے۔"

یعنی ہر قسم کے افادی تصوّر سے بے نیاز ہو کر، فرض کو محض فرض سمجھ کر ادا کرنا، نیک ارادہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جس عمل میں (خواہ وہ کتنا ہی نیک کیوں نہ ہو) ذرّہ بھر بھی صلہ کی امید یا معاوضہ کا تصوّر شامل ہو جائے وہ عمل، عملِ خیر نہیں رہتا۔ اس کے نزدیک عملِ خیر کی قیمت وہ اصول ہوتا ہے جس کے مطابق وہ عمل ہوتا ہے۔ اس نظریہ کے تحت کانٹ کے نزدیک، اصول بھی دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو انسان کو کسی مقصد کے حصول کے لئے آمادۂ عمل کریں۔ انہیں کانٹ مادی اصول (MATERIAL MAXIMS) قرار دیتا ہے اور دوسرے وہ جو کسی مقصد کے تصوّر کے بغیر آمادۂ عمل کریں۔ ان کا نام ذاتی کی اصطلاح میں (A PRIORI MAXIMS) ہے۔ اس کے نزدیک اصولِ انسان کے اندر فرض (DUTY) کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ اس قسم کے اصول کو وہ امرِ غیر مشروط (CATE GORICAL IMPERATIVE) کہہ کر پکارتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:-

"امرِ غیر مشروط سے مفہوم یہ ہے کہ اس سے ایسا کام ظہور میں آئے جس سے کسی مقصد کا حصول مقصود نہ ہو، بلکہ وہ کام اپنی ذات میں واجب العمل ہو۔"

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اگر اسے عام فہم الفاظ میں بیان کیا جائے تو مفہوم یہ ہوگا کہ انسانی اقدار انسان کیلئے فرائض ہیں۔ انہیں انسان کو فریضہ سمجھ کر ادا کرنا چاہیئے نہ کہ کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ۔ ان کے "فرائض" ہونے کے لئے نہ کوئی دلیل دی جا سکتی ہے اور نہ ہی ان فرائض کی سرانجام دہی سے کسی صلہ یا معاوضہ کی توقع رکھنی چاہیئے۔

ظاہر ہے کہ یہ نظریہ فکری طور پر کتنا ہی بلند آہنگ اور خوش آئند کیوں نہ ہو، انسان کے دل میں ایسی چنگاری پیدا نہیں کر سکتا جس سے وہ مادی مفاد اور طبعی لذات کو قربان کر کے انسانی اقدار کے تحفظ کے لئے آمادۂ عمل ہو جائے۔ اس کے لئے کسی بڑے جذبۂ محرکہ کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ انسان "مفادِ خویش" کے خیال سے کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ یہ (ذہنی اور قلبی طور پر مطمئن ہو کر) کوئی ایسا کام نہیں کر سکتا، جس میں اسے اپنا فائدہ نظر نہ آئے یہی وجہ ہے کہ دنیا میں نہ فلاسفرز کے بلند آہنگ نظریات اور نہ تارک الدنیا ارباب تصوّف کے کیف آور پند و نصائح انسانوں کو "مفادِ خویش" سے بے نیاز کر کے مستقل اقدار کے محافظ بنا سکنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ان کی کامیابی زیادہ سے زیادہ چند افراد تک محدود رہی ہے، زندگی کا مسلک نہیں بن سکی۔ ان میں زندگی کا عالمگیر مسلک بننے کی صلاحیت صرف اس اصول میں ہے جسے قرآنِ کریم نے پیش کیا ہے۔ دیکھئے کہ وہ اس باب میں کیا کہتا ہے۔

قرآن کی رُو سے زندگی کے دو (۲) نظریئے

قرآن کہتا ہے کہ زندگی کے متعلق دو نظریئے ہیں۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ انسان حیوانات ہی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ اس کی زندگی بس طبیعی زندگی ہے۔ یہ طبیعی قوانین کے ماتحت زندہ رہتا ہے، اور انہی قوانین کے تابع ایک دن اس کے جسم کی مشینری چلتے چلتے بند ہو جاتی ہے اسے موت کہتے ہیں۔ اور موت کے ساتھ اس فرد کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تصوّرِ زندگی کے مطابق ———— انسان کے سب تقاضے حیوانی سطح زندگی کے تقاضے ہیں۔ اس میں انسانی اقدار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چونکہ انسانوں نے مل جل کر رہنا ہے اور اس طرح رہنے سے ان کے حیوانی تقاضوں کی تسکین میں ایک دوسرے سے تصادم ہو جاتا ہے۔ اس لئے سوسائٹی ایسے قوانین و ضوابط مرتب کرتی رہتی ہے جن سے ان تصادمات کا امکان کم ہو جائے۔ جو شخص ان قوانین و ضوابط کے مطابق

زندگی بسر کرتا ہے اسے پُر امن شہری کہا جاتا ہے۔ جو ان کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ عدالت میں سزا پاتا ہے یا سوسائٹی کی نظروں سے گر جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تصوّرِ حیات کی رُو سے

۱۔ سوسائٹی کے پاس کوئی مستقل اقدار یا اصول نہیں ہوتے۔ وہ جس قسم کے قوانین وضوابط مناسب سمجھے وضع کرے اور جب چاہے ان میں تغیّر و تبدّل یا حک و اضافہ کر لے۔

۲۔ ان قوانین وضوابط کے اتّباع کے لئے جذبۂ محرکہ صرف یہ ہوتا ہے کہ ان کی خلاف ورزی سے عدالت سے سزا مل جائے گی یا انسان سوسائٹی کی نظروں سے گر جائے گا۔ لہٰذا:

۳۔ اگر کوئی شخص ایسا انتظام کر لے کہ وہ ان قوانین کی خلاف ورزی کرے لیکن عدالت کی گرفت میں نہ آئے یا سوسائٹی اس کا محاسبہ نہ کرے تو پھر اسے ان قوانین کی پابندی کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔

۴۔ اس سوسائٹی میں کیریکٹر کی بلندی کا معیار صرف ایک ہوتا ہے اور وہ یہ کہ انسان اپنے ذاتی مفاد کو قوم اور ملک کے مفاد پر ترجیح نہ دے۔ ان کے ہاں قوم فروشی، قانونی جرم بھی ہوتا ہے اور سوسائٹی کی نظروں میں معیوب بھی۔ لیکن اگر کسی ملک میں قانونی نظام کمزور ہو جائے اور مفادِ خویش کا جذبہ ایسا عام ہو جائے کہ سارے کا سارا ملک اس رَو میں بہہ نکلے تو پھر نہ کوئی قوت ایسی رہتی ہے جو افرادِ قوم کو اس لوٹ سے باز رکھ سکے اور نہ کوئی جذبۂ محرکہ ایسا جو ان کے اندر کیریکٹر کے احساس کو بیدار کر سکے۔

اس وقت دنیا جس جہنّم میں سے گذر رہی ہے، اس کی وجہ، زندگی کا یہی تصوّر ہے۔

۔جن قوموں میں قومی مفاد کا شعور بیدار ہے وہ اپنی قوم سے باہر کے انسانوں کے لئے عذاب بن رہی ہیں۔ اور جن میں یہ شعور بھی باقی نہیں رہا وہ ایسے جذام میں مبتلا ہیں جس سے وہ اپنے آپ سے بھی نالاں ہیں اور ساری دنیا بھی اس سے نفرت کرتی ہے۔

کیریکٹر کی اس تعریف (DEFINITION) کی رُو سے، جسے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، اس تصوّرِ حیات کے مطابق کسی شخص میں کیریکٹر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس میں ہر انسان (یا انسانوں کا گروہ) اپنے طبیعی مفاد کو سامنے رکھتا ہے۔ جب دو (طبیعی) مفادات میں ٹکراؤ پیدا ہو تو وہ دونوں میں موازنہ کرتا ہے اور زیادہ فائدے کو تھوڑے فائدے پر ترجیح دیتا ہے۔ اسے آپ عقل مندی کہیں گے، کیریکٹر نہیں کہیں گے۔ حتیٰ کہ اس تصوّر کے ماتحت اگر کوئی شخص قومی مفاد کو ذاتی مفاد پر ترجیح دیتا ہے تو وہ بھی ایک زیادہ قیمتی طبیعی تقاضے کو کم قیمتی طبیعی تقاضے پر ترجیح دیتا ہے۔ (تفصیل

اس کی آگے چل کر بیش کی جائے گی)۔

دوسرا تصوّرِ حیات

یہ مختصرا ایک تصوّرِ زندگی اور اس کے نتائج وعواقب کا بیان ۔ قرآن کی رُو سے دوسرا تصوّرِ زندگی یہ ہے کہ انسان اس کے جسم ہی سے عبارت نہیں جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جسے انسانی ذات (HUMAN PERSONALITY) یا لنفس کہتے ہیں. قرآن اسے رُوحِ خداوندی (DEVINE ENERGY) کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے. انسانی زندگی کا مقصد اس کی ذات کی نشوونما ہے، چونکہ اس کی نشوونما کیلئے جسم کی بھی ضرورت ہوتی ہے اس لئے اس کے ساتھ جسمانی نشوونما بھی ضروری ہے. لیکن جسمانی نشوونما ذات کی نشوونما کا ذریعہ ہے مقصود بالذات نہیں۔ مقصود بالذّات انسانی ذات کی نشوونما ہی ہے۔

آپ کسی انسان کے دل کو ٹٹولیئے اور دیکھئے کہ اس کی عمیق ترین آرزو اور شدید ترین تمنا کیا ہے؟..... آپ دیکھیں گے کہ انسان کی سب سے زبردست خواہش یہ ہے کہ وہ زندہ رہے۔ کوئی انسان مرنا نہیں چاہتا۔ تحفّظِ خویش اس کی جبلّت کا تقاضا ہے اور اس کی عقل وہ تمام سامان وذرائع بہم پہنچاتی ہے جس سے اس کا یہ مقصد پورا ہوتا رہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جسے قرآن نے قصّہ آدم کے تمثیلی انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ابلیس نے انسان کے اس کمزور پہلو کو بھانپا۔ وہ اس کے پاس گیا اور نہایت مشفقانہ انداز میں کہا کہ کیا تمہیں ایک ایسا نسخہ بتاؤں جس سے تمہیں حیاتِ جاوید حاصل ہو جائے اور ایسا اقتدار مل جائے جسے کبھی زوال نہ ہو؟ یہ آدم (آدمی) کے دل کی خواہش تھی۔ وہ لپک کر آگے بڑھا اور ابلیس سے کہا کہ مجھے ضرور ایسا نسخہ بتاؤ۔ ابلیس نے کہا تم اپنے مرنے کے بعد اپنی اولاد کے ذریعہ زندہ رہ سکتے ہو۔ اس سے تمہارے نام کو حیاتِ دوام حاصل ہو سکتی ہے۔ ابلیس کا یہ افسوں کس درجہ کارگر ہوا، اس کا ثبوت روزمرّہ کی زندگی میں قدم قدم پر مل سکتا ہے۔ جس عمر رسیدہ آدمی کے ہاں اولاد (بالخصوص نرینہ اولاد) نہیں ہوتی، دیکھئے کہ وہ بیٹے کے لئے کس قدر تڑپتا ہے۔ وہ ہر سانس میں کہتا ہے کہ اگر میں اسی طرح مر گیا تو میرے گھر کا چراغ گل ہو جائیگا، میرا نام ونشان مٹ جائے گا، میرے نسب کا شجرہ منقطع ہو جائے گا، میرے خاندان کی جڑ کٹ جائے گی۔

لیکن خدا نے انسان سے کہا کہ یہ ابلیس کا فریب ہے۔ یہ مادّی تصوّرِ حیات کا افسوں ہے۔ باپ کی زندگی اپنی ہے، اولاد کی اپنی۔ اولاد کے زندہ رہنے سے باپ کو حیاتِ جاوید نہیں مل سکتی۔ حیاتِ جاوید حاصل ہونے کا طریقہ کچھ اور ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اگر انسانی ذات کی مناسب نشوونما ہو جائے تو انسان کی طبعی موت سے

اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ وہ مرنے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے ــ اور ہمیشہ کے لئے زندہ ــ انسان کو حیاتِ جاوید انسانی ذات کی نشوونما سے مل سکتی ہے۔ اس نے انسان کی عمیق ترین آرزو اور شدید ترین تمنا کی برآوری کیلئے یہ طریق بتایا۔

اس نے یہ بھی بتا دیا کہ زندگی کی موجودہ سطح پر ذات کی نشوونما جسم کے ذریعہ ہوتی ہے۔ اس لئے انسانی جسم کا تحفظ اور اس کے تقاضوں کی تسکین بھی ضروری ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ جیسے انڈے میں اس کی صلاحیت ہوتی ہے کہ اگر اس کی مناسب نشوونما ہو جائے تو اس کے اندر مضمر حیات ایک جیتے جاگتے چوزے کی شکل اختیار کر لے لیکن اس کے لئے انڈے کے خول کا محفوظ اور مضبوط ہونا ضروری ہے لیکن انڈے کا خول بہرحال انڈے کی امکانی صلاحیتوں کے برومند ہونے کا ذریعہ ہے، مقصود بالذات نہیں۔ اسی طرح انسانی جسم، اس کی ذات کی نشوونما کا ذریعہ ہے مقصود بالذات نہیں۔

اس نے یہ بھی بتا دیا کہ جس طرح انسانی جسم کی نشوونما کے لئے طبعی قوانین مقرر ہیں، اسی طرح انسانی ذات کی نشوونما کے لئے بھی کچھ قوانین ہیں۔ ان قوانین کو انسانی اقدار یا مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کہتے ہیں۔ یہ اقدار وحی کے ذریعہ ملتی ہیں اور اب قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہیں۔
جس طرح جسم کی پرورش کے قوانین عالمگیر ہیں اسی طرح یہ مستقل اقدار بھی عالمگیر ہیں۔
ان تصریحات کی روشنی میں آپ دیکھئے کہ جو شخص اس تصوّرِ حیات پر ایمان رکھتا ہے اس کی زندگی (اور زاویۂ نگاہ) میں اور اس شخص کی زندگی (اور زاویۂ نگاہ) میں جو مادی تصوّرِ حیات رکھتا ہے، کتنا وسیع اور گہرا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً

۱۔ مادی تصوّرِ حیات کی رُو سے انسان کی طبعی زندگی اور تقاضے مقصود بالذات ہوتے ہیں، اس لئے اس کے سامنے نہ طبعی تقاضوں سے بلند کوئی اور تقاضا ہوتا ہے اور نہ طبعی قوانین سے بالاتر کوئی اور قوانین اور اقدار۔ لیکن

۲- قرآنی تصوّرِ حیات کی رُو سے، انسانی جسم اور اس کے تقاضے، مقصود بالذّات نہیں ہوتے، ایک بلند مقصد (استحکامِ ذات) کے حصول کا ذریعہ ہوتے ہیں اور دونوں میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے۔

۳- قرآنی تصوّرِ حیات کی رُو سے جسم کے تقاضوں کی تسکین بھی ضروری ہوتی ہے، لیکن جب کبھی جسم کے کسی تقاضے اور اس کی ذات کے تقاضے (یا طبیعی تقاضا اور مستقل اقدار کے تقاضا) میں ٹکراؤ ہوتا ہے تو وہ ذات کے تحفّظ کے لئے جسمانی تقاضے کو قربان کر دیتا ہے۔ اس لئے کہ کوئی صاحبِ عقل و ہوش "ذریعے" کو بچانے کے لئے "مقصد" کو قربان نہیں کرتا۔ جب اس شخص نے سنکھیا والے پلاؤ کو پھینک دیا تھا تو اس لئے　　کہ پلاؤ، اس کی جان بچانے کا ذریعہ تھا، لیکن جب وہ ذریعہ اس کی جان کی ہلاکت کا موجب بن گیا تو اس نے جان کی حفاظت کی خاطر ذریعہ کو چھوڑ دیا۔

۴- قرآنی تصوّرِ حیات پر ایمان رکھنے والا مستقل اقدار کی حفاظت، کسی کا حکم یا فریضہ سمجھ کر نہیں کرتا۔ وہ اس میں اپنا فائدہ دیکھتا ہے۔ وہ طبیعی تقاضا اور مستقل اقدار کے ٹکراؤ کے وقت، دونوں میں موازنہ کرتا ہے اور دیکھتا ہے کہ ان میں سے کس کے تحفّظ میں اس کا زیادہ فائدہ ہے۔ وہ طبیعی تقاضا کے تحفّظ میں طبیعی (لہٰذا عارضی) حیات کا فائدہ دیکھتا ہے اور مستقل قدر کے تحفّظ میں، انسانی (لہٰذا دائمی) حیات کا فائدہ۔ لہٰذا خود اس کی عقل کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ وہ زیادہ فائدہ کی خاطر کم فائدہ کو قربان کر دے۔ اقبالؒ صرف طبیعی تقاضوں کا تحفّظ کرنے والی عقل کو "عقلِ خود بیں" اور طبیعی اور انسانی ذات دونوں کے تقاضوں کا تحفّظ کرنے اور ان میں موازنہ کرنے والی عقل کو "عقلِ جہاں بیں" کہہ کر پکارتا ہے۔ قرآن طبیعی تقاضوں کو قریبی زندگی (حیوٰۃ الدنیا) کے مفاد اور انسانی ذات کے تقاضوں کو مستقبل (آخرت) کے مفاد سے تعبیر کرتا ہے اور مومنین کو اولوالالباب کہہ کر پکارتا ہے، یعنی بلند سطح کی عقل کے حامل انسان۔

۵- اس سے ظاہر ہے کہ مستقل اقدار کا تحفّظ، خود انسان کی عقل کا تقاضا ہو جاتا ہے۔ انسانی عقل ہمیشہ مفادِ خویش چاہتی ہے۔ جب وہ دو مفادات میں موازنہ کرتی ہے تو وہ بڑے فائدے کی خاطر چھوٹے فائدے کو چھوڑ دیتی ہے۔ حیوانی سطحِ زندگی پر انسان کی عقل کا درجہ پست ہوتا ہے۔ انسانی سطح (یعنی مومن کی سطح) پر اس کا درجہ بلند ہو جاتا ہے۔ مومن کی عقل، بلند سطح کی عقل ہوتی ہے۔

۶- جو کام عقلِ خود بیں کے تقاضے سے کیا جائے اسے (عام اصطلاح کے مطابق) عقل مندی کہا جائے گا۔ لیکن جو کام،

عقلِ جہاں بیں کے تقاضے سے کیا جائے اسے عقل مندی اور کردار دونوں کا مجموعہ قرار دیا جائے گا۔ مومن کے ہاں ایمان اور عقل میں قطعاً مغائرت نہیں ہوتی۔

تصریحاتِ بالا سے آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ جب تک انسان اس تصوّرِ حیات پر ایمان نہ لائے (اس کی صداقت کا یقین نہ کرے) کہ

ایمان کی ضرورت

۱۔ انسان صرف اس کے جسم سے عبارت نہیں، جسم کے علاوہ انسانی ذات بھی ہے جس کی نشوونما مقصودِ زندگی ہے۔

۲۔ ذات کی نشوونما کے لئے اسی طرح قوانین مقرر ہیں جس طرح جسم کی پرورش کے لئے ان قوانین کو مستقل اقدار کہتے ہیں۔

۳۔ یہ مستقل اقدار خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ملتی ہیں۔ اور

۴۔ انسان کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات پر پڑتا ہے۔

اُس وقت تک اُس کیریکٹر کا سوال ہی سامنے نہیں آتا جس کا تعلّق عالمگیر شرفِ انسانیّت سے ہے۔

راشڈل لکھتا ہے کہ مستقل اقدار ماننے کے لئے

۱۔ سب سے پہلے یہ ماننا ضروری ہے کہ کائنات بلا مقصود نہیں پیدا کی گئی، بلکہ اس کی تخلیق سے مقصد یہ ہے کہ یہ وہ سامان فراہم کرے جس سے انسانی ذات منزلِ مقصود تک جا پہنچے۔

۲۔ دوسرے یہ ماننا ضروری ہے کہ انسانی ذات۔

(ا) ایک مستقل حقیقت ہے۔

(ب) اس کی اپنی مستقل زندگی ہے، یعنی مادی جسم کے تغیرات اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔
(ج) یہ اپنے تمام افعال کی سبب آپ ہے۔

۳۔ تیسرے یہ ماننا ضروری ہے کہ انسان کے موجودہ عمل اس کے مستقبل کو متأثر کرتے ہیں، یعنی جس قسم کے اس کے اعمال "آج" ہوں گے اسی قسم کا اس کا "کل" ہوگا۔ بالفاظِ دیگر، اس کے لئے تسلسلِ حیات پر ایمان رکھنا ضروری ہے۔ جو شخص صرف موجودہ زندگی کا قائل ہے وہ بیشِ پا افتادہ مفاد کے پیچھے لگا رہے گا اور مستقل اقدار کو کچھ اہمیت نہیں دے گا۔ اس لئے کہ مستقل اقدار انسانی سیرت کی تعمیر کرتی ہیں اور سیرت کی تعمیر کی اہمیت اسی صورت میں سمجھ میں آسکتی ہے جب انسان، زندگی کو مستقل اور مسلسل سمجھے۔ ورنہ جو شخص یہ سمجھے کہ میری سانس کے ساتھ ہی میری سیرت کا خاتمہ ہو جائے گا اسے تعمیرِ سیرت کے لئے سر کھپانے کی کیا ضرورت ہے۔

۴۔ اور سب سے ضروری یہ کہ خدا پر ایمان لانا ہوگا۔ اس لئے کہ اخلاقی آئیڈیل، نفس (MIND) کے علاوہ اور کہیں موجود ہی نہیں ہو سکتا، اور ایک مطلق اخلاقی آئیڈیل، نفسِ مطلق میں ہی موجود ہو سکتا ہے جو ہر حقیقت کا سرچشمہ ہے۔ (ایضاً۔ ص ۲۲۰-۲۰۰)

آپ نے غور کیا کہ کیریکٹر کے لئے ایمان، کس قدر لاینفک شرط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن ہر جگہ "عَمِلُوا الصَّالِحَاتِ" سے پہلے "اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" کہتا ہے۔

اب آپ اس نکتہ کی طرف پھر آجایئے جسے ہم نے پہلے بیان کیا ہے، یعنی یہ کہ انسان ایسے کام کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتا جس میں اسے اپنا فائدہ نظر نہ آئے۔ دو شخص دفتر میں کام کرتے ہیں ـــــ اس لئے کہ اس سے انہیں تنخواہ ملتی ہے۔ اس میں ان کا فائدہ ہے ـــــ ایک کاروباری آدمی کچھ خلافِ قاعدہ مراعات حاصل کرنے کے لئے ایک اچھی خاصی رقم بطورِ رشوت پیش کرتا ہے۔ ان دونوں میں ایک شخص انسانی ذات پر ایمان نہیں رکھتا۔ وہ رشوت کی رقم فوراً قبول کر لے گا، بشرطیکہ اسے اطمینان ہو جائے کہ وہ پولیس کی گرفت میں نہیں آئے گا۔ وہ رشوت اس لئے لے گا کہ اس میں اس کا مالی فائدہ ہے لیکن وہ شخص جو انسانی ذات پر ایمان رکھتا ہے کبھی رشوت قبول نہیں کرے گا اس لئے کہ اسے دیانتدار رہنے میں فائدہ نظر آتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ رشوت لینے سے اسے طبعی فائدہ ہوگا لیکن اس کی ذات کا نقصان ہوگا۔ دوسری طرف رشوت نہ لینے سے اس کا طبعی نقصان تو ہوگا لیکن اس کی ذات کا فائدہ ہوگا۔ وہ طبعی فائدہ اور ذات کے فائدہ میں موازنہ کرے گا اور چونکہ اس کے نزدیک ذات کا فائدہ بہرحال و بہرکیف زیادہ گراں بہا ہوتا

ہے ما اس لئے وہ زیادہ فائدے کے لئے کم فائدے کو ٹھکرا دے گا۔ آپ نے دیکھا کہ اس ایمان سے انسان کے "مفادِ خویش" کے جذبہ کی تسکین بھی کس طرح ہو جاتی ہے۔ اس وقت اس کا جذبۂ محرکہ بھی "مفادِ خویش" ہی کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن وہ مفاد اور مفاد میں فرق کرتا ہے۔ وہ طبیعی جسم کے فائدے کے مقابلے میں ذات کے فائدے کو زیادہ قیمتی سمجھتا ہے اس لئے کم فائدے سے صرفِ نظر کر کے زیادہ فائدے کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔ لہٰذا وہ رشوت کی پیش کش کو ٹھکرا دیتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ وہ اس کام کو نہ تو اس لئے کرتا ہے کہ یہ کسی کا "حکم" ہے اس لئے اس کی تعمیل ضروری ہے، نہ اس لئے کہ ایسا کرنا اس کا فرض ہے۔ وہ اسے اس لئے کرتا ہے کہ ایسا کرنے میں اسے اپنا فائدہ نظر آتا ہے۔ اس میں ڈر کا پہلو بھی ہوتا ہے، لیکن وہ ڈر ہوتا ہے اپنی ذات کی تباہی کا ———

مفاد اور مفاد میں فرق

——— اسے قرآن کی رُو سے مکافاتِ عمل کہتے ہیں، یعنی ہر عمل کا نتیجہ مرتب ہونا۔

آپ نے غور کیا کہ انسانی ذات پر ایمان انسان کو کس طرح ہر آن حسنِ عمل (کیریکٹر کے مظاہرہ) پر آمادہ کئے چلا جاتا ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ ایک، مردِ مومن، حسنِ عمل کسی صلہ یا معاوضہ کی خاطر نہیں کرتا تو اس سے یہی مقصود ہوتا ہے کہ وہ اپنے عمل کا صلہ یا معاوضہ، طبیعی یا حیوانی پیمانوں میں نہیں مانگتا۔ اسے اس کا صلہ ذات کے پیمانوں کے مطابق ملتا ہے فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَي اللّٰهِ ۙ (۱۰/۷۲) سے یہی مراد ہے[ط]۔ عمل کوئی بھی ہو وہ بلا صلہ یا بلا معاوضہ کبھی نہیں رہتا۔ صرف معاوضہ اور معاوضہ میں فرق ہوتا ہے۔ مثلاً انسانی ذات کی نشوونما کے لئے ایک قانون (مستقل قدر) یہ ہے کہ انسان اپنی محنت کی کمائی میں سے دوسروں کی پرورش کے لئے جس قدر زیادہ دیتا ہے اسی قدر اس کی ذات کی نشوونما ہوتی چلی جاتی ہے۔ جو شخص انسانی ذات پر ایمان رکھتا ہے وہ پوری محنت سے کمائی کرتا ہے۔ لیکن اس میں

ما اس کے یہ معنی نہیں کہ مستقل اقدار کے مطابق عمل کرنے سے طبیعی مفاد ملتے ہی نہیں۔ ان اقدار کے مطابق نظامِ زندگی متشکل کرنے سے اس دنیا کے طبیعی مفاد بھی بڑی عمدگی سے حاصل ہوتے ہیں اور انسانی ذات کی نشوونما بھی ہوتی چلی جاتی ہے۔ ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنۃ و فی الاٰخرۃ حسنۃ۔ کا یہی مفہوم ہے۔

سے صرف اتنا اپنے لئے رکھتا ہے جس سے اس کی طبعی ضروریات پوری ہوں اور فاضلہ کمائی دوسروں کی پرورش کیلئے عام کردیتا ہے۔ (قرآنِ کریم نے انسانی ذات کی نشوونما کا یہی طریق بتایا ہے) ظاہر ہے کہ طبعی پیمانوں سے ماپئے تو اس میں اس شخص کا سراسر نقصان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اگر کسی شخص کو معلوم ہو کہ جو کچھ اس کی ضروریات سے زائد ہوگا وہ دوسروں کے پاس چلا جائے گا تو وہ اتنا کمائے گا ہی کیوں جو اس کی ضروریات سے زائد ہو۔ وہ تھوڑی سی محنت کرکے اپنی ضروریات کے مطابق کما لے گا اور پھر چین سے سوئے گا۔ ان لوگوں کی یہ دلیل بڑی معقول نظر آتی ہے اور اس کا اطمینان بخش جواب کسی کے پاس نہیں ہوتا۔

روس کی مشکل

یہی وہ مشکل ہے جو آج کل روس میں پیش آرہی ہے اور اسے اپنی سرحدوں پر آہنی پردے لٹکانے پڑ گئے ہیں۔ اس سوال کا جواب صرف قرآنی تصورِ حیات کی رُو سے مل سکتا ہے اور یہی ہے وہ مقام جہاں قرآنی نظام، دیگر نظام ہائے معیشت و معاشرت سے ممتاز ہو جاتا ہے۔ قرآنی نظام کی حامل، مومنین کی جماعت ہوتی ہے، یعنی ان لوگوں کی جماعت جو اس حقیقت پر علیٰ وجہ البصیرت ایمان رکھتے ہیں

۱۔ انسانی ذات کی نشوونما مقصودِ حیات ہے۔ اور

۲۔ ذات کی نشوونما اس سے ہوتی ہے کہ انسان پوری پوری محنت کرے اور اپنی ضروریات سے زائد جس قدر ہو اسے نوعِ انسان کی پرورش کے لئے عام کردے۔

ان لوگوں کے دل میں اس کے لئے کس قدر تڑپ ہوتی ہے، ہم اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اسے ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ جو ماں اپنے دودھ سے بچے کی پرورش کرتی ہے اس کی انتہائی خواہش اور کوشش ہوتی ہے کہ اس کے زیادہ سے زیادہ دودھ پیدا ہو تاکہ اس کا بچہ بھوکا نہ رہ جائے۔ ظاہر ہے اس کا دودھ اس غذا سے بنتا ہے جو وہ اپنے جسم کی پرورش کے لئے کھاتی ہے۔ لیکن وہ کبھی نہیں چاہتی کہ یہ غذا اس کے بدن کا جزو بن جائے اور دودھ میں تبدیل نہ ہو۔ اس کے برعکس، اگر کبھی اس کے دودھ میں کمی واقع ہو جائے، تو وہ

مومن ایسا کیوں کرتے ہیں؟

ڈاکٹروں سے مشورہ کرتی ہے کہ کس طرح اس کی غذا (زیادہ سے زیادہ حد تک) دودھ میں تبدیل ہو جائے۔ وہ یہ سب کچھ کیوں کرتی ہے؟ محض اس لئے کہ بچے کی حفاظت اور پرورش اس کی زندگی کا مقصد بن چکی ہوتی ہے۔ اس سے اس کے قلب کو تسکین حاصل ہوتی ہے۔ بعینہٖ یہی حالت ان لوگوں کی ہوتی ہے جن کا ایمان یہ

ہو کہ دوسروں کی پرورش سے ان کی ذات کی نشو و نما ہوتی ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ کماتے ہیں اور اس سے صرف اپنی ضروریات کے بقدر رکھ کر باقی سب دوسروں کی پرورش کے لئے عام کر دیتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات وہ اس سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اور یُؤْثِرُوْنَ عَلٰۤی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (۵۹/۹) دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں خواہ انہیں خود تنگی میں گذارہ کیوں نہ کرنا پڑے۔ جس طرح ماں کی ماری ماں خود بھوکی رہتی ہے لیکن اپنے بچوں کا پیٹ بھرنے کی فکر کرتی ہے۔ خود گیلے بستر پر سوتی ہے اور بچے کو خشک جگہ پر سلاتی ہے۔ جس طرح اس ماں کے دل میں اس وقت کسی معاوضہ یا صلہ کا خیال نہیں ہوتا۔ اسی طرح یہ لوگ بھی جن کی پرورش کا سامان بہم پہنچاتے ہیں ان سے کہہ دیتے ہیں کہ: لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا۔ (۷۶/۹) ہم تم سے نہ کسی معاوضہ کے خواہاں ہیں، نہ شکریہ تک کے متمنی۔ اس مثال میں فرق یہ ہے کہ ماں بچے کے لئے یہ کچھ اس جبلی تقاضے کے ماتحت کرتی ہے جو ہر حیوان کے اندر ودیعت کر کے رکھ دیا گیا ہے۔

لیکن بندۂ مومن یہ کچھ عقل و فکر کی رو سے اور اپنے اختیار و ارادہ سے کرتا ہے اور ان دونوں میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر قرآن اپنے اس نظام کی عمارت استوار کرتا ہے جس میں کیریکٹر خود بخود بلند ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ سب سے پہلے مملکت کو اس کا ذمہ دار قرار دیتا ہے کہ وہ تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی اور ان کی مضمر صلاحیتوں کی

عملی طریق

نشو و نما کا سامان فراہم کرے۔ اس سے انسانی سیرت کی وہ تمام کمزوریاں رفع ہو جاتی ہیں جو احتیاج کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں اور جو کیریکٹر کی پستی کا موجب بنتی ہیں ـــ دوسری طرف وہ ہر فردِ معاشرہ کے دل میں اس ایمان کو راسخ کرتا ہے (وہ راسخ کیا کرتا ہے[*] معاشرہ مشتمل ہی ان افراد پر ہوتا ہے جو اس ایمان کے حامل ہوں) کہ وہ جس قدر محنت کر کے کمائیں گے اور جو کچھ ان کی ضروریات سے زائد ہو اُسے دوسروں کی نشو و نما کے لئے دے دیں گے اسی قدر ان کی اپنی ذات کی نشو و نما ہوگی۔ اس سے وہ تمام خرابیاں دور ہو جاتی ہیں جو دولت جمع کرنے کی ہوس یا افراطِ زر سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس نظام میں نہ فاضلہ دولت کسی کے پاس رہتی ہے ..... نہ مفاد پرستی کے جذبات انسانی سیرت کو داغدار کرتے

[*] علاوہ نظام بچوں کی تعلیم و تربیت اس انداز سے کرتا ہے کہ ان کے دل میں شروع ہی سے یہ تصور راسخ ہوتا چلا جائے۔

ہیں۔ ہمارے زمانے میں کمیونزم کے نظام کا بھی یہی دعویٰ ہے کہ وہ فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) افراد کے پاس نہیں رہنے دے گا اور اس طرح نظامِ سرمایہ داری کی لعنتوں کو ختم کر دے گا۔ لیکن کمیونزم کا نظام مادی تصوّرِ حیات پر مبنی ہے۔ اس لئے اس میں وہ جذبۂ محرکہ پیدا نہیں ہو سکتا جس کی بنا پر انسان زیادہ سے زیادہ محنت کرے اور اپنی ضرورت سے زائد سب کچھ دوسروں کی پرورش کے لئے بطیبِ خاطر دے دے۔

کمیونزم کی بنیادی کمزوری

یہی وہ بنیادی کمزوری ہے جس کی وجہ سے کمیونزم کا نظام نہ قائم رہ سکتا ہے، نہ آگے بڑھ سکتا ہے۔ اسے صرف استبداد کے زور پر قائم رکھا جا سکتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ استبداد کے ڈنڈے سے قائم کردہ نظام، زیادہ دنوں تک چل ہی نہیں سکتا۔ وہی نظام قائم رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے جو افرادِ معاشرہ کے دل کی گہرائیوں سے اُبھرے۔ یہ چیز قرآن کے پیش کردہ تصوّرِ حیات کے علاوہ اور کہیں ممکن نہیں۔ کمیونزم جس تصوّرِ حیات کی تخلیق ہے اسے قرآن (جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں) حیوانی سطحِ زندگی قرار دیتا ہے جس میں کیریکٹر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس تصوّرِ حیات کی رُو سے مادّی مفاد سے بلند کوئی قدر نہیں ہوتی۔ اس میں آپ زیادہ سے زیادہ

نیشنلزم کا جذبہ

نیشنلزم کا جذبہ اُبھار کر، افرادِ معاشرہ کو انفرادی مفاد سے قومی مفاد کی طرف لے جا سکتے ہیں۔ لیکن چونکہ (مغربی نظریۂ جمہوریّت کی رو سے) نیشنلزم کی بنیاد قوموں کے باہمی جذبۂ منافرت پر ہے اور ایک قوم جانتی ہے کہ اگر مجھ میں کمزوری آ گئی تو طاقتور قومیں مجھے ہڑپ کر جائیں گی۔ اس لئے جس چیز کو نیشنلزم میں قومی کردار کہا جاتا ہے وہ بھی تحفّظِ خویش (PRESERVATION OF LIFE) ہی کے جذبہ کا پیدا کردہ ہوتا ہے، کسی انسانی قدر کو حیوانی تقاضے پر ترجیح دینے کا نام نہیں ہوتا۔ اس میں ایک فرد کے بجائے، افراد کا مجموعہ اپنا تحفّظ چاہتا ہے۔ ہم یہ نہیں کہنا چاہتے کہ تحفّظِ خویش اچھی چیز نہیں اور کسی قوم کو اپنے ملک کی حفاظت نہیں کرنا چاہیئے۔ تحفّظِ خویش نہایت ضروری ہے اور اپنے وطن کی حفاظت تحفّظِ خویش کے لئے لاینفک۔ جو کچھ ہم نے اوپر کہا ہے اس سے مقصود یہ ہے کہ اگر کوئی شخص تحفّظِ خویش کے لئے (خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی) کوشش کرتا ہے تو اس کے متعلق یہ نہیں کہا جائے گا کہ وہ کسی بلند کیریکٹر کا ثبوت دیتا ہے۔ اس کے متعلق یہ ہی کہنا چاہیئے کہ وہ عقل مندی اور دانش اطوادی کا ثبوت دیتا ہے۔ اسی طرح جو شخص اپنا تحفّظ نہیں چاہتا (خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی) اس کے متعلق بھی یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس کا کیریکٹر پست ہے۔ کہا یہ جائے گا کہ وہ بڑا احمق ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے اگر کوئی

شخص کشتی میں بیٹھا ، کشتی میں سوراخ کر رہا ہو تو اس کے متعلق یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس میں کیریکٹر کی کمی ہے۔ اس کے متعلق یہی کہا جائے گا کہ وہ پاگل ہے۔ جو شخص وطن میں رہتے ہوئے اس وطن کی تخریب چاہتا ہے، اس کا شمار پاگلوں میں ہوگا۔ لہٰذا نیشنلزم میں اگر کوئی شخص وطن کے مفاد کو، مفادِ خویش پر ترجیح دیتا ہے تو اُسے نہایت سمجھدار اور ہوشمند کہا جائے گا۔ (جس طرح اگر کوئی شخص کشتی کا سوراخ بند کرنے کے لئے اپنا قیمتی رومال اس میں ٹھونس دے تو اُسے عقل مند کہا جائے گا۔) صاحبِ کردار وہ ہوگا جو کسی ڈوبتے کو بچانے کے لئے دریا میں کُود جائے اور یہ چیز صرف بلند اور مستقل اقدار پر ایمان لانے سے پیدا ہوسکتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ بعض افراد ایسے بھی ملیں گے جنہیں بلند اقدار کا احساس وشعور بھی نہیں ہوگا۔ لیکن بایں ہمہ، وہ ڈوبتوں کو بچانے کے لئے اپنی جان پر کھیل جائیں گے۔ لیکن ان کے نفسیاتی تجزیہ کے بعد یا تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ وہ اس بلند قدر کا غیر شعوری طور پر احساس رکھتے تھے اور یا ان کا جذبۂ محرکہ کچھ اور تھا۔ صاحبِ کردار وہی ہے جو دو اقدار کا شعوری طور پر موازنہ کرے اور پھر بلند قدر کی حفاظت کے لئے اس سے پست درجہ کی قدر کو علیٰ وجہ البصیرت قربان کر دے۔ یہ چیز قرآن کی بیان کردہ مستقل اقدار پر ایمان لانے سے ہی ہوسکتی ہے، کمیونزم یا کسی اور ازم کے بس کی بات یہ نہیں۔ قرآن پر ایمان رکھنے والے اگر اپنے ملک کی حفاظت کے لئے ذاتی مفاد کی پرواہ نہیں کرتے تو اس لئے

مردِ مومن کا جذبۂ تحفّظِ وطن

نہیں کہ ملک کے تحفّظ سے ان کا اپنا تحفّظ ہو جائے گا بلکہ اس لئے کہ وہ ملک کو ان بلند اقدار کے بروئے کار لانے اور دنیا میں عملاً نافذ کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں، اور اس کا تحفّظ اس لئے چاہتے ہیں کہ اس سے مستقل اقدار کا تحفّظ ہو جاتا ہے۔ اس لئے اگر وہ ملک کی حفاظت واستحکام کے لئے ذاتی مفاد کی پروا نہیں کرتے تو ان کا یہ عمل بھی اپنے طبعی تقاضے پر مستقل اقدار کو ترجیح دینے کے لئے ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ ان کے کیریکٹر کی بلندی کی دلیل ہوتا ہے۔

آپ نے غور کیا کہ ایک مادہ پرست کے جذبۂ تحفّظِ وطن اور ایک مومن کے جذبۂ تحفّظِ وطن میں کس قدر بنیادی فرق ہے؟ مادہ پرست کے نزدیک وطن مقصود بالذّات ہوتا ہے کیونکہ اس میں اس کی اور اس کی اولاد کی حفاظت مضمر ہوتی ہے۔ لیکن مردِ مومن کے نزدیک وطن مقصود بالذّات نہیں ہوتا۔ اس کے نزدیک وہ مستقل اقدار کے تحفّظ وتنفیذ کا ذریعہ ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس سے اس کا اور اس کی اولاد کا تحفّظ بھی ہو جاتا

ہے جس طرح قرآنی نظام میں انسانی ذات کے استحکام کے ساتھ ساتھ دنیاوی مفاد بھی حاصل ہوتے چلے جاتے ہیں۔

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس کا ملخّص یہ ہے کہ جو شخص مستقل اقدار پر ایمان رکھتا ہے اس کے نزدیک مقصودِ زندگی ان اقدار کا تحفّظ ہے۔ باقی سب کچھ اس بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ۔ جب وہ ان ذرائع کے تحفظ و استحکام کی خاطر اپنے طبعی تقاضوں کو پورا کرتا ہے تو وہ درحقیقت ان مستقل اقدار کے تحفّظ و استحکام کے لئے ہوتا ہے۔ اس طرح ایک مومن کے دنیاوی کام بھی دین کا حصہ بن جاتے ہیں۔

خلاصۂ مبحث

جو کچھ سابقہ صفحات میں کہا گیا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ:

(۱) جب انسان کی طبعی زندگی سے متعلق دو اقدار میں تصادم ہو، تو جو شخص زیادہ قیمتی قدر کی خاطر کم قیمت کی قدر کو قربان کر دیتا ہے اسے عقل مند کہا جاتا ہے۔

(۲) جب کسی طبعی مفاد یا تقاضا اور انسانی قدر میں تصادم ہو تو اس وقت اگر انسانی قدر کو طبعی تقاضا پر ترجیح دی جائے تو اسے کیریکٹر کہتے ہیں۔

(۳) اس سے ظاہر ہے کہ کیریکٹر کا مظاہرہ اسی شخص سے ہو سکتا ہے جو انسانی اقدار اور انسانی ذات پر یقین رکھتا ہو۔ واضح رہے کہ چونکہ یہ شخص بھی درحقیقت زیادہ قیمتی قدر کی خاطر کم قیمتی قدر کو قربان کر دیتا ہے، اسلئے یہ بڑا عقل مند ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے مومنین کو اولوالالباب کہا ہے یعنی صاحبانِ عقل و بصیرت۔ حقیقت یہ ہے کہ صحیح عقل و بصیرت کے مالک یہی لوگ ہوتے ہیں لیکن جو لوگ انسانی ذات پر ایمان نہیں رکھتے، وہ انہیں دیوانہ سمجھتے ہیں۔

(۴) انسانی اقدار عقلِ انسانی (یعنی معاشرہ) کی پیداوار نہیں ہو سکتیں۔ یہ صرف وحی کی رُو سے مل سکتی ہیں۔ اس لئے انسانی اقدار پر وہی شخص ایمان رکھ سکتا ہے جسے وحی پر ایمان ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم ایمان اور عملِ صالح کو لازم و ملزوم قرار دیتا ہے۔

(۵) یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ بعض لوگ وحی پر ایمان نہیں رکھتے لیکن اس کے باوجود وہ بعض انسانی اقدار کا بڑا احترام کرتے ہیں اور انکے تحفظ کیلئے بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ ان لوگوں کی ذہنی اور قلبی کیفیات کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت ایسے ماحول میں ہوئی تھی جس میں انسانی اقدار بطور روایات چلی آئی تھیں اور ان پر زور دیا جاتا تھا۔ اس طرح ان اقدار کا علم اور احترام ان کے تحت الشعور میں جاگزیں ہو چکا تھا۔ لیکن اگر ایسی صورت نہ تھی تو پھر آپ دیکھیں گے کہ انکی اس قسم کی قربانی کا جذبۂ محرکہ کچھ اور تھا۔ مثلاً نام اور نمود کی خواہش، شہرت کی آرزو، یا کوئی اور مفاد۔ اس لحاظ سے انکی اس قربانی کو کیریکٹر نہیں کہا جا سکتا کیونکہ کیریکٹر کی بنیادی شرط یہ ہے کہ اس سے طبعی تقاضوں کی تسکین مقصود نہ ہو۔

(۶) انسانی ذات کی نشوونما، ان تمام اقدار پر یقین، انکے احترام اور تحفظ سے ہوتی ہے جو قرآن کریم میں مذکور ہیں۔ ان میں سے بعض کو چھوڑ دینے اور بعض پر عمل کرنے سے نہیں ہوتی۔

(۷) انسانی ذات کی نشوونما ایک معاشرے کے اندر ممکن ہے، خلوت کی تجربہ گاہوں میں نہیں۔ اس معاشرہ کو اسلامی مملکت کہتے ہیں جس کی عمارت قرآن کی مستقل اقدار کے ایمان پر استوار ہوتی ہے۔ انسانی اقدار کا تحفظ اس مملکت کا فریضہ اور دنیا میں ان کا عام کرنا اس کا مقصود ہوتا ہے۔ اس نظام میں افرادِ مملکت کی ذات کی نشوونما بھی ہوتی ہے اور انہیں دنیا کی خوشگواریاں اور سرفرازیاں بھی نصیب ہوتی ہیں۔

آخر میں ایک شبہ کا ازالہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہا جاسکتا ہے کہ تصوّف کے پیشِ نظر بھی تزکیۂ نفس اور روحانی ترقّی ہوتا ہے۔ اور

تصوّف اور قرآن

یہ چیزیں خلوت کدوں کی انفرادی ریاضت سے حاصل ہوسکتی ہیں۔ اندریں حالات انسان ایک معاشرہ کے قیام اور مملکت کی تشکیل کے لئے کیوں سر کھپائے۔

یہ سوال نظر بظاہر بڑا وزنی دکھائی دیتا ہے۔ لیکن درحقیقت یہ تصوّف اور قرآن دونوں کی تعلیم سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ تصوّف کی ماہیت کے متعلق میں دوسرے مقام[1] پر تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔ اس تفصیل کو یہاں (ضمنی طور پر) دہرایا نہیں جاسکتا۔ اس لئے یہاں چند اصولی باتوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ ان پر غور کرنے سے حقیقت سامنے آجائے گی۔

(۱) یہ سمجھنا غلط ہے کہ تصوّف کا مقصود انسانی ذات کی نشوونما اور استحکام ہے۔ تصوّف کی رو سے انسانی ذات (خودی) کا وجود تمام مصیبتوں کی جڑ ہے اور اسے مٹا دینے کا نام نجات ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ انسانی ذات، ذاتِ خداوندی کا جزو ہے جو اپنے اصل سے الگ ہوکر مادہ کی دلدل میں پھنس گئی ہے۔ اسے اس دلدل سے نکالنا تاکہ یہ پھر اپنے اصل سے مل جائے، انسانی زندگی کا مقصود ہے اور یہ چیز ترکِ دنیا، ترکِ علائق اور ترکِ خواہشات سے حاصل ہوتی ہے۔ فنائے ذات، نہ کہ ذات کا استحکام، تصوّف کا بنیادی عقیدہ ہے۔

(۲) تصوّف کی رو سے معاشرہ، مملکت، نظام، سب دنیا داروں کے دھندے ہیں۔ "تزکیۂ نفس" کیلئے ان سے الگ رہنا ضروری ہے۔ انسانی نجات کا حصول (یعنی روح کو مادہ کی دلدل سے نکال لینا) ایک انفرادی فعل ہے جو مختلف قسم کی ریاضتوں، مراقبوں اور چلّوں سے حاصل ہوتا ہے۔

(۳) تصوّف میں صرف منفیانہ خصائص (NEGATIVE VIRTUES) کو حسنِ عمل قرار دیا جاتا ہے۔ نفیٔ ذات کیلئے اعمال بھی منفیانہ ہی ہونے چاہئیں۔ عاجزی، مسکینی، انکساری وغیرہ۔ اقبالؒ اس ضابطۂ اخلاق کو "راہبِ دیرینہ افلاطون حکیم از گروہِ گوسفندانِ قدیم" کا ایجاد کردہ مسلکِ گوسفندی قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک افلاطون:

گوسفندے در لباسِ آدم است — حکمِ اُو بر جانِ صوفی محکم است

یہی وجہ ہے کہ اقبالؒ تصوّف کو "اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا" قرار دیتا ہے۔ قرآن تسخیرِ کائنات کا درس دیتا ہے۔ اور دنیا میں نظامِ عدل کے قیام کو مقصودِ زندگی بتاتا ہے۔ یہی وہ نظام ہے جس میں انسان کی ذات کی نشوونما ممکن ہے اور کیریکٹر نشوونما یافتہ ذات کی مختلف شیؤن (FACETS) کا دوسرا نام ہے۔ جس طرح ہیرے سے روشنی کی کرنیں نکلتی ہیں، اسی طرح نشوونما یافتہ ذات سے کیریکٹر کی نورانی شعاعیں پھوٹتی ہیں۔ اسی کو قرآن نے صبغۃ اللہ (خدا کا رنگ) کہہ کر پکارا ہے۔

خدا کا رنگ صرف اس معاشرہ میں نکھرتا ہے جو قرآن کی بیان کردہ مستقل اقدار کا ضامن ہوگا اور جس میں ہر فرد عقل و بصیرت کی رو سے اور اپنے اختیار و ارادہ سے مستقل اقدار کا تحفظ کرے۔

---

[1] سلیم کے نام خطوط، جلد سوم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وحدتِ ملّت

(ایک تقریر)

(فروری ۱۹۶۱ء)

یوں دیکھئے تو ساری دُنیا میں انسان بستے ہیں جو (سب کے سب) ایک ہی نوع کے افراد ہیں۔ لیکن ان کے اختلافات پر نگاہ ڈالیئے تو ایسا دکھائی دے گا گویا دنیا کی آبادی مختلف قسم کی مخلوقات کا مجموعہ ہے جن میں سوائے شکل و صورت کے اور کوئی بھی بات مشترک نہیں۔ کہیں ان میں خاندانوں کا اختلاف ہے اور ہر خاندان دوسرے خاندان کا دشمن ہے۔ کہیں ذاتوں اور برادریوں کا اختلاف ہے اور ہر برادری دوسری برادری سے بیر رکھتی ہے۔ کہیں قوموں کا اختلاف ہے اور ہر قوم دوسری قوم کو نگلنے کی فکر میں دکھائی دیتی ہے۔ ایک ہی قوم کے اندر سیاسی پارٹیوں کا اختلاف ہے اور ایک پارٹی دوسرے پارٹی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑی رہتی ہے۔ ان تمام اختلافات سے اوپر چلیئے تو مذہب کا اختلاف ہے اور ایک مذہب دوسرے مذہب کو مٹانا فریضۂ خداوندی سمجھتا ہے۔ پھر مذاہب کے اندر فرقوں کا اختلاف ہے اور ہر فرقہ دوسرے فرقے کو جہنم کا ایندھن قرار دیتا ہے۔ غرضیکہ انسان کی نوع تو ایک ہے لیکن باہمی اختلافات سے اس طرح بٹی ہوئی ہے کہ ان میں کوئی شے (بجز باہمی عداوت کے) بطور قدرِ مشترک دکھائی نہیں دیتی۔

نوعِ انسان کے اختلافات

قرآنِ کریم نے اس طرح اختلافات سے بٹے ہوئے انسانوں کو مخاطب کیا اور ان سے کہا کہ تمہیں اس کا علم (احساس) بھی ہے کہ

خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ۔ (۴/۱)

خدا نے تم کو ایک جرثومۂ حیات سے پیدا کیا۔

پیدائش کے اعتبار سے تم سب کی اصل ایک ہے۔ تم سب ایک ہی درخت کی شاخیں اور ایک ہی شاخ کے پتّے ہو۔ کیا تم نے کبھی دیکھا ہے کہ ایک درخت کی ایک شاخ دوسری شاخ کی تباہی کی فکر میں رہتی ہو

وحدتِ انسانیّت

اور ایک پتّا دوسرے پتّے کی گھات میں بیٹھا ہو کہ وہ کب غافل ہو اور میں اسے نگل جاؤں؟ درخت سرسبز و شاداب ہوتا ہے تو اس کی ہر شاخ اور ہر پتّے میں زندگی اور تازگی کی نمود ہوتی ہے۔ اگر وہ خشک ہوتا ہے تو اس کی ہر ٹہنی مرجھا جاتی ہے — یاد رکھو!

مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ إِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ۔ (۳۱/۲۸)

تم سب کا پیدا کرنا اور دوبارہ اٹھانا، ایک نفس (کی پیدائش اور بعث) کی طرح ہے۔

اس نے کہا کہ شروع میں تمام نوعِ انسان ایک برادری تھی لیکن اس کے بعد لوگوں نے باہمی اختلافات شروع کر دیئے۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا۔ (۱۰/۱۹)

اور تمام نوعِ انسان ایک اُمّت (برادری) تھی پھر انہوں نے باہمی اختلافات شروع کر دیئے۔

اور اِس طرح مختلف خاندانوں، قبیلوں، نسلوں، گروہوں، قوموں اور مذہبوں میں بٹ گئے۔ جب ان میں اس طرح اختلافات شروع ہو گئے اور ایک گروہ، دوسرے گروہ کا دشمن ہو گیا تو خدا نے اپنی طرف سے حضرات انبیاء کرامؑ کو بھیجنا شروع کیا تاکہ وہ ان کے اختلافات مٹا کر پھر سے انہیں ایک عالمگیر برادری بنا دیں۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ۔ (۲/۲۱۳)

تمام انسان ایک ہی برادری تھے۔ (پھر انہوں نے باہمی اختلافات سے تفرقہ شروع کر دیا تو) اللہ نے انبیاء کرامؑ کو بھیجا جو انہیں (باہمی اتحاد اور یگانگت کی زندگی کے خوشگوار نتائج کی) خوشخبری دیتے تھے اور (اختلافات و افتراق کے تباہ کن عواقب سے) آگاہ کرتے تھے اور ان میں سے ہر ایک کے ساتھ اللہ نے ضابطۂ قوانین بھی بھیجا تاکہ وہ لوگوں کے اختلافی امور کا فیصلہ کرے۔[1]

---

[1] لِيَحْكُمَ الکتاب کے متعلق ہے نہ کہ النّبیین کے۔

ان تمام انبیاء کرامؑ کا پیغام ایک ہی تھا یعنی وحدتِ انسانیت۔ یہی پیغام حضرت نوحؑ کا تھا، یہی حضرت ابراہیمؑ کا، یہی حضرت موسیٰؑ نے کہا تھا۔ یہی حضرت عیسےٰؑ نے اور آخرالامر یہی پیغام نبی اکرمؐ نے نوعِ انسان تک پہنچایا تھا۔

انبیاء کرامؑ کی دعوت

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ۔ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ۭ ..... (۴۲/۱۳)

(اے رسولؐ) اللہ نے تمہارے لئے دین کا وہی راستہ مقرر کیا ہے جس کا اس نے نوحؑ کو حکم دیا تھا اور وہی وحی ہم نے تمہاری طرف کی ہے اور جس کا ہم نے ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو حکم دیا تھا۔ (وہ حکم یہ تھا کہ) خدا کے مقرر کردہ نظامِ زندگی (الدین) کو قائم کرو اور اس میں تفرقہ مت ڈالو۔ (یہی دعوت تمہاری ہے) لیکن جس بات کی طرف تو انہیں بلاتا ہے مشرکین پر وہ بات بڑی گراں گزرتی ہے۔

یہاں اس بات کو ذرا غور سے سمجھیے کہ اللہ تعالےٰ نے کہا ہے کہ انسانوں کے اختلافات مٹا کر ان میں وحدت پیدا کرنے کی دعوت، مشرکین پر بڑی گراں گزرے گی۔ اس نکتہ کی وضاحت ذرا آگے چل کر جائے گی۔

چونکہ ان انبیاء کرامؑ کا پیغام ایک تھا اس لئے یہ سب کے سب ایک ہی برادری کے افراد تھے۔ یہی وہ جماعت تھی جس کے متعلق نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ

اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ڮ وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ۔ (۲۱/۹۲)

یہ تمہاری جماعت، ایک ہی برادری ہے اور میں تم سب کا رب ہوں سو تم میری محکومیت اختیار کرنا۔

جو لوگ حضرات انبیاء کرامؑ کی اس دعوت پر ایمان لاکر، باہمی تفرقے مٹا دیتے تھے اور اس طرح ایک خدا کی محکومیت اختیار کر کے، ایک برادری بن جاتے تھے وہ ایک اُمت قرار پاتے تھے۔ جو اس دعوت سے انکار کر کے اپنے اختلافات پر قائم رہتے وہ دوسرا فریق بن جاتے تھے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے قرآنِ کریم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

دو جماعتیں

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنكُمْ كَافِرٌ وَمِنكُم مُّؤْمِنٌ ۔ (۶۴/۲)

اللہ وہ ہے جس نے تم سب کو پیدا کیا۔ پھر تم میں کچھ لوگ نہ ماننے والے (کافر) بن گئے اور کچھ ماننے والے (مومن) ہو گئے۔

جو لوگ اس دعوت پر ایمان لا کر اپنے اختلافات مٹا دیتے تھے ان میں باہمی تفرقہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جماعتِ مومنین کے اندر تفرقہ کتنا سنگین جرم ہے، اس کا اندازہ بنی اسرائیل کے اس واقعہ سے لگائیے جسے قرآنِ کریم نے سورۂ طٰہٰ میں بیان کیا ہے۔ بات یوں ہوئی کہ حضرت موسیٰؑ کچھ دنوں کے لئے کوہِ طور پر تشریف لے گئے اور اپنی جگہ حضرت ہارونؑ کو بنی اسرائیل کا نگران بنا کر چھوڑ گئے۔ یاد رہے کہ حضرت ہارونؑ بھی حضرت موسےٰؑ کی طرح خدا کے رسول تھے۔

تفرقہ سنگین جُرم ہے

بنی اسرائیل اپنی جہالت سے سامری کے فریب میں آ گئے اور انہوں نے گوسالہ (بچھڑے) کی پرستش شروع کر دی۔ حضرت ہارونؑ نے انہیں نرمی سے سمجھایا لیکن وہ اپنی روش سے باز نہ آئے۔ جب حضرت موسیٰؑ واپس آئے تو وہ قوم کی اس حالت کو دیکھ کر سخت برافروختہ ہوئے۔ انہوں نے حضرت ہارونؑ سے کہا۔

مَا مَنَعَكَ إِذْ رَأَيْتَهُمْ ضَلُّوا ۞ أَلَّا تَتَّبِعَنِ (۲۰/۹۲-۹۳)

جب تم نے دیکھا تھا کہ یہ لوگ اس طرح گمراہ ہو رہے ہیں، تو وہ کونسی بات تھی جس نے تمہیں اس سے روکا کہ جس طرح میں ان پر سختی کیا کرتا ہوں، تم بھی اسی طرح کرو؟

آپ نے سوال سن لیا، اب اس کا جواب سنیئے۔ اسے پھر سمجھ لیجئے کہ یہ جواب ایک نبی کی طرف سے دیا جا رہا ہے اور دوسرا نبی اس جواب کو سُن رہا ہے۔ جواب یہ تھا کہ

إِنِّي خَشِيتُ أَن تَقُولَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِي ۔ (۲۰/۹۴)

میں اس سے ڈر گیا کہ تم کہو گے کہ تم نے بنی اسرائیل میں تفرقہ پیدا کر دیا اور میری بات یاد نہ رکھی۔

اس جواب سے حضرت موسیٰؑ مطمئن ہو گئے یعنی انہوں نے اس سے اتفاق کیا کہ حضرت ہارونؑ نے اچھا کیا کہ تھوڑے سے وقت کے لئے قوم کی جہالت کو گوارا کر لیا اور انہیں تفرقہ سے بچا لیا، یعنی قوم میں تفرقہ ایسا شدید جُرم ہے کہ اس سے بچنے کے لئے کچھ وقت کے لئے شرک جیسی جہالت کو بھی برداشت کیا جا سکتا ہے۔

اس مقام پر یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ حضرت ہارونؑ نے بنی اسرائیل کی اس جہالت کو صرف حضرت موسیٰؑ کی

واپسی تک (عارضی طور پر) گوارا کر لیا تھا۔ یہ نہیں کہ وہ (معاذ اللہ) مستقل طور پر حق کو چھوڑ کر باطل پرستی پر راضی ہو گئے تھے تاکہ قوم میں اتحاد قائم رہے۔ حق کو چھوڑ کر اتحاد پیدا کرنا، جائز قرار نہیں پا سکتا۔ حضرت ہارونؑ نے بنی اسرائیل کو ان کی جہالت پر روکا تھا، البتہ سختی نہیں کی تھی۔ ان سے، حضرت موسیٰؑ کی واپسی تک نرمی برتی تھی۔ بہر حال قرآنِ کریم کے اس بیان سے واضح ہے کہ اس کی نگاہ میں تفرقہ کس قدر سنگین جرم ہے۔

قرآنِ کریم ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ ایک نبی آتا اور اپنے متبعین کے اختلافات مٹا کر انہیں اُمتِ واحدہ بنا جاتا۔ لیکن اس کے چلے جانے کے بعد وہ لوگ آپس میں تفرقہ پیدا کر لیتے۔ وہ کیوں ایسا کرتے؛ اس کا جواب

نبی کے بعد اختلافات

اس نے ایک لفظ میں دیا ہے۔ سورۂ شوریٰ میں ہے۔ وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ ۭ (۴۲/۱۴)

خدا کی طرف سے وحی آجانے کے بعد، وہ باہمی ضد کی بنا پر آپس میں تفرقہ پیدا کر لیتے، یعنی یہ بات نہیں تھی کہ ان کی نگاہوں سے حقیقت گم ہو جاتی۔ یا وہ وحدتِ اُمت اور باہمی اخوت و اُلفت کی برکات کے قائل نہ رہتے اسلئے تفرقہ پیدا کر لیتے۔ بالکل نہیں ۔ وہ ان تمام باتوں کو اچھی طرح جانتے۔ لیکن محض ایک دوسرے کی ضد سے، ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کے جذبہ کے ماتحت، دوسروں سے بڑا بننے کے خیال سے باہمی تفرقہ پیدا کر لیتے۔ اس طرح اُمت مختلف فرقوں میں بٹ جاتی اور ان کے مذہبی پیشوا یا سیاسی لیڈر ایک دوسرے کی ضد سے فرقہ بندی کی گرہوں کو مضبوط کرتے رہتے۔ اسی میں ان کی "چودھراہٹ" کا راز تھا۔ اس سے وہ بڑے بنتے تھے۔

یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا تا آنکہ نبی اکرمؐ تشریف لائے۔ آپؐ کی بعثت کا مقصد بھی یہی تھا کہ نوعِ انسان کے ان اختلافات کو مٹا کر انہیں اُمتِ واحدہ بنا دیا جائے۔ اس مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپؐ کو قرآنِ کریم ملا جو تمام امور کو کھول کھول کر بیان کرتا تھا جن میں لوگ اختلاف کرتے تھے۔

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۔ (۱۶/۶۴)

اور ہم نے تجھ پر یہ کتاب صرف اس لئے نازل کی ہے کہ تو ان کے سامنے وہ باتیں کھول کر بیان کر دے جس میں یہ اختلاف کرتے ہیں۔ جو لوگ (اس طرح اپنے اختلافات مٹا کر) اس کتاب پر ایمان

لے آئیں گے یہ ان کی صحیح راستے کی طرف راہ نمائی کرے گی اور ان کے لئے موجبِ رحمت بنے گی۔

اُمتِ مسلمہ چنانچہ اسی طرح نبی اکرم ؐ نے ایک اُمت تیار کی جس میں کوئی باہمی اختلاف نہیں تھا۔ ان کا ضابطہ حیات (قرآنِ کریم) ایک تھا۔ ان کا نظامِ زندگی ایک تھا۔ ان کا نصب العین ایک تھا۔ ان کا راستہ ایک تھا۔ منزل ایک تھی۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔ (۲/۱۴۳) اور اس طرح ہم نے تمہیں ایسی اُمت بنا دیا جو تمام افرادِ انسانیہ سے یکساں فاصلہ پر ہے۔ (یعنی اس کے نزدیک تمام انسان ایک جیسے ہیں) اس اُمت کا فریضہ ہے کہ یہ تمام اقوامِ عالم کے اعمال کی نگران رہے اور اُن کے اعمال کا نگران ان کا رسول ہو۔

یہ اُمت بنائی اور اس سے تاکیداً کہہ دیا کہ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا۔ تم سب خدا کے اس ضابطہ حیات (قرآن کریم) کو مضبوطی سے تھامے رکھنا۔ اس سے تمہاری وحدت قائم رہے گی۔ وَّلَا تَفَرَّقُوْا اور دیکھنا آپس میں تفرقہ نہ پیدا کر لینا۔ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً۔ تم اللہ کے اس انعام کو یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ۔ اس نے تمہارے دلوں میں ایک دوسرے کی اُلفت ڈال دی۔ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا؟ اور اس طرح اس لئے اپنے فضل و عنایات سے تمہیں بھائی بھائی بنا دیا۔ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ۔ تم تباہی کے جہنم کے کنارے تک پہنچ چکے تھے۔ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا۔ سو اس نے تمہیں اس میں گرتے گرتے بچا لیا۔ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ۔ (۳/۱۰۲) اس طرح اللہ اپنے احکام و دلائل تم سے واضح طور پر بیان کرتا ہے تاکہ تم سیدھے راستے پر چلتے رہو۔

قرآنِ کریم کی یہ آیاتِ جلیلہ کسی تشریح کی محتاج نہیں۔ ان میں واضح طور پر بتا دیا گیا ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت لوگوں کی حالت یہ تھی کہ وہ باہمی اختلافات اور تفرقہ سے تباہی اور بربادی کے جہنم کے کنارے تک پہنچ چکے تھے وہ اس میں گرا ہی چاہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں بچا لیا۔ قرآنی تعلیم کے ذریعہ ان کے دلوں سے عداوت کی آگ نکال کر اس کی جگہ ایک دوسرے کی اُلفت کی ٹھنڈک پیدا کر دی۔ اور اس طرح انہیں ایک ایسی اُمت بنا دیا جس میں کوئی اختلاف اور کسی قسم کا تفرقہ نہ تھا۔ یہ سب مسلمان تھے۔ ان میں کوئی فرقہ نہ تھا۔ یہ سب بھائی بھائی تھے۔ ان کے دلوں میں ایک دوسرے کی طرف سے نفرت، بغض، حسد اور

عداوت نہیں تھی۔ ان کا نظام ایک تھا۔ اس میں الگ الگ پارٹیاں نہیں تھیں۔

ان سے کہہ دیا کہ دیکھو! اب تم میں کوئی تفرقہ نہیں رہا۔ خدا کی کتاب تمہارے پاس ہے۔ یہ اختلافات مٹانے کے لئے آئی ہے۔ اس لئے وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ۔ (۳/۱۰۴) اب تم کہیں ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے خدا کی طرف سے واضح تعلیم آجانے کے بعد فرقے پیدا کر لئے اور باہمی اختلافات کرنے لگ گئے۔ یہی لوگ ہیں جن کے لئے سخت عذاب ہے۔

وحدت کی تاکید

ان سے، اس سے بھی زیادہ تاکید سے کہا کہ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ـــــ دیکھنا! (خدائے واحد پر ایمان لانے کے بعد) پھر سے مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔ آپ یقیناً حیران ہوں گے کہ کوئی شخص خدائے واحد پر ایمان لانے کے بعد مشرک کس طرح سے ہو سکتا ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ اس میں حیرت کی کونسی بات ہے ـــــ وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ۔ (۱۲/۱۰۶) لوگوں میں اکثر ایسے ہوتے ہیں کہ وہ اللہ پر ایمان کے مدعی بھی ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ مشرک بھی ہوتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ تمہاری سمجھ میں یہ بات اس لئے نہیں آتی کہ تم سمجھتے ہو کہ مشرک وہی ہوتے ہیں جو بتوں کو پوجتے ہیں۔ لیکن شرک اتنا ہی نہیں، اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔ اور یہ وہ شرک ہے جس میں ایمان کے مدعی بھی مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یہ شرک کیا ہے؟ غور سے سنئے، ارشاد ہے۔ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ۔ دیکھنا تم کہیں مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر دیئے اور خود بھی ایک گروہ بن کر بیٹھ گئے۔ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ۔ (۳۰/۳۱-۳۲) فرقہ بندی سے انسانوں کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ

فرقہ بندی شرک ہے

ہر گروہ اپنے اپنے مسلک پر اتراتا ہے۔ ہر فرقہ یہ سمجھتا ہے کہ میں حق پر ہوں اور باقی سب باطل پر ہیں۔ میں جنتی ہوں باقی سب جہنمی ہیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم کی رُو سے دین میں اختلاف پیدا کرنا اور فرقے بنانا کس قدر سنگین جرم ہے۔ آپ نے شروع میں دیکھا تھا کہ نبی اکرمؐ سے کہا گیا تھا کہ آپ جو اتحاد اور اتفاق، وحدت اور یگانگت کی دعوت دیتے ہیں، تو كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ۔ (۴۲/۱۳) یہ بات مشرکین پر بڑی گراں گزرتی ہے۔ اب آپ نے دیکھ لیا کہ یہ مشرکین کون ہیں جن پر وحدتِ اُمّت کی دعوت گراں گزرتی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو دین

میں تفرقہ پیدا کریں اور فرقہ بندیاں اور گروہ سازیاں شروع کر دیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق نبی اکرمؐ سے واضح الفاظ میں کہہ دیا گیا کہ

اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَكَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍ (۶/۱۶۰)

جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر دیا اور خود ایک گروہ بن گئے، اے رسولؐ! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔

کس قدر واضح ہیں قرآنِ کریم کے یہ ارشادات کہ جو لوگ دین میں تفرقہ پیدا کریں:

(۱) وہ توحید پرست نہیں، مشرک ہیں اور

(۲) خدا کے رسول کا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔

یعنی ان سے نہ خدا کا کوئی تعلق ہے نہ خدا کے رسولؐ کا کوئی واسطہ!

رسول اللہ کی زندگی میں ایک مرتبہ منافقین نے اُمت میں تفرقہ پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے لئے انہوں نے ایک مسجد بنائی۔ سنیے کہ اللہ تعالےٰ نے اس مسجد کے متعلق کیا ارشاد فرمایا ہے۔ سورۂ توبہ میں ہے وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا۔ وہ لوگ جنہوں نے اس غرض سے مسجد بنائی ہے کہ اس سے (اسلام کو) مضرت پہنچائی جائے اور کفر کی راہ اختیار کی جائے۔

یہ کفر کی راہ اور اسلام کے لئے ضرر کا موجب کیا چیز تھی۔ وَّتَفْرِیْقًا بَیْنَ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ انہوں نے یہ مسجد اس لئے بنائی ہے کہ مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کر دیا جائے۔ یہ ہے کفر کی راہ۔ یہ ہے وہ خطرہ جس سے اسلام کو سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ یہ مسجد نہیں۔

مسجدِ ضرار

وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ۔ یہ اس شخص کے لئے کمین گاہ ہے جو اس سے پہلے خدا اور اس کے رسول سے جنگ کرتا رہا ہے کہ وہ اس کی اوٹ میں بیٹھ کر اسلام کے قلعے پر گولہ باری کرے۔ وَلَیَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَا اِلَّا الْحُسْنٰی۔ یہ لوگ قسمیں کھائیں گے کہ ہمارے ارادے بڑے نیک ہیں۔ ہم یہ سب کچھ کارِ خیر سمجھ کر کر رہے ہیں۔ وَاللّٰهُ یَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ۔ اللہ اس کی شہادت دیتا ہے کہ یہ لوگ بچے جھوٹے ہیں۔ لہٰذا اے رسول! لَا تَقُمْ فِیْهِ اَبَدًا۔ (۹/۱۰۷-۱۰۸) تم ہرگز ہرگز اس مسجد میں قدم نہ رکھنا۔

آپ نے غور کیا کہ قرآنِ کریم کی رُو سے اُمت میں تفرقہ پیدا کرنا کتنا بڑا جرم ہے؟ اتنا بڑا جرم کہ اگر کوئی

مسجد بھی مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے کا موجب بنے تو اس مسجد میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں ہو سکتی۔ وہ مسجد نہیں، ایسی کمین گاہ ہے جس میں بیٹھ کر، دشمنانِ دین، حصارِ ملّت پر گولہ باری کرتے ہیں۔

ایک طرف اس اُمّت کو تفرقہ اور اختلافات سے بچنے کی اس قدر سخت تاکیدات کیں اور دوسری طرف یہ حقیقت ان کے دل پر اچھی طرح منقوش کر دی کہ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ۔ (۴۹/۱۰) یاد رکھو! سب مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ۔ (۴۸/۲۹)

محمدؐ اللہ کا رسول۔ اور جو لوگ اس کے ساتھی ہیں، وہ کفّار کے مقابلہ میں (چٹان کی طرح) سخت ہیں اور آپس میں نہایت نرم اور مرحمت کوش۔

ان کے باہمی اتفاق، یک جہتی اور باہم پیوستگی کا یہ عالم ہے:۔

کَاَنَّھُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ ———— (۶۱/۴)

گویا وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔

یہ تھی وہ اُمّت جسے قرآنِ کریم کی تعلیم کے مطابق نبیؐ اکرمؐ نے متشکل فرمایا۔ اس اُمّت کے افراد میں کوئی اختلاف نہیں تھا، کسی قسم کا تفرقہ نہیں تھا۔ کوئی الگ الگ پارٹیاں نہیں تھیں۔ حضورؐ کو ان کی وحدت اور باہمدگر محبّت اور اُلفت کا اس قدر خیال تھا کہ آپؐ نے اپنے آخری حج کے خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ

حجتہ الوداع کا خطبہ

اے لوگو! یقیناً تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ ایک ہے (یعنی تم سب اصل کے اعتبار سے ایک ہو) عربی کو عجمی پر، سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں، بجز تقویٰ کے۔

یاد رکھو! ہر مسلمان، دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور تمام مسلمان ایک دوسرے کے بھائی بھائی ہیں۔ تمہارا خون اور تمہارا مال قیامت تک اس طرح (ایک دوسرے پر) حرام ہے جس طرح یہ دن اس مہینے میں اور اس شہر میں حرام (واجب الاحترام) ہے۔

پھر فرمایا:۔

میں تم میں ایک چیز چھوڑے جاتا ہوں اگر تم نے اسے مضبوط پکڑ لیا تو تم گمراہ نہیں

ہوگے، وہ چیز کیا ہے؟ کتاب اللہ!

(صحاح، بحوالہ سیرۃ النبیؐ، علامہ شبلی، جلد دوم، صفحہ ۱۵۶-۱۵۲)

مسلمانوں کے خون کے واجب الاحترام ہونے کا اندازہ اس سے لگائیے کہ قرآنِ کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا۔ (۴/۹۳)

اور جو (مسلمان) کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کر دے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہوگی اور اس کے لئے خدا نے سخت عذاب تیار کر رکھا ہے۔

ان تاکیدی احکام کے ساتھ نبی اکرمؐ نے اس اُمّتِ واحدہ کو اپنے پیچھے چھوڑا۔ پھر اس اُمّت سے یہ بھی کہہ دیا کہ تم یہ نہ سمجھ لینا کہ یہ وحدت اور اتحاد، صرف نبی اکرمؐ کی زندگی تک ہے۔ حضورؐ کے بعد اس میں اختلاف اور تفرقہ پیدا ہو سکتا ہے اور یہ اُمّت فرقوں اور پارٹیوں میں بٹ سکتی ہے۔ ان سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ۔ محمدؐ بجز ایں نیست کہ اللہ کے رسول ہیں۔ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ۔ آپ سے پہلے بھی بہت سے رسول ہو گزرے ہیں۔ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ۔ سو اگر یہ (کل کو) وفات پا جائیں یا قتل کر دیئے جائیں، تو کیا تم (یہ سمجھ کر کہ یہ سارا انتظام اور اُمّت کی وحدت آپؐ کی زندگی تک تھی) پھر سے اُسی روشِ کہن کی طرف پلٹ جاؤ گے۔ (اور فرقوں اور گروہوں میں بٹ جاؤ گے؟) وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا۔ (۳/۱۴۴) اور جو کوئی اس روشِ کہن کی طرف پلٹ جائے گا تو وہ اس سے اللہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ (کچھ اپنا ہی نقصان کرے گا)۔

ہماری حالت

یہ تھی وہ اُمّتِ واحدہ جسے نبی اکرمؐ نے چھوڑا۔ اس کے بعد تاریخ کے اوراق چودہ سو سال آگے کی طرف اُلٹیے اور دیکھئے کہ آج اُسی اُمّتِ واحدہ کی کیا صورت ہے؟ تعداد کے اعتبار سے دیکھئے تو آسمان کے تاروں کی طرح اَن گنت (کم از کم پچاس، ساٹھ

کروڑ کا تو عام اندازہ ہے ۱)۔ جغرافیائی پوزیشن کے اعتبار سے دیکھئے تو کرۂ ارض کے بیچوں بیچ، مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک، ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر۔ لیکن اختلافات کو دیکھئے تو انسان محوِ حیرت رہ جاتا ہے کہ کیا یہ وہی اُمّت ہے جس کی وحدت کے متعلّق قرآنِ کریم نے اتنے تاکیدی احکام دیئے تھے؟ کہیں نسلوں کا اختلاف ہے۔ ـــــ یہ مغل، وہ پٹھان؛ یہ ترک وہ عرب ـــــ کہیں قومیّتوں کا اختلاف ہے ـــــ یہ مصری وہ ایرانی؛ یہ عراقی وہ حجازی؛ یہ ہندی وہ چینی ـــــ یہ تو رہے نسلی اور وطنی اختلافات۔ اس سے آگے بڑھیئے تو ایک ہی ملک کے اندر ذاتوں اور برادریوں کے اختلافات ـــــ شیخ، مرزا، راجپوت، پٹھان، جاٹ، ارائیں ـــــ پھر صوبائی اختلافات ـــــ سندھی، پنجابی، سرحدی، بلوچی ـــــ ان سب اختلافات کے اوپر، اور سب سے گہرا مذہبی فرقہ بندی کا اختلاف ـــــ یہ شیعہ وہ سُنّی؛ یہ حنفی وہ وہابی؛ یہ دیوبندی وہ بریلوی؛ یہ اہلِ حدیث وہ اہلِ قرآن ـــــ ان کے علاوہ، سیاسی پارٹیوں کے ہنگامی اختلافات۔ جب انسان اس اُمّت کو دیکھتا ہے جسے نبیِ اکرمؐ نے چھوڑا تھا اور اس کے بعد اس اُمّت پر نظر ڈالتا ہے جو آج کل ہمارے سامنے ہے تو وہ انگشت بدنداں رہ جاتا ہے ـــــ یقیناً آسمان کی آنکھ نے ایسا انقلاب کبھی نہیں دیکھا ہوگا! یہ اختلافات کیسے رونما ہوئے اور اُمّتِ واحدہ اِس قدر تاکیدات کے باوجود اتنے ٹکڑوں میں کیسے بٹ گئی؛ یہ ایک جگر پاش داستان ہے جسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں دیکھنا یہ چاہیئے کہ اس کے بعد کیا پھر سے وہی وحدت پیدا ہو سکتی ہے؟ اگر ہو سکتی ہے تو کس طرح؟

کیا یہ اِختلافات مِٹ سکتے ہیں

جہاں تک پہلے سوال کا تعلّق ہے (اس سوال کا کہ یہ اختلافات مٹا کر اُمّت پھر سے اُمّتِ واحدہ بن سکتی ہے یا نہیں) تو اس کے جواب کے لئے قرآنِ کریم کی اس آیت کو ایک بار پھر سامنے لایئے جس میں نبیِ اکرمؐ سے کہا گیا تھا کہ

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۔ (۱۶/۶۴)

اور ہم نے تیرے اوپر یہ کتاب نازل ہی اس لئے کی ہے کہ تو لوگوں پر ان باتوں کو واضح کر دے جن میں یہ اختلاف کرتے ہیں۔

یعنی قرآنِ کریم کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ تمام نوعِ انسان کے اختلافات مٹانے کی صلاحیّت اپنے اندر رکھتا ہے۔ اس

ـــــــــ

۱) اب اسّی نوّے کروڑ کہا جاتا ہے۔ (سنہ ۱۹۸۰ء)

کے نزول کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ اختلافی امور کو واضح کر کے دودھ اور پانی کو الگ الگ کر کے بتا دے۔ اب ظاہر ہے کہ اگر ہم قرآن کی موجودگی میں یہ کہیں کہ ہمارے اختلافات کے مٹنے کی کوئی شکل نہیں تو اس سے یا تو یہ ماننا پڑے گا کہ (معاذ اللہ) قرآن کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ وہ اختلافات مٹا سکتا ہے اور یا یہ کہ قرآن کے اس دعویٰ پر ہمارا ایمان نہیں۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ مختلف فرقوں میں سے ہر فرقہ کا دعویٰ ہے کہ ان کا عقیدہ اور مسلک قرآنِ کریم کے مطابق ہے۔ اگر اس بات کو صحیح مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خود قرآنِ کریم میں (معاذ اللہ) اختلافی باتیں موجود ہیں، جبھی تو اس سے ہر فرقہ کو اس کے مسلک کی تائید مل جاتی ہے۔ لیکن یہ چیز خود قرآنِ کریم کے دعوے کے خلاف ہے۔ اس نے کہا ہے کہ میرے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ مجھ میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ اس نے صاف الفاظ میں کہا ہے کہ

ضرار

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا۔ (۴/۸۲)

کیا یہ لوگ قرآن میں غور و تدبر نہیں کرتے۔ اگر یہ غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو اس میں یہ بہت سے اختلافات پاتے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ

۱۔ قرآنِ کریم میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ اس لئے اس سے مختلف فرقوں کو اپنے اپنے مسلک کی تائید میں سند نہیں مل سکتی۔

۲۔ قرآنِ کریم دنیا کے اختلافات مٹانے کے لئے آیا تھا۔ اس میں آج بھی یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ ہمارے اختلافات مٹا دے۔

لیکن کس طرح؟

اس سے دوسرا سوال سامنے آتا ہے کہ یہ اختلافات مٹ کس طرح سکتے ہیں؟ اس سلسلہ میں قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ: وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ۔ (۴۲/۱۰) "تم جس بات میں بھی اختلاف کرو تو اس کا فیصلہ اللہ کی طرف سے ہونا چاہیئے" یعنی ہر اختلافی معاملہ میں فیصلہ خدا سے لینا چاہیئے۔ "خدا سے فیصلہ لینے" کے معنی یہ ہیں کہ اس کی کتاب سے فیصلہ لیا جائے۔ ہر اختلافی معاملہ میں قرآنِ کریم کو حَکَم مانا جائے، اسے ثالث تسلیم کیا جائے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ قرآنِ کریم سے فیصلہ کس طرح لیا جائے؟ کیا اس طرح کہ جن دو فرقوں یا پارٹیوں میں اختلاف ہو، وہ اپنے اپنے طور پر قرآنِ کریم سے فیصلہ لے لیں۔ اس طرح تو اختلافات مٹ نہیں سکتے۔ ہم آئے دن، مختلف فرقوں کے مناظرہ کرنے والوں کو دیکھتے ہیں۔ دونوں فریق، قرآن کی آیات پیش کرتے ہیں لیکن یہ اُسے کہتا ہے کہ تم نے قرآن کے غلط معنی کئے ہیں یا غلط مفہوم لیا ہے اور وہ اسے بھی الزام دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ دن بھر مناظرہ ہوتا رہتا ہے اور شام کو اس کا خاتمہ اکثر جھگڑے اور فساد پر ہوتا ہے۔ ہزار برس سے یہ مناظرے ہو رہے ہیں لیکن ان سے کوئی فرقہ مٹ نہیں سکا، بلکہ ان میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ لہٰذا قرآنِ کریم سے فیصلہ لینے کا یہ طریق صحیح نہیں۔ اختلافی امور میں فیصلہ لینے کے لئے کسی تیسری پارٹی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی کو حَکَم یا ثالث کہتے ہیں۔ یہ وہ طریق تھا جسے نبی اکرمؐ کے زمانے میں خود اللہ تعالیٰ نے تجویز کیا تھا۔ اس نے حضورؐ کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔ (۴/۶۵)

ایک زندہ اتھارٹی کی ضرورت

تیرے رب کی قسم ہے کہ یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک اپنے اختلافی معاملہ میں تجھے اپنا ثالث (حاکم) نہ بنائیں۔ پھر تیرے فیصلہ سے اپنے دل میں بھی کوئی گرانی محسوس نہ کریں بلکہ اس کے سامنے (بہ طیبِ خاطر) سرِ تسلیم خم کر دیں۔

مومنین پر یہ شرط عائد کی اور نبی اکرمؐ کو حکم دیا کہ جب یہ لوگ کسی اختلافی معاملہ میں فیصلہ کرانے کے لئے تیرے پاس آئیں تو "فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ ــــــ (۵/۴۸)" تو ان میں قرآنِ کریم کے مطابق فیصلہ کیا کرو"۔

یہ تھا وہ عملی طریق جس سے اُمت میں کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا تھا۔ لیکن یہ سوال سامنے آئے گا کہ یہ عملی طریق تو رسول اللہؐ کی زندگی میں کارفرما تھا۔ رسول اللہؐ کے بعد کونسا عملی طریق اختیار کیا جائے گا؟

اس سوال کا جواب قرآنِ کریم نے خود ہی دے دیا تھا، جب اس نے کہا تھا کہ أَفَإِن مَّاتَ أَوْ قُتِلَ انقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ (۳/۱۴۳)۔ کیا اگر کل کو (رسول اللہؐ) وفات پا جائیں یا قتل کر دیئے جائیں، تو تم (یہ سمجھ کر کہ یہ سلسلہ صرف حضورؐ کی ذات تک محدود تھا) پھر اپنے پرانے طریقے کی طرف پلٹ جاؤ گے؟...

اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہی عملی طریق جو رسول اللہؐ کی زندگی میں رائج تھا حضورؐ کے بعد بھی جاری رہنا تھا۔ اسلام کا نظام حضورؐ کی طبیعی زندگی تک محدود نہیں تھا۔

حضورؐ کے بعد

اب سوال یہ پیدا ہوگا کہ حضورؐ کے بعد، اس سلسلہ کی عملی شکل کیا ہوگی؟ اس کا جواب بھی قرآنِ کریم نے خود ہی دے دیا تھا۔ اس نے بتایا کہ نبی اکرمؐ کا فریضہ یہ تھا کہ يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ۔ (۷/۱۵۷) "وہ لوگوں کو معروف کا حکم دیتا ہے اور منکر سے روکتا ہے" یعنی جن امور کو قرآن نے صحیح ٹھہرایا ہے وہ ان کے کرنے کا حکم دیتا ہے اور جنہیں اس نے غلط قرار دیا ہے وہ لوگوں کو ان سے روکتا ہے۔ رسول اللہؐ کے بعد یہی فریضہ اُمّت کا قرار پا جاتا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ۔ (۳/۱۰۹)۔ "تم بہترین اُمّت ہو جسے نوعِ انسان کی بھلائی کے لئے متشکل کیا گیا ہے۔ تم لوگوں کو معروف کا حکم دیتے ہو اور منکر سے روکتے ہو۔" اسی اُمّت کو خدا نے اپنی کتاب کا وارث قرار دیا ہے۔ ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا۔ (۳۵/۳۲) "پھر ہم نے اس کتاب کا وارث انہیں بنایا جنہیں ہم نے اپنے بندوں میں سے اس مقصد کے لئے چن لیا تھا۔ لہٰذا رسول اللہؐ کے بعد اُمّت کا فریضہ قرار پاگیا کہ وہ ایسا انتظام کرے کہ لوگ اپنے اختلافی امور کے فیصلہ کے لئے ایک حَکَم (ثالث) کی طرف رجوع کیا کریں جو، ان امور کا فیصلہ قرآنِ کریم کے مطابق کرے، یعنی یہ اُمّت باہمی مشورہ سے۔" (۴۲/۳۸)۔ ایسا نظامِ حکومت قائم کرے جس میں تمام اختلافی امور کے فیصلے قرآن کے مطابق ہوتے رہیں۔

قرآنی نظامِ حکومت

چنانچہ "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کا جو فریضہ سب سے پہلے رسول اللہؐ کا اور حضورؐ کے بعد اُمّت کا قرار دیا گیا ہے وہی فریضہ اسلامی حکومت کا قرار دیا گیا ہے۔ سورۂ حج میں ہے:۔

الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ۔ (۲۲/۴۱)

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین میں تمکن عطا کریں گے تو یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کریں گے اور معروف کا حکم دیں گے اور نہی سے روکیں گے۔

نبی اکرمؐ کی وفات کے بعد اُمّت نے باہمی مشورہ سے اس قسم کی حکومت قائم کی تھی جسے خلافت علیٰ منہاج

بنوت کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب صاف ہے کہ لوگوں کے اختلافی امور کا فیصلہ کرنے میں جو فرائض اپنی زندگی

جانشینانِ رسولؐ

میں رسول اللہؐ سرانجام دیتے تھے حضورؐ کی وفات کے بعد وہی فرائض رسولؐ کا جانشین "(خلیفۃ الرسولؐ) سرانجام دیتا تھا، یعنی اسلامی حکومت (خلافتِ علیٰ منہاج رسالت) لوگوں کے اختلافی امور کے فیصلے قرآنِ کریم کے مطابق کرتی تھی۔

جب اُمت نے اس عملی طریق کو چھوڑ دیا تو اس میں اختلافات پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ اب ان اختلافات کو مٹانے کا طریق یہ ہے کہ پھر اسی قسم کی حکومت قائم ہو جائے، یعنی ایسی حکومت جو قرآنِ کریم کے مطابق فیصلے کرے۔ جب ہم نے یہ عملی طریق اختیار کر لیا تو قرآنِ کریم کا یہ دعویٰ سچا ثابت ہو کر سامنے آجائے گا کہ یہ کتاب نوعِ انسان کے اختلافات مٹانے کے لئے آئی تھی اور اس میں آج بھی یہ صلاحیت موجود ہے کہ اُمت کے اختلافات مٹا سکے۔

سیاسی پارٹیاں

قرآنی نظامِ حکومت میں سیاسی پارٹیاں بھی باقی نہیں رہتیں۔ یہ پارٹیاں وحدتِ اُمت کو پارہ پارہ کر دیتی ہیں۔ اسی لئے قرآنِ کریم نے پارٹی بازی کو سنگین جرم قرار دیا ہے۔ (مثلاً) جب حضرت موسےٰؑ کو حکم دیا گیا کہ وہ فرعون کے خلاف اپنی مہم شروع کریں تو فرعون کے جرائم میں ایک شق یہ بھی تھی کہ اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا۔ (۲۸/۴) فرعون نے ملک میں سرکشی اختیار کر رکھی ہے اور اس کے باشندوں کو پارٹیوں میں تقسیم کر دیا ہے۔" یعنی فرعون کا یہ جرم اتنا سنگین تھا کہ اسے اس سے روکنے کے لئے حضرت موسیٰؑ کو مامور کیا گیا۔ قرآن نے کسی ملک میں پارٹیوں کے وجود کو، اس ملک کے لئے خدا کا عذاب قرار دیا ہے۔ سورۂ انعام میں ہے۔ قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰ أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ أَوْ مِنْ تَحْتِ أَرْجُلِكُمْ۔ ان سے کہہ دو کہ خدا اس پر قادر ہے کہ تم پر اُوپر سے عذاب بھیجے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے أَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَيُذِيقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ یا تمہاری پارٹیاں بنا کر تمہیں آپس میں بھڑا دے اور اس طرح تمہیں ایک دوسرے کی لڑائی کا مزا چکھا دے۔ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُونَ۔ (۶/۶۵) "دیکھو! ہم کس طرح ان احکام و دلائل کو پھیر پھیر کر بیان کرتے ہیں تاکہ لوگ بات کو سمجھ سکیں۔"

اس نظامِ حکومت میں ساری اُمت شریک ہوگی، یعنی یہ ساری اُمت کے باہمی مشورے سے قائم

ہو گا۔ اور تمام امور کے فیصلے، نمائندگانِ اُمّت کے باہمی مشورے سے، قرآنِ کریم کے مطابق کئے جائیں گے۔ اس میں حکومت کسی خاص پارٹی کی نہیں ہو گی۔ نہ ہی حکومت کے مقابلہ میں کوئی پارٹی ہو گی جو ہر وقت اس فکر میں لگی رہے کہ کسی طرح حکومت کو ناکام بنا کر خود حکومت کی کرسیاں سنبھال لے۔ بغیر کسی پارٹی کے اُمّت کی مشترکہ حکومت، یہ ہے قرآنی نظام کی خصوصیت۔

اس وحدت سے ذاتوں اور برادریوں کی کش مکش ختم ہو جائے گی اور اس سے بنگالی اور غیر بنگالی، سندھی اور پنجابی، سرحدی اور بلوچی کا تفرقہ مٹ جائے گا۔ یہ سب قطرے، اُمّت کے سمندر میں مِل کر خود سمندر بن جائیں گے۔ ہر ایک اپنے آپ کو مسلمان کہے گا کہ یہی نام ہمارے خدا نے ہمارے لئے تجویز کیا تھا (هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ - ۲۲/۷۸)، اور مسلمان اور مسلمان میں کوئی تفریق یا مغائرت باقی نہیں رہے گی۔ سب آپس میں بھائی بھائی ہوں گے ——— ایک دوسرے کے خیر خواہ : اور خدا کے سپاہی یعنی دنیا میں حق کے محافظ۔

اُمّت میں ازسرِ نو وحدت پیدا کرنے کے پروگرام کی ابتدا کسی ایک ملک سے ہونی چاہیئے۔ اس کے لئے پاکستان سے زیادہ موزوں اور کوئی خطۂ زمین نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ پاکستان کا مطالبہ، تمام مسلمانانِ ہند نے

پاکستان میں وحدتِ ملّت

نسلی، لسانی، قبائلی، صوبائی، مذہبی، فرقہ وارانہ، غرضیکہ ہر قسم کے اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر، بیک زبان کیا تھا اور اس مطالبہ کی بنیاد اس آرزو پر تھی کہ ہم سب اس آزاد مملکت میں اسلامی انداز کی زندگی بسر کریں۔ بر ہماری بدقسمتی تھی کہ تشکیلِ پاکستان کے بعد ہم مختلف قسم کے مفادات میں اُلجھ کر رہ گئے۔ اور وحدتِ ملّت اور اسلامی طرزِ زندگی کے بلند مقاصد ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ لیکن اس میں مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ اختلافات مٹانے والی خدا کی کتاب ہمارے پاس ہے۔ اگر حکومت اسے اپنے فیصلوں کا مرکز قرار دے لے تو عام اختلافات مٹ جائیں گے۔

اگر ہم وحدتِ ملّت کے اس تجربہ میں کامیاب ہو گئے تو یہ مسلمانانِ عالم کی وحدت کے لئے سنگِ بنیاد کا کام دے گا۔ ہم دیگر مسلم ممالک کے سامنے اس تجربہ کے درخشندہ نتائج پیش کر کے، انہیں اس کی طرف دعوت دے سکیں گے۔

یہی وہ حقیقت تھی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے بہت پہلے کہا تھا کہ

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بہ خاکِ کاشغر!

وحدتِ انسانیّت

پھر یہ بھی واضح رہے کہ امّتِ مسلمہ کی یہ وحدت دوسری اقوام یا ممالک کے خلاف (خدا نکردہ) کسی جارحانہ اقدام کے لئے نہیں ہوگی۔ یہ نوعِ انسان کی عالمگیر برادری کی تشکیل کے لئے خشتِ اوّل ہوگی۔ اس لئے کہ (جیسا کہ شروع میں بتایا جا چکا ہے) قرآنِ کریم کا نصب العین، پوری کی پوری انسانیّت میں وحدت پیدا کرنا ہے۔ اس اُمّت کا مقصد جمعیتِ اقوام کے بجائے "جمعیتِ آدم" ہے اور یہ جمعیت، ایمان (آئیڈیالوجی) کے اشتراک کے سوا کسی بنیاد پر استوار نہیں ہو سکتی۔ مسلمانوں کا خدا، ربّ العالمین، ان کا ضابطۂ زندگی، ذکرٌ للعالمین، ان کا رسوؐل، رحمۃٌ للعالمین ہے۔ اور یہی وہ آئیڈیالوجی ہے جو تمام نوعِ انسانی میں وحدت پیدا کرنے کا موجب بن سکتی ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَولیاء اللہ کون ہیں ؟

(جنوری ۱۹۶۳ء)

اولیاء اللہ کے الفاظ سنتے ہی ہمارا ذہن ایک خاص گروہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو عام انسانوں ہی سے نہیں بلکہ جماعتِ مومنین سے منفرد اور الگ ہے۔ ان کی خصوصیات ایسی ہیں جو دوسرے مسلمانوں میں نہیں پائی جاتیں۔ ان کی تعلیم الگ، ان کی عبادت (ریاضت) کے طور طریق الگ، ان کا رہن سہن باقی لوگوں سے جُداگانہ۔ وہ غیب کی باتیں جانتے ہیں۔ دوسروں کے دل کے حالات تک سے واقف ہیں۔ ہر آنے والے کے متعلق پہلے ہی جان لیتے ہیں کہ وہ کیا مانگنے کے لئے آیا ہے۔ آنے والے واقعات سب اُن کی آنکھوں کے سامنے رہتے ہیں۔ وہ جو کچھ زبان سے کہتے ہیں ہو جاتا ہے۔

اولیاء اللہ کی خصوصیات

وہ لوگوں کی مرادیں پوری کرتے ہیں، بگڑی بنا دیتے ہیں — تقدیریں بدل دیتے ہیں، قسمت کا لکھا مٹا دیتے ہیں۔ ان کا غصہ تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ ان کی خوشنودی، دنیا و آخرت سنوار دیتی ہے۔ انہوں نے جس کی طرف نگہ کرم سے دیکھ لیا اُس کا بیڑا پار ہوگیا، جس سے رُخ پھیر لیا وہ کہیں کا نہ رہا۔ ان کا ماننے والا جہاں بھی انہیں پکارے وہ اس کی سنتے ہیں، اس کی پکار کا جواب دیتے ہیں اور اس کی مدد کو پہنچتے ہیں۔ ان سے ایسی ایسی کرامات سرزد ہوتی ہیں جن سے عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ وہ جب تک جی چاہے دنیا میں رہتے ہیں۔ جب چاہیں یہاں سے "پردہ" کر لیتے ہیں۔ (وہ مرتے نہیں صرف لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ اس لئے جو کچھ وہ دُنیا میں ہوتے ہوئے لوگوں کے سامنے کرتے ہیں وہی کچھ اُن کی نگاہوں

سے اوجھل ہو کر بھی کرتے ہیں) وہ مرنے کے بعد بھی لوگوں کی دعائیں بدستور سنتے ہیں، ان کی مرادیں پوری کرتے ہیں، ان کی مدد کو پہنچتے ہیں۔ وہ جیتے جی بھی دربارِ خداوندی میں جاتے ہیں۔ مرنے کے بعد وہیں ہوتے ہیں۔ محکمۂ قضا و قدر کی طرف سے دنیا کا نظم ونسق ان کے سپرد ہوتا ہے۔ جس طرح دنیاوی حکومت کی طرف سے مختلف کار پرداز مقرر ہوتے ہیں، گورنر، کمشنر، ڈپٹی کمشنر، سپرنٹنڈنٹ پولیس وغیرہ اسی طرح محکمۂ قضا و قدر کی طرف سے دنیاوی امور کا انتظام و انصرام "اولیاء اللہ" کے سپرد ہوتا ہے۔ انکے بھی مختلف مدارج و مناصب ہوتے ہیں اور انہی کے اعتبار سے مختلف امورِ مملکت ان کے سپرد کئے جاتے ہیں۔ ظاہری حکومت کے کارندے، گورنر، کمشنر وغیرہ یوں ہی کٹھ پتلیاں ہوتے ہیں جو اِن حقیقی کار پردازانِ قضا و قدر کے فیصلوں کی تعمیل کرنے پر مامور ہوتے ہیں۔ غرضیکہ کائنات کا سارا نظم ونسق انہی کے سپرد ہوتا ہے۔ اور جو کچھ ہوتا ہے انہی کے اشاروں سے ہوتا ہے۔ جب ان کا کوئی معتقد مرنے کے بعد قبر میں منکر نکیر کے عذاب سے ڈر کر ان کی دہائی دیتا ہے تو یہ وہاں بھی ان کی مدد کو پہنچتے ہیں اور جب قیامت میں ہر طرف نفسا نفسی ہو گی تو یہ اپنے مریدوں کو سیدھے جنّت میں لے جائیں گے۔

اس گروہ کے، عام جماعتِ مومنین سے الگ اور منفرد ہونے کا اندازہ اس سے لگایئے کہ جب "اولیاء اللہ" کہا جاتا ہے تو کسی کا خیال نہ حضرت ابوبکر رضؓ صدیق کی طرف جاتا ہے نہ عمر فاروق رضؓ کی طرف۔ نہ خالد سیف اللہ رضؓ اس زمرہ میں شریک دکھائی دیتے ہیں نہ عمرو بن العاص رضؓ۔ ان کی اہمیّت کا یہ عالم ہے کہ (مثلاً) ان کے عرسوں کی تاریخیں ہر وقت، ہر شخص کی نگاہوں کے سامنے رہتی ہیں۔ لیکن

صحابہؓ کا شمار بھی ان میں نہیں ہوتا

اگر آپ حضرت ابوبکر رضؓ صدیق کی تاریخِ وفات یا حضرت عمر رضؓ کے سنِ شہادت کے متعلق دریافت کریں تو شاید سَو(۱۰۰) میں سے دس مسلمان بھی نہ بتا سکیں۔ ان کے مزارات کی عظمت کی یہ کیفیت ہے کہ، ایک ایک قبر پر لاکھوں روپے کی عمارات قائم ہوں گی اور ہزاروں روپے کے غلاف سالانہ چڑھتے ہوں گے۔ لیکن اس کا علم شاید ایک فی صد مسلمانوں کو بھی نہ ہو کہ (مثلاً) حضرت عثمان رضؓ کہاں دفن ہوئے تھے اور ان کے مزار کی آج کیا حالت ہے؟ حضرت صدیقِ اکبر رضؓ اور حضرت عمر فاروق رضؓ کی کسی کرامت کا ذکر تک آپ نے کہیں سے نہیں سُنا ہو گا، لیکن سائیں "گھوڑے شاہ" اور "کھونڈی شاہ" کی

کرامات کے چرچے ہر خاص و عام کی زبان پر ہوں گے۔ آپ نے کبھی کسی کو یہ کہتے نہیں سنا ہوگا کہ میں حضرت عمر رضؓ کی نیاز دے رہا ہوں۔ اس کے برعکس حضرت "شاہ لکھی" کی نیاز کی دیگوں کی آواز ہر تیسرے دن سنائی دے گی۔

"اولیاء اللہ" کے اس خاص گروہ کا تصوّر، جہلا تک ہی محدود نہیں، مسلمانوں کا بلند پایہ علمی طبقہ — خواہ وہ علومِ شریعت کے حامل ہوں یا دنیاوی علوم کے ماہر، ان کی ان خصوصیات کا معترف اور ان کی جداگانہ ہستی کا قائل ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کوئی اس میں ذرا مبالغہ سے کام لیتا ہے کوئی اعتدال پر رہتا ہے، لیکن اس جداگانہ گروہ کے قائل سب ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا قرآنِ کریم بھی اس قسم کے کسی الگ گروہ کا ذکر کرتا ہے اور ان کی وہ خصوصیات بتاتا ہے جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ قرآنِ کریم میں "ولی" کا لفظ بھی آیا ہے، اور "اولیاء" کا بھی — بلکہ "اولیاء اللہ" کا بھی — اس لئے ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ ان الفاظ کے معنی کیا ہیں اور قرآن انہیں کن لوگوں کے لئے استعمال کرتا ہے۔

ولی کے معنی

اَلْوَلِیُّ کے بنیادی معنی ہیں کسی کے قریب اور نزدیک ہونا۔ قُرب کے اعتبار سے اَلْوَلِیُّ دوست اور مددگار کو کہتے ہیں۔ اِسْتَوْلٰی عَلَی الشَّیْءِ کے معنی ہیں، کسی چیز کو اپنے قبضۂ قدرت میں لے لینا، کسی پر غالب آجانا۔ اس اعتبار سے وَالِیٌ نگران، ناظم اور حاکم کو کہتے ہیں۔

وَلّٰی کے متضاد معنی آتے ہیں، یعنی کسی کی طرف رجوع کرنا بھی اور اس سے اعراض برتنا بھی۔ تَوَلّٰی عَنْہُ اس سے اعراض برتنا۔ تَوَلَّاہُ اس کی پیروی کرنا، اسے اختیار کرنا۔ اس اعتبار سے اَلْوَلِیُّ کے معنی اطاعت کرنے والا بھی ہوں گے۔

قرآنِ کریم میں :-

(۱) خدا کو مومنین کا ولی کہا گیا ہے۔

(۲) مومنین کو خدا کا ولی بتایا گیا ہے۔ اور

(۳) مومنین کو ایک دوسرے کا ولی کہا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ جب خدا کے متعلق کہا جائے گا کہ وہ مومنین کا ولی ہے تو اس کے بنیادی معنی نگران، سرپرست، حاکم، مطاع کے ہوں گے۔

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰۗـــُٔــھُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَـھُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ (۲/۲۵۷)

"اللہ ان لوگوں کا سرپرست، نگران، حاکم، مطاع ہے، جو ایمان کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ انہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں، ان کی سرپرست، نگران، حاکم، مطاع، غیر خداوندی سرکش قوتیں ہوتی ہیں جو انہیں روشنی سے نکال کر تاریکیوں کی طرف لے جاتی ہیں۔

اسی لئے قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ خدا کے سوا کسی اور کو اپنا "ولی" نہ بناؤ۔

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَاۗءَ ۚ فَاللّٰهُ هُوَ الْوَلِيُّ وَهُوَ يُحْيِ الْمَوْتٰى (۴۲/۹)

کیا ان لوگوں نے اللہ کے سوا اوروں کو "اولیاء" (سرپرست، آقا، حاکم، مطاع) قرار دے رکھا ہے، حالانکہ اللہ ہی ہے جو حقیقی سرپرست اور کارساز ہے۔ وہ مُردوں تک کو زندگی عطا کر دیتا ہے۔

ولی بمعنی مطاع

خدا کو "ولی" (یا مولیٰ) تسلیم کرنے سے مراد یہ ہے کہ اطاعت صرف اسی کے قوانین کی کی جائے۔ اس میں کسی کی محکومیت کو شریک نہ کیا جائے۔ سورۂ کہف میں ہے:۔

مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ ۡ وَّلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا۔ (۱۸/۲۶)

اس کے سوا لوگوں کا کوئی ولی نہیں اور وہ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔

خدا کی ولایت (سرپرستی، نگرانی، حفاظت) بھی اسی کو حاصل ہو سکتی ہے، جو اس کے قوانین کی اطاعت کرے اور ان کے مقابلہ میں اپنے یا دوسروں کے جذبات اور خواہشات کا اتباع نہ کرنے لگ جائے۔ سورۂ بقرہ میں ہے۔ قُلْ اِنَّ ھُدَى اللّٰهِ ھُوَ الْهُدٰى۔ ان سے کہہ دو کہ خدا کی طرف سے نازل شدہ ہدایت ہی ایسی ہے جو حقیقی معنوں میں ہدایت کہلانے کی مستحق ہے۔ وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَھْوَاۗءَھُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَاۗءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ۔ (۲/۱۲۰) "اگر تم نے ان لوگوں کے خیالات کا اتباع کر لیا، باوجودیکہ تمہارے پاس علم و یقین کی روشنی (وحی خداوندی) آچکی ہے تو تم خدا کی

ولایت و نصرت سے محروم ہو جاؤ گے۔ یعنی اس کی نصرت اور سرپرستی مشروط ہے اس سے کہ انسان اس کی نازل کردہ وحی کے مطابق چلے۔ دوسرے مقام پر ہے :-

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تُطِيعُوا الَّذِينَ كَفَرُوا يَرُدُّوكُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ فَتَنقَلِبُوا خَاسِرِينَ ۔ بَلِ اللَّهُ مَوْلَاكُمْ وَهُوَ خَيْرُ النَّاصِرِينَ ۔ (۳/۱۴۸-۱۴۹)

اے ایمان والو! اگر تم نے ان لوگوں کی اطاعت کی جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کر لی ہے تو یاد رکھو! وہ تمہیں راہِ حق سے اُلٹے پاؤں پھرا دیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم کامیابیوں کے راستے پر گامزن ہو جانے کے بعد پھر تباہیوں کے جہنم میں جا گرو گے۔ یہ لوگ تمہارے کارساز اور مطاع نہیں ہو سکتے۔ تمہارا کارساز اور مطاع، حامی و ناصر صرف خدا ہے۔ تم اسی کی اطاعت اختیار کرو۔

یہ اطاعت صرف قرآنِ کریم کی ہے۔ اس کے سوا کسی کی اطاعت اور اتباع جائز نہیں۔

اطاعت قرآن کی ہے

اتَّبِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِن دُونِهِ أَوْلِيَاءَ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ ۔ (۷/۳)

جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے نازل ہوا ہے اس کا اتباع کرو۔ اور اس کے علاوہ اپنے خود ساختہ مطاعوں کا اتباع مت کرو۔ (یہ بڑی واضح بات ہے) لیکن بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ تم اس حقیقت کو نگاہ کے سامنے رکھو۔ (تم اوروں کی اطاعت کرنے لگ جاتے ہو)۔

ان مقامات سے واضح ہے کہ خدا کو اپنا "ولی" تسلیم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے نازل کردہ قوانین کی اطاعت کی جائے۔ لیکن یہ اطاعت (معاذ اللہ) کسی مستبد حاکم کی اطاعت نہیں۔ اس سے خدا اور بندے میں باہمی

خدا اور بندے کا تعلّق

رفاقت کا تعلّق پیدا ہو جاتا ہے۔ (اور یہ ولایت کا دوسرا مفہوم ہے)۔ رفاقت کے معنی یہ ہیں کہ کائنات میں خدا کا ایک پروگرام جاری و ساری ہے۔ قوانینِ خداوندی کی اطاعت سے انسان اس پروگرام کی تکمیل میں ممد و معاون ہو جاتا ہے اور اس کے بدلے میں خدا کی کائناتی قوتوں کی تائید و نصرت اس کے شاملِ حال ہو جاتی ہے۔ اس طرح خدا اور بندہ ایک دوسرے کے رفیق بن جاتے ہیں۔ سورۂ محمدؐ میں ہے۔ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا

إِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ۔ (۴۷/۷) اے ایمان والو! اگر تم نے دینِ خداوندی کی مدد کی، تو خدا تمہاری مدد کرے گا۔ اور اس کی مدد کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہیں استقامت نصیب ہو جائے گی۔ تمہارے پاؤں جم جائیں گے۔ یوں خدا اور بندہ ایک دوسرے کے رفیق بن جاتے ہیں۔

اب ہم اس موضوع کے دوسرے گوشے کی طرف آتے ہیں ——— اور وہی گوشہ اس وقت بنیادی طور پر ہمارے پیشِ نظر ہے، یعنی جب کسی انسان کو "ولی اللہ" یا انسانوں کی جماعت کو "اولیاء اللہ" کہا جائے، تو اس سے کیا مراد ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ یہ مومن اور متقی ہی ہوتے ہیں۔ ان سے الگ ان کا کوئی اور گروہ نہیں ہوتا، یعنی مومن اور متقی کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ قوانینِ خداوندی کے مطیع و فرمان پذیر اور اس کے دین کی مدد کرنے والے ہوتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر جس طرح صالح، شہید، صدیق ہونا مومنین کی صفات ہیں اسی طرح اس کا "ولی اللہ" ہونا بھی اس کی ایک صفت اور خصوصیت ہے۔ چنانچہ سورۂ یونس میں ہے:۔

مومن ہی اولیاءاللہ ہیں

أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔ (۱۰/۶۲)

سن رکھو کہ اولیاءاللہ کو نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔

آپ قرآنِ کریم کے اوراق پر نگاہ ڈالیے۔ یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ مومنین کی صفت بتائی گئی ہے اور یہ نتیجہ ہے ہدایتِ خداوندی کے اتباع کا۔ چنانچہ سورۂ بقرہ کے شروع میں نوعِ انسان کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ

فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۲/۳۸)

تمہارے پاس میری طرف سے راہ نمائی آتی رہے گی۔ سو جو لوگ میری راہ نمائی کا اتباع کریں گے، انہیں نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔

اسی سورہ میں ذرا آگے چل کر ہے!

مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔ (۲/۶۲)

جو بھی اللہ اور آخرت پر ایمان لائے اور صلاحیّت بخش کام کرے تو ان لوگوں کا اجران کے رب کے ہاں سے ملے گا۔ اور وہ اجر یہ ہے کہ انہیں نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔

اس سے بھی واضح ہے کہ لَاخَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَاھُمْ یَحْزَنُوْنَ کی خصوصیّت مومنین کے کسی خاص گروہ کی نہیں، سارے مومنین کی ہے۔

ان تصریحات کے بعد پھر سورۂ یونسؑ کی اس آیت کی طرف آیئے جسے اوپر درج کیا گیا ہے اور دیکھئے کہ اس سے اگلی آیت نے کس طرح اس حقیقت کی وضاحت کر دی ہے کہ "اولیاء اللہ" مومنین سے الگ کوئی جماعت نہیں۔ جو آیت پہلے درج کی گئی ہے وہ یہ ہے۔ اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَاخَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَاھُمْ یَحْزَنُوْنَ۔ سن رکھو کہ اولیاء اللہ کو نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔ اس کے بعد ہے۔ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ۔ (۱۰/۶۳) یعنی ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور انہوں نے قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کی۔ یہاں دیکھئے قرآنِ کریم نے کس طرح اولیاء اللہ کی تشریح یہ کہہ کر کر دی کہ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ۔ یعنی یہ مومنین اور متّقین ہی کا دوسرا نام ہے، ان سے الگ کوئی گروہ نہیں۔ یہ بھی نہیں کہ مومن اور متّقیوں میں سے بعض اولیاء اللہ ہو جاتے ہیں اور باقی صرف مومن اور متّقی رہتے ہیں۔ ہر تقویٰ شعار مومن ولی اللہ ہوتا ہے، یعنی خدا کا مطیع و فرماں بردار، اس کا رفیق۔

ہمارے ہاں اولیاء اللہ کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ وہ فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ پھٹے ہوئے کپڑے، ایک کمبل یا گدڑی اوڑھنے بچھانے کو، دنیا کی تمام لذّات اور حظائظ سے کنارہ کشی، ہر خوش گوار شے سے نفرت، ایک بہت بڑے "ولی اللہ" حضرت فضیل ابن عیاضؒ کے الفاظ میں ان کا مسلک یہ ہوتا ہے کہ

> اگر دنیا، اس کی تمام دلچسپیوں کے ساتھ مجھے دے دی جائے اور اس پر کسی محاسبہ کا اندیشہ بھی نہ ہو تب بھی میں اسے ایسا ہی ناپاک سمجھوں گا جیسے تم مردار کو ناپاک سمجھتے ہو۔

اولیاء اللہ کی دُنیاوی زندگی

لیکن قرآن کہتا ہے کہ ان اولیاء اللہ ——— یعنی مومنین متّقین کی کیفیّت یہ ہوتی ہے کہ لَھُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ۔ ان کے لئے اس دنیا کی زندگی میں بھی ہر طرح کی خوش خبریاں ہیں اور آخرت کی زندگی میں بھی،

یعنی انہیں اس دُنیا کی زندگی میں بھی ہر قسم کی خوشگواریاں اور مرفّہ الحالیاں حاصل ہوں گی ــــ اور اُخروی زندگی میں بھی کامیابیاں اور کامرانیاں۔ اور یہ بات محض ہنگامی اور اتّفاقی نہیں ہو گی، نہ ہی یہ کہ ان میں سے بعض کو یہ حاصل ہوں اور دوسروں کو نہ ہوں۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ خدا کا اٹل قانون ہے کہ ایسا ہو گا۔ لَا تَبۡدِیۡلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰهِ اور خدا کے قانون میں کبھی تبدیل نہیں ہو سکتی۔ ایسا ہمیشہ ہو گا ــــ اولیاء اللہ، یعنی جماعتِ مومنین کی دنیاوی زندگی بھی خوشگواریوں کی ہو گی اور اُخروی زندگی بھی ذٰلِكَ هُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ (۱۰/۶۴) اور یہ بہت بڑی کامیابی و کامرانی ہے۔

نزولِ ملائکہ

اولیاء اللہ کے متعلق یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ ملاء اعلیٰ کے ساتھ ان کا خاص تعلّق ہوتا ہے۔ ان پر خدا کے فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ کبھی مومنین کے کسی خاص گروہ کی خصوصیّت نہیں۔ تمام مومنین کے ساتھ ایسا ہوتا ہے۔ ان پر نزولِ ملائکہ ہوتا ہے، جو انہیں اس دنیا کی زندگی اور اُخروی زندگی میں خوشگواریوں کی بشارت دیتے ہیں۔ سورۂ حٰمٓ السجدہ میں ہے:۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا تَتَنَزَّلُ عَلَیۡهِمُ الۡمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوۡا وَلَا تَحۡزَنُوۡا وَاَبۡشِرُوۡا بِالۡجَنَّةِ الَّتِیۡ كُنۡتُمۡ تُوۡعَدُوۡنَ (۴۱/۳۰)

یقیناً وہ لوگ جنہوں نے کہہ دیا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اپنے اس ایمان پر جم کر کھڑے ہو گئے تو ان پر (سکون و طمانیّت کے حامل) فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ (جو ان سے کہتے ہیں کہ) مت خوف کھاؤ، غمگین نہ ہو اور اس جنّت کی بشارت سنو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔

وہ ان سے کہتے ہیں کہ

نَحۡنُ اَوۡلِیٰٓؤُكُمۡ فِی الۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا وَفِی الۡاٰخِرَةِ ۚ وَلَكُمۡ فِیۡهَا مَا تَشۡتَهِیۡۤ اَنۡفُسُكُمۡ وَلَكُمۡ فِیۡهَا مَا تَدَّعُوۡنَ ــــ (۴۱/۳۱)

ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے رفیق اور دوست ہیں اور آخرت کی زندگی میں بھی۔ تمہارے لئے اس دنیا کی زندگی میں بھی وہ سب کچھ ہے جس کی تمہیں آرزو ہو گی اور اُخروی زندگی میں بھی۔ تمہیں یہاں بھی وہ سب کچھ ملے گا جو تم مانگو گے اور اُس زندگی میں بھی۔

اس سے ظاہر ہے کہ ایمان اور استقامت کا لازمی نتیجہ نزولِ ملائکہ ہے اور یہ کسی خاص گروہ کی خصوصیّت

نہیں۔ یہ جماعتِ مومنین کے لئے ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انہیں اس دُنیا میں بھی وہ سب کچھ ملتا ہے جس کی وہ خواہش کرتے ہیں اور آخرت میں بھی ایسا ہی ہوگا۔ مومن جو مانگے اسے ملتا ہے۔ اِس دنیا میں بھی اور اُس دنیا میں بھی —— اس لئے کہ وہ مانگتا ہی وہ کچھ ہے جو قوانینِ خداوندی کے مطابق مل سکتا ہے۔ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ۔ (۷۶/۳۰) ظاہر ہے کہ جب جماعتِ مومنین کو ان کے ایمان و عملِ صالح کے نتیجے میں استخلاف فی الارض حاصل ہو جائے گا تو ان کی ہر مانگ پوری ہوگی۔ واضح رہے کہ ان کی یہ مانگ کسی مافوق الفطرت طریقہ سے پوری نہیں ہوتی، فطرت کے قاعدوں کے مطابق پوری ہوتی ہے۔ وہ تسخیرِ فطرت کرتے ہیں اور فطرت کی مسخر کردہ قوتوں کو قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کرتے ہیں۔ اس طرح ان کی ہر مانگ پوری ہوتی جاتی ہے۔ یہی نزولِ ملائکہ ہے۔ اشیائے فطرت کی تسخیر سے انہیں اس زندگی میں ہر قسم کی خوش گواریاں حاصل ہوتی ہیں اور چونکہ وہ ان قوتوں کی تقسیم قوانینِ خداوندی کے مطابق تمام نوعِ انسان کی مرفہ الحالی کے لئے کرتے ہیں، اس لئے ان کی اُخروی زندگی بھی کامرانیوں اور سرفرازیوں کی زندگی ہوتی ہے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

کمالِ ترک نہیں آب و گِل سے مہجوری
کمالِ ترک ہے تسخیرِ خاکی و نوری

موت کی تمنا کرنے والے

قرآنِ کریم کی رُو سے، مومن کی زندگی کا مقصود مستقل اقدار کی حفاظت ہوتا ہے۔ جب کبھی ایسا ہو کہ کسی مستقل قدر اور اس کے ذاتی رجحان یا مفاد میں (TIE) پڑ جائے، تو وہ اپنے ذاتی رجحان یا مفاد کو مستقل قدر پر قربان کر دیتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر ایسا وقت آ جائے کہ اسے کسی بلند مستقل قدر کے تحفظ کی خاطر جان دینی پڑ جائے، تو وہ بلا تامل جان بھی دے دیتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اسے دعوائے ایمان کی صداقت کا (TEST) قرار دیا ہے۔ یہود کا دعویٰ تھا کہ وہ اللہ کے پیارے "اولیاء اللہ" ہیں۔ ان سے کہا گیا کہ اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔ (۶۲/۶) "اگر تم سمجھتے ہو کہ اور لوگ نہیں، صرف تم ہی اللہ کے دوست ہو تو اگر تم اپنے اس دعویٰ میں سچے ہو تو موت کی آرزو کر کے دکھاؤ۔ واضح رہے کہ موت کی تمنا سے مراد وہ نفس کشی نہیں جو ہمارے

ہاں" اولیاء اللہ کی نشانی بتائی جاتی ہے۔ نفس کشی کا تو تصوّر ہی غیر قرآنی ہے۔ اور عیسائی رہبانیت ہندوؤں کے جوگ اور بدھوں کے نروان سے لیا گیا ہے۔ قرآن کی رُو سے موت کی تمنّا سے مراد ہے قتال فی سبیل اللہ، خدا کی راہ میں جنگ کرنا اور اس طرح دین کی محافظت کے لئے، کفن بدوش اور سر بکف دشمن کے مقابلہ کے لئے میدان میں نکل آنا۔ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ۔ (۹/۱۱۱) وہ خدا کی راہ میں جنگ کرتے ہیں۔ پھر یا تو فاتح و منصور واپس آتے ہیں یا میدانِ جنگ میں جان دے دیتے ہیں۔ خانقاہوں میں بیٹھے، اپنے نفس کے خلاف "جہادِ اکبر" میں مصروف رہنا قرآن کی رُو سے "قتالِ فی سبیل اللہ" نہیں۔ یہی وہ جماعتِ مومنین ہے جسے قرآن نے "حزب اللہ" کہہ کر پکارا ہے۔ أُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ ۚ أَلَآ إِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ۔ (۵۸/۲۲) ان کے برعکس غیر مسلموں کو اُس نے "حزب الشیطان" کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ (۵۸/۱۹)

حزب اللہ

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے، پوری کی پوری جماعتِ مومنین کا نام "اولیاء اللہ" ہے۔ یہ ان کی خصوصیت ہے۔ اس جماعت کے اندر اولیاء اللہ کا کوئی الگ گروہ نہیں۔ لیکن ہمارے ہاں اولیاء اللہ کا ایک گروہ تصوّر کیا جاتا ہے اور ان کی خصوصیات بھی عام جماعتِ مومنین سے جُداگانہ سمجھی جاتی ہیں۔ ان کے متعلق عام عقیدہ یہ ہے کہ وہ نفع یا نقصان پہنچانے کی قدرت رکھتے ہیں۔ اس لئے لوگ اپنی مرادیں مانگنے کے لئے ان کی طرف رجوع کرتے اور ان کی ناراضگی سے ڈرتے ہیں۔ قرآنِ کریم کی رُو سے یہ عقیدہ توہّم پرستی کا پیدا کردہ، فلہٰذا نہایت کمزور اور بودا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مَثَلُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِن دُونِ اللّٰهِ أَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنكَبُوتِ ۚ اتَّخَذَتْ بَيْتًا ۖ وَإِنَّ أَوْهَنَ الْبُيُوتِ لَبَيْتُ الْعَنكَبُوتِ ۖ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ۔ (۲۹/۴۱) وہ لوگ جو اللہ کے سوا اوروں کو اولیاء تصوّر اور تسلیم کرتے ہیں ان کی مثال مکڑی کی سی ہے۔ وہ ایک گھر بناتی ہے لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ اس کا گھر کس قدر کمزور اور بودا ہوتا ہے۔ اے کاش! لوگ علم و بصیرت سے کام لے کر سوچتے کہ ان کے اس قسم کے عقائد کس قدر جہالت پر مبنی ہوتے ہیں۔ جہاں تک کسی کو نفع یا نقصان پہنچانے کا تعلّق ہے، قرآن کہتا ہے کہ یہ تو اپنی ذات کے لئے بھی نفع نقصان کا اختیار نہیں رکھتے، چہ جائیکہ دوسروں کو نفع یا نقصان

نفع نقصان کی قدرت نہیں

پہنچا سکیں۔ یہ سب کچھ قانونِ خداوندی کے مطابق ہوتا ہے۔ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا ط (۱۳/۱۶) ان سے کہو کہ کیا تم اللہ کے سوا اوروں کو اولیاء تسلیم کرتے ہو، جن کی حالت یہ ہے کہ وہ خود اپنے آپ کے لئے بھی کسی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتے، چہ جائیکہ دوسروں کو نفع یا نقصان پہنچا سکیں۔ یہ سب کچھ قانونِ خداوندی کے مطابق ہوتا ہے۔ عام اولیاء اللہ تو ایک طرف، اس باب میں اس ذاتِ اقدس واعظم ؐ کے متعلق جن کا مقام یہ ہے کہ ـــــ

" بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر "

خدا کا ارشاد ہے کہ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ط (۱۰/۴۹) ان سے کہو کہ میں اپنی ذات کے لئے بھی کسی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتا۔ یہ سب خدا کے قانونِ مشیّت کے مطابق ہوتا ہے۔

یہ خدا کا مقرب بنا دیں گے

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہم ان " اولیاء اللہ " کی طرف اس لئے رجوع کرتے ہیں کہ چونکہ یہ خود مقربینِ بارگاہِ خداوندی ہیں اس لئے ہمیں بھی خدا کا مقرب بنا دیں گے۔ ہم ان کی اطاعت قربِ خداوندی حاصل کرنے کے لئے کرتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے اس عقیدہ کا بھی ذکر کیا ہے اور اس کی سختی سے تردید کی ہے۔ سورۃ الزمر میں ہے۔ اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ط ہم نے تیری طرف یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی ہے۔ سو تم اس کتاب کے مطابق خدا کی اطاعت اور محکومیت اختیار کرو اور اس اطاعت کو اس کے لئے مختص کر دو۔ اس میں کسی اور کو شریک مت کرو۔ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ط پھر سن رکھو کہ اطاعت خالصتہً احکام و قوانینِ خداوندی کی ہوگی جو اس نے اس کتاب میں دے رکھے ہیں۔ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ط جو لوگ اس کے سوا اوروں کو اولیاء تسلیم کرتے ہیں، (وہ کہتے ہیں کہ) ہم ان کی اطاعت اس لئے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں خدا کا مقرّب بنا دیں گے۔ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ط اللہ ان کی ان باتوں کا بھی فیصلہ کرتا ہے جن میں یہ (دین کی اصل وحقیقت سے) اختلاف کرتے ہیں۔ اور وہ فیصلہ یہ ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ـــــ (۳۹/۲-۳) جو جھوٹا اور ناشکر گزار ہے، خدا اسے کبھی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچاتا۔ یاد رکھو! مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ج صحیح راستے پر وہی ہے

جو خدا کے بتائے راستے پر چلتا ہے۔ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ۔ (۱۸/۱۷)
اور جو اس کی راہ نمائی کو چھوڑ کر اور راہیں اختیار کرلے تو اس کا نہ کوئی ولی ہو سکتا ہے نہ مرشد۔ مرشد (صحیح راستہ دکھانے والا) اور ولی (جس کی اطاعت کی جائے) صرف خدا کی ذات ہے اور اس کی اطاعت اس کتاب کے ذریعے کی جاتی ہے۔ جسے اس نے انسانوں کی راہ نمائی کے لئے نازل کیا ہے۔

اس ضمن میں یہ کہا جاتا ہے کہ "اولیاءاللہ" خدا تک پہنچنے (یا ہماری دعاؤں کو خدا تک پہنچانے) کا وسیلہ (ذریعہ) ہیں۔ اور ہم اس مقصد کے لئے ان کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اس عقیدہ کی تائید میں سورۂ مائدہ کی یہ آیت پیش کردی جاتی ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۔ (۵/۳۵) اس کا سیدھا سادہ ترجمہ یہ ہے۔ "اے ایمان والو! تم اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور اس کی طرف "وسیلہ" طلب کرو۔ اور اس کی راہ میں جہاد کرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ"۔ اس لفظ "وسیلہ" سے پیر پرستی کی دلیل لائی جاتی ہے اور پھر اس پر اشخاص پرستی کی وہ عظیم عمارت قائم کردی جاتی ہے جسے مٹانے کے لئے قرآن آیا تھا اور جو نبی اکرمؐ کی بعثت کا مقصد تھا۔ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۷/۱۵۷) قرآنی آیات کا اسی قسم کا غیر قرآنی مفہوم ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے کہا ہے۔ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ط (۲/۲۶) بہت سے لوگ اس قرآن (کا غلط مفہوم لے کر) گمراہ ہو جاتے ہیں اور بہت سے اس سے صحیح راہ نمائی حاصل کر لیتے ہیں۔

> یہ وسیلہ ہیں

عربی زبان میں لفظ "وسیلہ" کے معنیٰ ذریعہ ہی نہیں بلکہ مرتبہ، درجہ، قرب، منصب، منزلت بھی ہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو اور خدا کے ہاں درجہ، مرتبہ، قرب، منزلت، طلب کرو۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم اس کے راستے میں پوری پوری جدوجہد کرتے رہو۔ اس سے تم مقصدِ زندگی کے حصول میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ یہ مفہوم کہ تقویٰ سے خدا کے ہاں درجہ اور منزلت حاصل ہو جاتی ہے، قرآن کے متعدد مقامات سے واضح ہے مثلاً اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ط (۴۹/۱۳) خدا کے ہاں تم میں سب سے زیادہ واجب العزت وہ ہے جو سب سے زیادہ تقویٰ شعار ہے اور اگر "وسیلہ" کے معنی ذریعہ کئے جائیں تو بھی مطلب واضح ہے کہ تم تقویٰ اور جہاد کے ذریعہ خدا کے ہاں قدرومنزلت طلب کرو۔
قرآن، خدا اور انسان کا براہِ راست تعلق قائم کرتا ہے اور یہ تعلق اس کی کتاب کے ذریعہ قائم ہوتا ہے۔

خدا اور انسان کے درمیان دوسرے انسانوں کے ذریعہ بننے کا تصوّر غیر قرآنی ہے۔ اسی لئے اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ــــ جب (اے رسولؐ) تجھ سے میرے بندے میرے متعلّق دریافت کریں تو ان سے کہہ دو کہ میں ان سے قریب ہوں، اتنا قریب کہ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ۔ میں ہر اُس شخص کی پکار کا جواب دیتا ہوں جو مجھے پکارتا ہے، لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ۔ (۲/۱۸۶) انہیں چاہیئے کہ میری فرماں برداری کریں۔ مجھ پر ایمان رکھیں تاکہ انہیں رشد و ہدایت مل جائے۔ بات کس قدر صاف ہے۔ جو شخص قوانینِ خداوندی کی صداقت پر ایمان رکھتا ہے اور ان کی اطاعت کرتا ہے، اُسے وہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے جس کے لئے لوگ مُرشد تلاش کرتے رہتے ہیں۔ قرآن کی تعلیم کا نقطۂ ماسکہ یہ سمجھئے کہ وہ خدا اور بندے کے درمیان کسی طاقت کو حائل نہیں ہونے دیتا، نہ سیاست میں حکمران کی طاقت کو، نہ رزق کے معاملہ میں سرمایہ دار کی طاقت کو، نہ مذہب میں پیشوائیت کی طاقت کو، (اسلام میں مذہب اور سیاست الگ الگ عناصر ہیں ہی نہیں) اور نہ "خدا اور بندے کے تعلق" کے لئے پیرانِ طریقت کی طاقت کو۔ اس کی کتاب کے ذریعہ ہر شخص کا خدا سے براہِ راست تعلّق قائم ہو جاتا ہے اور اس کی اطاعت اس نظام کے ذریعہ ہوتی ہے جو اس مقصد کے لئے باہمی مشاورت سے متشکّل کیا جاتا ہے۔

خدا اور انسان کا براہِ راست تعلّق

اولیاء اللہ کے غلط تصوّر کی رُو سے خدا اور انسانوں کے درمیان اس کے "خاص بندوں" کی کڑی کو کس قدر لاینفک سمجھا جاتا ہے؟ اس کا اندازہ اس حکایت سے کیجئے جو خانقاہیّت کی تعلیم گاہوں میں سب سے پہلے ذہن نشین کرائی جاتی ہے۔

یا فرید۔ یا فرید

حکایت یہ ہے کہ بابا فریدؒ دریا کے اِس پار رہتے تھے اور ان کی خانقاہ دریا کے اُس پار تھی۔ وہ ہر صبح گھر سے نکلتے۔ آگے آگے آپ، پیچھے پیچھے آپ کا ایک مرید۔ دریا کے کنارے پہنچتے تو کسی پُل یا کشتی کے بغیر پانی پر سیدھے چلتے ہوئے اس پار پہنچ جاتے۔ اِسی طرح شام کو واپس آجاتے۔ مرید سے انہوں نے کہہ رکھا تھا کہ پانی پر چلتے وقت یا فرید یا فرید پکارتے رہا کرو۔ اس طرح برسوں گزر گئے۔ ایک دن پانی پر چلتے مرید نے سنا کہ خود بابا صاحب بھی کچھ الفاظ دہرا رہے ہیں۔ اس نے کان لگا کر سنا تو وہ کہہ رہے تھے۔ یا اللہ، یا اللہ۔ مرید نے دل میں سوچا کہ میں بھی "یا فرید" کے بجائے "یا اللہ" ہی کیوں

نہ کہوں۔ اس نے جوں ہی "یا اللہ" کہا دھڑام سے پانی میں گر گیا اور لگا غوطے کھانے۔ بابا صاحب نے اُسے سنبھالا اور کنارے پر آ کر پوچھا کہ آج کیا ہوا تھا۔ اس نے ڈرتے کانپتے بات بتائی تو آپ نے فرمایا کہ تم نے کبھی اللہ کو دیکھا ہے؟ اس سے براہِ راست کوئی راہ و رسم ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ جس سے تمہاری نہ جان نہ پہچان، اسے تم اپنی مدد کے لئے کس طرح پکار سکتے ہو؟ فرید کی خدا سے راہ و رسم ہے اس لئے وہ اسے پکارتا ہے۔ تمہاری فرید سے راہ و رسم ہے تم اسے پکارو۔ جس دن تمہاری راہ و رسم خدا سے براہِ راست ہو جائے گی، تم بھی اسے پکار لینا۔!

یہ اور اس قسم کی حکایات سے شروع ہی سے یہ چیز ذہن نشین کرائی جاتی ہے کہ خدا کے مقرّب بندے، اولیا اللہ، خدا اور دوسرے انسانوں کے درمیان لاینفک کڑی ہوتے ہیں۔ تم خدا سے براہِ راست اپنا رشتہ جوڑ ہی نہیں سکتے اور ان سے یہ رشتہ ان کی زندگی تک ہی محدود نہیں سمجھا جاتا ہے، ان کی وفات کے بعد بھی ان سے بدستور قائم رہتا ہے۔ اس لئے کہ اولیاء اللہ کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ وہ مرنے کے بعد بھی اسی طرح حاضر و ناظر رہتے ہیں جس طرح زندگی میں۔ وہ سب کی سنتے ہیں،

مُردے ہماری سُن نہیں سکتے

سب کچھ دیکھتے ہیں، مانگنے والوں کی مرادیں پوری کرتے ہیں، خدا کے ہاں ان کی سفارش کرتے ہیں۔ حالانکہ قرآنِ کریم واضح الفاظ میں کہتا ہے: وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗٓ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ۔ اور اس سے بڑھ کر گمراہ اور کون ہے جو اللہ کو چھوڑ کر اسے پکارتا ہے جو قیامت تک اس کی پکار کا جواب نہیں دے سکتا۔ (جواب دنیا تو ایک طرف) وہ ان کی پکار سے یکسر بے خبر ہوتے ہیں۔ انہیں اس کا بھی علم نہیں ہوتا کہ انہیں کون پکار رہا ہے۔ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ۔ (۴۶/۵-۶) اور جب لوگوں کو اکٹھا کیا جائے گا تو یہ اپنے پکارنے والوں کے دشمن ہوں گے اور ان کی پرستش سے یکسر انکار کر دیں گے۔ یہ آیت واضح طور پر بتا رہی ہے کہ یہاں کفار کے بتوں کا یا ان کے دیگر معبودانِ باطل کا ذکر نہیں۔ ذکر خدا کے ان نیک بندوں کا ہے جنہیں لوگ ان کی وفات کے بعد اپنی مرادوں کے لئے پکارتے ہیں۔ ان کا ان عقیدت مندوں کی اس قسم کی حرکات سے بری الذمہ ہونے کا اظہار، ان کے خدا کے مخلص بندے ہونے کی شہادت کی ہے۔ ان کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ وہ

اپنے پکارنے والوں کی پکار کو سُن ہی نہیں سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی رُو سے مرنے والوں کا اِس دُنیا سے کوئی تعلق نہیں رہتا۔ اُن کا تعلق اُس دنیا سے پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے کہا ہے کہ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ ۔۔۔ اگر تم انہیں پکارو تو وہ تمہاری پکار کو سُنتے ہی نہیں۔ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ ۔ اور اگر بفرضِ محال وہ تمہاری پکار کو سُن بھی لیتے تو وہ اس کا جواب نہیں دے سکتے تھے۔ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ ۚ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ ۔ (۳۵/۱۴-۱۵) اور قیامت کے دن وہ تمہارے اس شرک سے اظہارِ نفرت اور بیزاری کریں گے۔ یہ باتیں تمہیں وہ خدا بتا رہا ہے جس سے کچھ بھی چھپا نہیں۔ وہ اس دنیا سے چلے جانے والوں کے احوال و کوائف سے اچھی طرح واقف ہے۔ یہاں بھی آیت کے دوسرے حصّے سے واضح ہے کہ بات خدا کے ان نیک بندوں کی ہو رہی ہے جو اپنے ان عقیدت مندوں کے اس شرک سے متنفّر ہوں گے۔ سوچیئے کہ جنہیں یہ لوگ پکارتے ہیں وہ ان کے اس فعل کو شرک قرار دیتے ہیں اور یہ ان کے عقیدت مند اور تابع فرمان بنتے ہیں۔ ان کے متعلق ان کا عقیدہ ہے کہ وہ غیب کی باتیں جانتے ہیں۔ اور خدا کا ارشاد ہے کہ قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ

غیب کا علم کوئی نہیں جانتا

اِلَّا اللّٰهُ ۔۔۔ ان سے کہہ دو کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں خدا کے سوا کوئی نہیں جو غیب کا علم رکھتا ہو۔ اور مُردوں کی تو حالت یہ ہے کہ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ۔ (۲۷/۶۵) انہیں اس کا بھی علم نہیں کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے۔ کہہ دیجیے

؎ علمِ غیب کے متعلق اور تو اور خود رسول اللہ صلے سے ارشاد ہے قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ (۶/۵۰) ان سے کہہ دو کہ میں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں۔ نہ ہی یہ کہتا ہوں کہ میں غیب کا علم جانتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو (اور دوسرے رسولوں کو) جن امورِ غیب کا علم دینا چاہتا تھا وہ وحی کے ذریعہ دے دیتا تھا۔ جیسا کہ قرآنِ کریم میں حضرت مریمؑ کا قصّہ بیان کرنے کے بعد فرمایا۔ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ (۳/۴۳) یہ غیب کی ان خبروں میں سے ہے جسے اللہ نے تیری طرف وحی کیا ہے۔ چونکہ وحی نبی اکرمؐ کے ساتھ ختم ہو گئی اور غیب کے جملہ امور قرآنِ کریم کے اندر محفوظ کر دیئے گئے اس لئے اس کے بعد کسی کو غیب کا علم ہونے کا امکان بھی ختم ہو گیا۔ جو غیب کے علم کا دعویٰ کرتا ہے وہ درحقیقت نبوّت کا دعویٰ کرتا ہے۔

ہیں کہ یہ آیات عام مُردوں کے متعلق ہیں بشہیدوں سے متعلق نہیں ۔شہید زندہ ہوتے ہیں۔ اس کے بعد ان اولیاء اللہ کو شہیدوں کے زمرے میں شامل کر دیتے ہیں؟ کیونکہ انہوں نے اپنے نفس کو مار دیا ہوتا ہے۔ بلکہ ان کا رتبہ شہداء سے بھی بڑھ کر بتایا جاتا ہے۔ جب کہا جاتا ہے کہ

او کشتہ دشمن است ، ایں کشتہ دوست

اس باب میں سب سے پہلے ضمناً اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ مقتولین فی سبیل اللہ کے لئے شہداء کی اصطلاح

شہداء کے متعلق

قرآن میں نہیں آئی۔ قرآن کی رُو سے پوری کی پوری اُمّتِ محمدیہ شہداء علی النّاس ہے۔ وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ۗ (۲/۱۴۳) اس طرح ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی اُمّت بنایا ہے، تاکہ تم تمام نوعِ انسان کے اعمال کی نگرانی کر سکو اور رسولؐ (اور اس کے بعد اس کا جانشین) تمہارے اعمال کی نگرانی کرے۔

(۲) قرآن کریم میں " مقتولین فی سبیل اللہ " کے متعلق ہے :-

وَلَا تَقُولُوا لِمَن يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ ــــ (۲/۱۵۴)

جو اللہ کی راہ میں قتل ہو جاتے ہیں انہیں مردہ مت کہو۔ وہ زندہ ہیں، لیکن تم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر ان کی زندگی کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے۔

دوسری جگہ ہے :-

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ عِندَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ ۙ ــــ (۳/۱۶۸)

جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کر دیئے جائیں انہیں مُردہ مت خیال کرو۔ وہ اپنے اللہ کے ہاں زندہ ہیں اور رزق پاتے ہیں۔

مقتولینِ فی سبیل اللہ کی یہ زندگی کس قسم کی ہے اس کے متعلق بعد میں ذکر کیا جائے گا۔ اس ضمن میں پہلے دو ایک باتوں کا سمجھ لینا ضروری ہے۔

(۱) مقتولینِ فی سبیل اللہ کے جو خصوصی مراتب ہیں وہ انہی تک محدود نہیں جو جنگ میں جان دیدیں۔

وہ اُن سب کے لئے ہیں جو اللہ کی راہ میں جان دینے کے لئے تیار ہوں۔ مثلاً رسول اللہؐ اور حضورؐ کے صحابہؓ ان تمام لڑائیوں میں شریک ہوئے جو فی سبیل اللہ لڑی گئیں۔ ان میں سے بعض صحابہؓ میدانِ جنگ میں مقتول ہو گئے۔ خود حضورؐ اور بہت سے صحابہؓ اس طرح مقتول نہ ہوئے بلکہ زندہ رہے۔ اگر ان خصوصی مراتب کو مقتولین تک محدود سمجھ لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ دیگر مجاہدین (جو میدانِ جنگ میں مقتول نہیں ہوئے اور خود رسول اللہؐ) ان مراتب سے محروم رہ گئے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ محض اتفاقی امر تھا کہ ان مجاہدین میں سے بعض میدان جنگ میں مقتول ہو گئے اور باقی زندہ واپس آ گئے۔ قرآنِ کریم نے اس کی تصریح کر دی ہے کہ ان مراتب میں یہ سب شریک ہیں۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے۔ وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ۔ (۳/۱۵۶) "اور اگر تم اللہ کی راہ میں قتل کئے جاؤ یا مر جاؤ تو تم اللہ کی مغفرت اور رحمت کے مستحق ہو گے۔ اور یہ متاعِ عظیم ہر اس چیز سے بہتر ہے جسے لوگ جمع کرتے ہیں۔ اس سے واضح ہے کہ خدا کی راہ میں جان دے دینے کا تہیہ کرنے والے خواہ مقتول ہوں یا ویسے ہی فوت ہو جائیں ان کے مراتب یکساں ہوں گے۔ دوسری جگہ ہے۔ وَمَن يُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيُقْتَلْ أَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا۔ (۴/۷۴) جو اللہ کی راہ میں جنگ کرے، تو اس کے بعد وہ قتل ہو جائے، یا دشمن پر غالب آ جائے تو ہم اسے بہت بڑا اجر دیں گے۔ اسی حقیقت کو سورۂ توبہ میں ان الفاظ میں دہرایا گیا ہے۔ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ۔ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ۔ (۹/۱۱۱) وہ (مومنین) اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں۔ وہ دشمنوں کو قتل بھی کرتے ہیں اور قتل ہو بھی جاتے ہیں۔

(ب) یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ مقتولین فی سبیل اللہ پر طبعی موت (PHYSICAL DEATH) وارد ہی نہیں ہوتی۔ طبعی موت ہر ذی حیات کے لئے ہے۔ كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ۔ (۳/۱۸۴) ہر ذی حیات کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ یہ خدا کا کلی قانون ہے۔ حتیٰ کہ خود نبی اکرمؐ کے متعلق ارشاد ہے کہ إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُم مَّيِّتُونَ۔ (۳۹/۳۰) تو بھی مرنے والا ہے اور یہ لوگ بھی مرنے والے ہیں۔

(ج) یہ بھی صحیح نہیں کہ موت کے بعد کی زندگی صرف مقتولین فی سبیل اللہ کے لئے ہے، اوروں کے لئے نہیں۔ موت کے بعد زندگی ہر ایک کے لئے ہے۔ یہ حقیقت ہمارے ایمان کا جزو ہے۔ مومن اور کافر ہر ایک کو مرنے کے بعد زندہ ہونا ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے۔ كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَكُنتُمْ

اَمۡوَاتًا فَاَحۡیَاکُمۡ ثُمَّ یُمِیۡتُکُمۡ ثُمَّ یُحۡیِیۡکُمۡ ۔ (۲/۲۸) تم خدا کا کس طرح انکار کر سکتے ہو۔ تم مُردہ تھے اس نے تمہیں زندگی عطا کی۔ پھر وہ تم پر موت طاری کرے گا اور پھر تم زندہ ہو گے۔
مقتولین فی سبیل اللہ کے زندہ ہونے کا خصوصیت سے ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ منافقین کا اعتراض یہ تھا کہ اگر یہ لوگ جنگ میں نہ جاتے تو موت سے بچ جاتے۔ اَلَّذِیۡنَ قَالُوۡا لِاِخۡوَانِهِمۡ وَقَعَدُوۡا لَوۡ اَطَاعُوۡنَا مَا قُتِلُوۡا ؕ ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ یہ خود میدانِ جنگ میں نہیں گئے، گھروں میں بیٹھے رہے اور ان کے بھائی بند (مجاہدین) جو میدان میں گئے ان کے متعلق کہتے ہیں کہ اگر وہ ہمارا کہنا مانتے (اور جنگ میں نہ جاتے) تو قتل نہ ہوتے۔" اس کے جواب میں ان سے کہا گیا کہ اوّل تو یہ بتاؤ کہ کیا تم ہمیشہ زندہ رہو گے؟ قُلۡ فَادۡرَءُوۡا عَنۡ اَنۡفُسِکُمُ الۡمَوۡتَ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ۔ (۳/۱۶۷) اگر تم اس بات میں سچے ہو تو اپنے آپ سے موت کو ہٹا کر بتاؤ۔ اور دوسرے یہ کہ جو لوگ حق و صداقت کی راہ میں جان دیتے ہیں انہیں مُردہ مت سمجھو۔ مردہ تو تم ہو جو ذلّت کی زندگی جی رہے ہو۔ حیات' مرگِ باشرف کا نام ہے اور مرگ، حیاتِ بے شرف کا نام۔ زندہ ہونے کو تو، مرنے کے بعد مومن و کافر دونوں زندہ ہوتے ہیں لیکن ایک زندگی اہلِ جہنّم کی ہے جس کے متعلق فرمایا کہ لَا یَمُوۡتُ فِیۡهَا وَلَا یَحۡیٰی ۔ (۲۰/۷۴) وہ اس میں نہ مرے گا نہ جئے گا۔ اور ایک زندگی اہلِ جنّت کی ہے جس کی کیفیت یہ ہوگی۔ یَسۡتَبۡشِرُوۡنَ بِنِعۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضۡلٍ ۙ۔ (۳/۱۷۰) جو نعماء انہیں خدا کے فضل سے ملتی ہیں وہ ان سے بہت خوش ہوتے ہیں۔
بہرحال یہ واضح ہے کہ مقتولینِ فی سبیل اللہ کی وہ زندگی یہاں کی طبعی زندگی جیسی نہیں۔ اس لئے کہ انسان کی طبعی زندگی کے متعلق ہم سب کچھ سمجھتے ہیں لیکن ان کی اُس دنیا کی زندگی کے متعلق فرمایا۔ وَلٰکِنۡ لَّا تَشۡعُرُوۡنَ ۔ (۲/۱۵۴) اس کی کنہ و حقیقت تمہارے عقل و شعور میں نہیں آسکتی۔ دوسرے یہ کہ ان کا اس دُنیا سے کچھ تعلق نہیں رہتا۔ جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کوئی کتنا ہی مقربِ بارگاہِ خداوندی کیوں نہ ہو وہ اس دنیا سے چلے جانے کے بعد نہ ہماری پکار کو سُن سکتا ہے اور نہ اس کا جواب دے سکتا ہے۔ اس میں مقتولینِ فی سبیل اللہ کی بھی کوئی استثناء نہیں۔ (قرآن نے ایسی استثناء نہیں کی) اگر ان کی زندگی اور دوسرے مرنے والوں کی زندگی میں کوئی فرق ہے تو وہ فرق خدا کے ہاں ہے۔ اسی لئے فرمایا کہ بَلۡ اَحۡیَآءٌ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ۔ (۳/۱۶۸) وہ اپنے ربّ کے حضور زندہ ہیں۔ وہیں سے انہیں سامانِ نشوونما

ملتا ہے۔ وہ اس احساس سے خوش ہوتے ہیں کہ ان کی اس عظیم قربانی سے پیچھے رہ جانے والے مومنین کے لئے ایسا معاشرہ قائم ہو گیا جس میں انہیں کوئی خوف اور حزن نہیں۔ (۳/۱۶۹)۔ اس سے زیادہ ان کا ہمارے سامنے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

اولیاءؒ اللہ کی کرامات

اب رہا یہ آخری سوال کہ "اولیاء اللہ" سے کرامات سرزد ہوتی ہیں۔ تو سب سے پہلے یہ بات سمجھ لینی چاہیئے کہ جس قسم کی کرامات ہم اپنے ہاں کے اولیاء اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں، غیر مسلم اسی قسم کی (بلکہ بعض صورتوں میں اُن سے بھی زیادہ محیّر العقول) کرامات اپنے ہاں کے بزرگوں کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اور جس طرح ہمارے ہاں لوگ کہتے ہیں کہ انہوں نے ان کرامات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اسی طرح ایکے ہاں لوگ بھی اس کی شہادت دیتے ہیں۔ اس لئے کسی سے کسی محیّر العقول بات کا سرزد ہونا، اس کے مقرب بارگاہِ خداوندی ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ انسان کے اندر بہت سی ایسی طبیعی قوتیں مضمر ہیں جن کی اگر مناسب طریق سے نشو ونما (DEVELOPMENT) کر لی جائے تو اس سے ایسی باتیں سرزد ہو سکتی ہیں جو دوسروں کے نزدیک محیّر العقول ہوں۔ امریکہ کے ہسپتالوں میں اب روزمرّہ ایسے آپریشن کئے جاتے ہیں، (بالخصوص بچّوں کے) جن میں مریض کو بے ہوش نہیں کیا جاتا ——— لیکن انہیں درد کا احساس مطلق نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر اپنی قوّتِ خیال (ہپناٹزم) سے مریض پر ایسا اثر انداز ہوتا ہے کہ اسے درد کا احساس ہی نہیں ہونے پاتا۔ اس کی اب وہاں باقاعدہ ٹریننگ دی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں اگر کوئی شخص دوسرے کی طرف دیکھ کر یا ایک پھونک مار کر اس کا دردِ سر دور کر دے تو اس کی پرستش ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ لیکن وہاں نہ ان ڈاکٹروں کی کوئی پرستش کرتا ہے نہ خود انہیں کسی "روحانیت" کا دعویٰ ہوتا ہے۔ وہاں یہ چیز سائنس بن چکی ہے۔ لیکن یہاں ابھی تک "باطنی علم" کا راز ہے۔

معجزہ صرف قرآن ہے

یاد رکھیئے اسلام میں معجزہ صرف خدا کی کتاب ہے۔ جب مخالفین نبی اکرمؐ سے معجزات طلب کرتے تو ان کی توجہ بھی اسی معجزہ کی طرف مبذول کرائی جاتی تھی۔ سورۂ عنکبوت میں ہے۔ وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس رسول پر اس کے ربّ کی طرف سے (محسوس) نشانات (معجزات) کیوں نہیں اتارے

گئے۔ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ان سے کہو کہ معجزات خدا کے ہاں ہیں۔ یہ ساری کائنات اس کی خلاقیت کا معجزہ ہے۔ یہاں کا ذرہ ذرہ معجزہ ہے۔ سارے انسان مل کر بھی چاہیں تو گھاس کی ایک پتی پیدا نہیں کر سکتے۔ باقی رہا میں، تو "اِنَّمَا اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ"۔ میرا منصب صرف یہ ہے کہ میں تمہیں زندگی کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کردوں۔ یہ چیز میں اس کتاب کے ذریعہ کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی گئی ہے۔ یہ کتاب سب سے بڑا معجزہ ہے۔ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ۔۔ کیا ان کے لئے یہ کافی نہیں کہ ہم نے تجھ پر یہ کتاب نازل کی ہے جو ان کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۔۔ (۲۹/۵۰-۵۱) اس کتاب میں ان لوگوں کے لئے جو اس کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں، خدا کی رحمت اور (انسانی مقصدِ زندگی کی) یاددہانی ہے۔ خدا کی یہ کتاب ایک زندۂ جاوید معجزہ ہے۔ یہ آج بھی اسی طرح معجزہ ہے جس طرح نبی اکرمؐ کے زمانہ میں معجزہ تھی۔ اس پر عمل پیرا ہونے سے ایسے نتائج مرتب ہوتے ہیں جو اقوامِ عالم کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیں۔ اس میں جو نظامِ حیات پیش کیا گیا ہے، ساری دنیا کے انسان مل کر بھی اس جیسا نظام مرتب نہیں کر سکتے۔۔ جب تک یہ اُمت اس قرآن پر عمل پیرا رہی اس سے قدم قدم پر "معجزات" سرزد ہوتے رہے۔ جب اس کے ہاتھ سے اس کا دامن چھوٹ گیا، یہ کرامات کی تلاش میں ماری ماری پھرنے لگی۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا
ہے بندۂ آزاد خود اِک زندہ کرامات!

قرآن نے مومنین کی جماعت (اُمتِ مسلمہ) پیدا کی تھی جس میں اولیاء اللہ کا الگ گروہ کوئی نہیں تھا۔ اس جماعت کا ہر فرد ولی تھا۔ ان اولیاء اللہ کی جماعت (مومنین) کا منصب دنیا میں نظامِ خداوندی کا قیام تھا۔ اسے انہوں نے عملاً متشکل کر کے دکھا دیا اور اس کے نتائج سے اس نظام کے بے مثل و بے نظیر ہونے کی شہادت بہم پہنچا دی۔ یہی ان کی کرامت تھی۔ جب وہ نظام باقی نہ رہا تو مختلف تصورات، مختلف گوشوں سے اسلام میں داخل ہونا شروع ہو گئے۔ ان میں ایک اہم تصور، تصوّف کا تھا جو علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں ۔۔۔ "اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا ہے"[۱] ۔۔۔ اولیاء اللہ کا وہ تصور جو آج کل

تصوّف

---

(۱) تصوف کے متعلق تفصیلی مباحث میری کتاب "سلیم کے نام خطوط" میں ملیں گے۔ نیز میری کتاب "تصوف کی حقیقت" دیکھئے

ہمارے ہاں مروج ہے، اسی تصوف کا پیدا کردہ ہے۔ عیسائی خانقاہوں میں (SAINTS) تھے۔ انہی کا مثنیٰ اہم نے اپنے ہاں بنایا اور انہیں اولیاء اللہ کہنے لگ گئے۔ ان اولیاء اللہ کی خصوصیات وہ نہیں جو قرآن نے جماعتِ مومنین کی بتائی ہیں۔ ان کی خصوصیات عیسائی خانقاہوں کے (SAINTS) کی سی ہیں —— وہی ترکِ دُنیا و ترکِ لذات کا بنیادی عقیدہ —— مادی کائنات سے نفرت اور زندگی کا منتہیٰ "روحانیت" —— وہی رسوم و مناسکِ خانقاہیت —— چلّے —— ریاضتیں —— فاقہ کشیاں —— وہی کشف و الہام کا عقیدہ —— جس کی اسلام میں ختمِ نبوت کے بعد کہیں گنجائش نہ تھی۔ وہی ان کی کرامات، وہی مرنے کے بعد، ان کی قبروں کا مرجعِ انام بننا اور ان سے مرادیں مانگنا۔ غرضیکہ وہاں کی ایک ایک چیز ہمارے ہاں آئی اور رفتہ رفتہ عین اسلام بلکہ "مغزِ دین" بن گئی۔ اسلام ایسی اُمّت پیدا کرنے کے لئے آیا تھا جو دنیا میں نظامِ عدل و احسان قائم کرے،

خانقاہیت کا ضابطۂ اخلاق

جو دیکھے کہ دنیا میں کہیں کسی پر ظلم اور زیادتی نہیں ہو رہی۔ جہاں ظلم ہو رہا ہو وہ ظالم کی کلائی مروڑ کر اُسے انصاف کی بارگاہ کے سامنے جھکا دے۔ لیکن اس تصور پر خانقاہیت نے ایک نیا ضابطۂ اخلاق (CODE OF ETHICS) دیا جس میں قوت کا استعمال حرام اور عدل کا تصور گناہ قرار پا گیا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ قوم پر چاروں طرف سے بے کسی و بے بسی، ناتوانی و بے چارگی، افسردگی و پژمردگی کے بادل چھا گئے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

مسکینی و محکومی و نومیدیٔ جاوید!
جس کا یہ تصوف ہو وہ اسلام کر ایجاد

یہ وہ اسلام نہیں جسے خدا نے اپنے بندوں کے لئے بطورِ نظامِ حیات (دین) تجویز کیا تھا اور جسے محمدؐ رسول اللہ والذینؓ معہٗ کے مقدس ہاتھوں نے عملاً متشکل کر کے دکھا دیا تھا۔ اس اسلام میں پوری کی پوری جماعتِ مومنین، خدا کی سپاہ اور اولیاء اللہ تھی۔ اور وہ وسیع و عریض مملکت جس میں خدا کے قوانین عملاً نافذ تھے، ان کی کرامت تھی۔ اس میں اولیاء اللہ قبروں کے سرہانے بیٹھے دکھائی نہیں دیتے تھے، جنگ کے میدانوں میں کفن بہ دوش اور شمشیر بکف نظر آتے تھے یا تمدن و معاشرت کی بساط پر انسانیت کے اُلجھے ہوئے مسائل سلجھانے میں منہمک۔

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل؛ یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات

وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست

یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات!

اس میں تمام مومنین اولیاء اللہ تھے اور یہی اولیاء اللہ کا قرآنی مفہوم ہے۔ یعنی:

خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ۔ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ۔ (۳/۱۰۹)

بہترین اُمّت جسے نوعِ انسان کی بھلائی کے لئے پیدا کیا گیا ہے، معروف کا حکم دینے والی اور منکر سے روکنے والی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قیامت موجود

دین اور مذہب کی کشمکش

(طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۶۳ء ــــ منعقدہ لاہور ــــ سے خطاب)

عزیزانِ من! علامہ اقبالؒ نے کہا ہے کہ

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز — چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

سوال یہ ہے کہ چراغِ مصطفویؐ کیا ہے جس کے ساتھ، ازل سے تا امروز، شرارِ بولہبی ستیزہ کار چلا آرہا ہے۔ یہ کون سی کشمکش ہے جس کا سلسلہ دراز، نوعِ انسان کی پوری تاریخ کو محیط ہے۔ اس تماشہ گاہ میں ہزاروں قومیں آئیں اور چلی گئیں۔ سینکڑوں نظام اُبھرے اور بیٹھ گئے۔ متعدد تہذیبوں کے چراغ جلے اور بجھ گئے، لیکن وہ کونسے ایسے حریفانِ ازلی ہیں جن کی باہمی آویزش پر ان تمام تغیرات کا کوئی اثر نہ ہوا اور ان کی ستیزہ کاری کا سلسلہ ہر دور اور ہر مقام میں بہ دستور جاری رہا اور اب تک جاری ہے۔ آپ انسانی تاریخ پر جس قدر بھی غور کریں گے ایک ہی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ وہ کشمکشِ پیہم ـــ وہ ستیزِ مسلسل ــــ وہ آویزشِ متواتر۔ـ

دین اور مذہب کی جنگ

ہے۔ جس دن سے شعورِ انسانی نے آنکھ کھولی، اس جنگ کا سلسلہ شروع ہوا اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ملوکیت، سرمایہ داری وغیرہ بھی انسانیت کے کم دشمن نہیں۔ لیکن اگر آپ ذرا بہ نظرِ تعمق دیکھیں گے تو یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ یہ اور اس قسم کے دیگر مستبدانہ تصورات اور نظام، مذہب ہی کے

سہارے قائم رہے ہیں اور جب دینؔ نے مذہب کو مٹایا تو اس کے ساتھ یہ خود بخود مٹ گئے۔ اس لئے اصل کشمکش دینؔ اور مذہب ہی کی ہے۔

مذہب کی چیرہ دستیاں

مذہب کا تصوّر، مفاد پرست انسانوں کے ذہن کا تراشیدہ ہے جن کا مقصد یہ تھا کہ وہ دوسرے انسانوں کی کمائی پر عیش کی زندگی بسر کریں۔ اور یہ کچھ اس انداز سے کریں کہ یہ انہیں لوٹیں اور وہ انہیں دعائیں دیں۔ یہ انہیں دھتکاریں اور وہ ان کے پاؤں پڑیں۔ یہ انہیں بلاجرم و قصور گالیاں دیں اور وہ گڑگڑا کر معافیاں مانگیں۔ یہ بھری محفل میں انہیں بے عزت کریں لیکن وہ اپنے کمرے کی تنہائیوں میں اپنے دل کے اندر بھی ان کی شان میں گستاخی کا خیال تک نہ لاسکیں۔ یہ ان سے ہر قسم کی خدمت اور بیگار لینا اپنا حق سمجھیں اور وہ ان کے ہر حکم کی تعمیل، اپنی زندگی کا مقدّس ترین فریضہ قرار دیں۔ ان کے ادنیٰ سے اشارے پر اپنے سینے میں خنجر گھونپ لیں، اپنے بچّوں کے گلے پر چھری پھیر دیں، آگ میں کُود پڑیں۔ پہاڑ کی چوٹی سے سر کے بل نیچے آگریں، تختۂ دار پر ہنسی خوشی چڑھ جائیں، ان کی رتھوں کے آہنی پہیّوں کے نیچے آکے کچلے جائیں۔ یہ اپنے جس حریف کے خلاف چاہیں انہیں کھڑا کردیں۔ اور وہ اتنا جانے اور پوچھے بغیر کہ ہمیں ان کے خلاف کیوں لڑایا جارہا ہے، ان کی جانیں لینے اور اپنی جانیں دیتے جائیں۔ وہ خود بھوکے رہیں اور ان کے خادموں کو نعمتیں کھلائیں۔ اپنے بچّوں کو فاقے سے رکھیں اور ان کے کُتّوں کو دودھ پلائیں۔ خود ننگے رہیں اور ان کے پتھّروں کو حریر و اطلس کے لبادے پہنائیں۔ آپ خس و خاشاک کی جھونپڑیوں میں زندگی کے دن کاٹیں اور ان کی ہڈیوں کی راکھ تک پر سنگِ مرمر کی فلک بوس عمارات استوار کریں۔ زندگی میں تو ایک طرف، ان کی موت کے بعد بھی ان کے دل پر ان کا خوف اس طرح طاری رہے کہ وہ ان کے تصوّر سے ڈرتے، کانپتے، لرزتے، سہمے رہیں۔ غرضیکہ یہ ہر وقت ان بے چاروں کے اعصاب پر چھلاوے کی طرح سوار اور ان کے ذہن پر بھوت بن کر چھائے رہیں اور وہ ان کے پنجہ کی آہنی گرفت سے کبھی نکلنے نہ پائیں۔

یہ ہیں اس مذہب کے چند گوشے جسے مفاد پرست انسانوں کی عقلِ فریب کار نے تراشا اور جسے کمزوروں اور ناتوانوں کا خون چوسنے کے لئے ایک مؤثّر ترین حربہ کے طور پر استعمال کیا گیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ملوکیت اور سرمایہ داری کا استبداد بھی کچھ کم استخواں شکن اور خون آشام واقع نہیں ہوا۔ لیکن انہیں اپنے غلبہ و تسلّط کی زنجیریں مستحکم رکھنے کے لئے سینکڑوں قسم کی قوّتیں فراہم اور ہزار قسم

کے حربے استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ اور پھر بھی انہیں ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کب شکار اُن کے جال سے نکل جائے۔ لیکن مذہبی دسیسہ کاریوں کا تو یہ عالم ہے کہ اس میں —— صید خود صیاد را گوید بگیر —— اس میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اگر کوئی ان غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کی کوشش کرے تو

مذہب کی گرفت

یہ غلام آگے بڑھ کر اس کا گلا گھونٹ دیں۔ اور اگر کسی وقت کوئی زنجیر اتفاقاً ٹوٹ جائے تو یہ اس کے ٹوٹے ہوئے حلقوں کو اپنی مژگانِ عقیدت سے اٹھا کر چومیں اور بصد عقیدت اپنے گلے میں ڈال لیں۔

مذہب نے اپنی تمام جہد بازیوں اور سحر انگیزیوں کے لئے صرف ایک بنیادی حربہ استعمال کیا اور وہ یہ کہ اس نے جو کچھ کرنا چاہا اسے خدا کی طرف منسوب کر دیا۔ اس کی ساری گرفت کا راز اسی میں ہے۔ اس کے لئے اس نے پیش بندی یہ کی کہ لوگوں کو سوچنے سمجھنے سے دُور رکھا جائے اور عقل و فکر کے قریب نہ آنے دیا جائے۔ کوئی جتنی زیادہ جہالت آمیز باتیں کرے اُسے اتنا ہی زیادہ خدا کا مقرب سمجھا جائے۔

لوگوں کو جاہل رکھا جائے

جو جس قدر زیادہ بعید از علم و عقل باتوں پر یقین ظاہر کرے، اسے اتنا ہی زیادہ پختہ ایمان والا قرار دیا جائے۔ اربابِ مذہب کی ٹیکنیک ہی یہ ہوتی ہے کہ اپنے معتقدین کو جہالت کے گڑھے سے باہر نہ نکلنے دیا جائے۔ توہّم پرستیوں پر ایمان کا مدار اور عجوبہ پسندیوں کو صداقت کا شعار قرار دیا جائے۔ ان کی طرف سے پیش کردہ عقائد پر ایمان لایا جائے تو بلا علم و دلیل اور ان کے احکام کی تعمیل کی جائے تو یہ پوچھے بغیر کہ اس سے 'بالآخر' مقصد کیا ہے؟ مذہب کی طرف سے جو کچھ پیش کیا جاتا ہے اس کے حق میں اس کے پاس ایک ہی دلیل اور ایک ہی سند ہوتی ہے اور وہ یہ کہ ایسا کچھ پہلے سے ہوتا چلا آرہا ہے۔ ہمارے اسلاف کا یہی مسلک تھا۔ اگر کوئی شخص مذہب کے پیش کردہ کسی عقیدہ یا مسلک پر اعتراض کرے تو عوام کو یہ کہہ کر بھڑکا دیا جائے کہ یہ شخص تمہارے اسلاف کی توہین کرتا ہے —— اور عوام کے جذبات کو بھڑکا کر جس قدر فتنہ و فساد برپا کیا جا سکتا ہے، مذہب کی تاریخِ خونچکاں کا ایک ایک ورق اس پر شاہد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دُنیا میں جس قدر خون ریزیاں اور فساد انگیزیاں مذہب کے مقدّس نام پر ہوئی ہیں، ہلاکو اور چنگیز کے حصّہ میں ان کا عشرِ عشیر بھی نہیں آیا ہو گا۔ یہی وہ حربہ ہے جس سے اربابِ مذہب اپنے مخالفین کو اس طرح ڈرا دھمکا کر رکھتے ہیں کہ وہ ان کے خلاف ایک لفظ تک کہنے کی جرأت نہیں

کرسکتے۔ مذہب کا سارا مدار عوام کے جذبات پر ہے۔ اس کے لئے وہ اس قسم کے مواقع پیدا اور ایسی تقریبات وضع کرتے رہتے ہیں جن سے عوام کے جذبات میں شدت پیدا ہوتی رہے اور ان کی یہ آگ بجھنے نہ پائے۔

یہ ہے برادرانِ عزیز! اس مذہب کا اجمالی سا تعارف، جو پہلے دن سے آج تک انسانیت کی گردن میں پھانسی کا پھندا بن کر پڑا ہے۔ اور جس نے نوعِ انسان کی نس نس کو اس طرح اپنی گرفت میں لے رکھا ہے کہ وہ اس کی مرضی کے خلاف ذرا سی حرکت بھی نہیں کرسکتی۔

اور یہی ہے عزیزانِ من! اس کی وہ آہنی گرفت جس سے نوعِ انسان کو چھڑانے کے لئے خدا کی طرف سے دین آتا رہا۔ دینِ خداوندی کے پیامبر، حضرات انبیاء کرام تھے جو مذہب کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے انسانوں کو آزادی کی دعوت دیتے تھے۔

خدا کا دین

وہ انسانوں کو اس چنگل سے آزاد ہونے کی دعوت دیتے تھے اور اربابِ مذہب اپنی پوری قوتوں کو مجتمع کرکے، ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ اس محاذ میں اربابِ اقتدار، ان کے پشت پناہ اور سرمایہ دار طبقہ ان کا حامی ہوتا تھا۔ اس لئے کہ خدا کا دین ان کے حق میں بھی توموت کا پیغام تھا۔ وہ دین کو مغلوب اور مذہب کو غالب رکھنے کی انتہائی کوشش کرتے تھے، کیونکہ مذہب کے غلبہ میں خود ان کی ہستی کا راز مضمر تھا۔ دین اور مذہب کی یہی وہ کش مکش ہے جو پہلے دن سے آج تک دنیا کے ہر ملک، ہر قوم اور ہر زمانے میں مسلسل اور پیہم چلی آرہی ہے اور اسی کو علامہ اقبالؒ، چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی کی ستیزہ کاری سے تعبیر کرتے ہیں اور اسے انسانیت کے لئے بدترین لعنت اور خدا کا عذاب قرار دیتے ہیں۔ وہ جاوید نامہ میں لکھتے ہیں ؎

چار مرگ اندر پئے، ایں دیر میر — سود خوار و والی و ملا و پیر

یعنی مذہب کا شجرۃ الزقوم۔ اور اس کی پروردہ شاخیں، ملوکیت اور سرمایہ داری

دین اور مذہب کی کش مکش

قرآنِ کریم، دین اور مذہب کی اس کش مکش کے متنوع گوشوں کو بار بار سامنے لاکر اس کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔
وہ اس کش مکش کی ابتدا حضرت نوحؑ کی اس انقلابی دعوت سے کرتا ہے جس کی رو سے انہوں نے مذہب کی غیر خدائی قوتوں کی محکومیت میں جکڑی ہوئی قوم سے کہا کہ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ

مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ (۲۳/۲۳) اے میری قوم کے لوگو! تم مذہب کے ان اجارہ داروں کی اطاعت اور محکومیّت کی زنجیروں کو توڑ دو اور صرف ایک خدا کے قوانین کی اطاعت کرو۔ یاد رکھو! اس کے سوا کوئی ہستی ایسی نہیں جس کی اطاعت اختیار کی جائے۔ اس آزادی کی آواز کے خلاف، اربابِ مذہب اور ان کے پشت پناہ اہلِ اقتدار ــــــ یعنی مترفین طبقہ کے لوگ جو دوسروں کی کمائی پر عیش کرتے تھے، یورش کر کے آگے بڑھے۔ انہوں نے عوام کو اکٹھا کیا اور ان سے کہا کہ مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ۚ (۲۳/۲۴) جو کچھ یہ شخص کہتا ہے وہ تمہارے آباؤ اجداد کے مسلک کے خلاف ہے۔ یہ تمہیں، تمہارے بزرگوں کی روش سے برگشتہ کرنا چاہتا ہے۔ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ (۲۳/۲۵) یہ پاگل ہے اس کی کوئی بات نہ سنو۔

اس کے بعد قرآنِ کریم نے سلسلۂ انبیاءِ کرام ؑ کی ایک ایک کڑی کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کی دعوت یہی تھی کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسان کو اپنا محکوم اور اطاعت گزار بنائے۔ اطاعت صرف قوانینِ خداوندی کی کی جا سکتی ہے جنہیں وہ (بذریعہ وحی) اپنی کتاب میں دیتا ہے۔ وہ یہ دعوت دیتے رہے اور ان کے خلاف ہر زمانہ میں اور ہر مقام پر مذہبی پیشوائیت اور اربابِ ثروت و اقتدار متحدہ محاذ بنا کر کھڑے ہوتے رہے۔ ان کے پاس عوام کے جذبات کو مشتعل کرنے کے لئے ایک ہی سلوگن تھا۔ اور وہ یہ کہ مَا هٰذَآ اِلَّا رَجُلٌ يُّرِيْدُ اَنْ يَّصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُكُمْ ۚ (۳۴/۴۳)۔ یہ شخص چاہتا ہے کہ تمہیں، تمہارے اسلاف کے مذہب سے برگشتہ کر دے۔ اس لئے اٹھو اسے پکڑ لو۔

اسے زندہ جلا دو اور اس طرح اپنے خداؤں کا بول بالا کر دو۔ (۲۹/۲۴ - ۲۱/۶۸)

حضرت عیسیٰ ؑ کی انقلابی آواز

اناجیل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ ؑ کے زمانے میں مذہبی پیشوائیت کا **اقتدار** انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ بنی اسرائیل کے احبار و رہبان نے ایک متوازی حکومت قائم کر رکھی تھی جس میں انہیں ہر قسم کے اختیارات حاصل تھے۔ صرف سزائے موت کے لئے انہیں رومی حکام سے توثیق کرانی پڑتی تھی۔ حضرت عیسیٰ ؑ کی دعوت، مظلوم اور مقہور انسانیّت کو ان کے اِس پنجۂ استبداد سے چھڑانے کے لئے تھی۔ یروشلم کا ہیکل، ان مذہبی پیشواؤں کا مرکز تھا۔ داعیٔ انقلابِ آسمانی، حضرت عیسیٰ ؑ اسی ہیکل کی

سیڑھیوں پر کھڑے ہو جاتے اور انہیں للکار کر کہتے کہ

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ آسمان کی بادشاہت لوگوں پر بند کرتے ہو۔ کیونکہ نہ تو آپ داخل ہوتے ہو اور نہ ہی داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ ایک مرید کرنے کے لئے خشکی اور تری کا دورہ کرتے ہو اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے تو اسے اپنے سے دونا جہنّم کا فرزند بنا دیتے ہو۔

اے ریا فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مُردوں کی ہڈیوں اور ہر قسم کی نجاست سے بھری ہوئی ہیں۔ اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راستباز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہوئے ہو۔

اے سانپو! اے افعی کے بچّو! تم جہنّم کی سزا سے کیونکر بچو گے۔

(انجیل متی، باب ۲۳)

ظاہر ہے کہ مذہبی اجارہ دار، جو اپنی خدائی مسندیں بچھا کر عوام کو لوٹتے اور ان پر حکومت کرتے تھے، اس انقلابی دعوت کو کس طرح برداشت کر سکتے تھے۔ وہ اسے اپنی مفاد پرستیوں کے لئے کس طرح موت کا پیغام سمجھتے تھے اس کا اندازہ ان کی اس چیخ و پکار سے لگ سکتا ہے جسے انجیل برنباس میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ

مخالفت کیوں؟

تب ان لوگوں نے کاہنوں کے سردار کے ساتھ مشورہ کیا اور کہا کہ اگر یہ آدمی بادشاہ ہو گیا تو ہم کیا کریں گے..... اس جیسے آدمی کی حکومت کے ماتحت ہمارا کیا انجام ہو گا۔ یقیناً ہم اور ہماری اولاد سب تباہ ہو جائیں گے اس لئے کہ ہم اپنی خدمت سے نکال دیئے جائیں گے تو ہم مجبور ہوں گے کہ اپنی روٹی عطیّہ کے طور پر مانگیں، حالانکہ اس وقت خدا کا شکر ہے کہ ہمارا بادشاہ اور حاکم دونوں ہماری شریعت سے اجنبی ہیں اور ہماری شریعت کی کچھ پروا نہیں کرتے، جیسے ہم ان کی شریعت کی کچھ پروا نہیں کرتے۔ اور اس سبب سے ہم قدرت رکھتے ہیں کہ ہم جو چاہیں کر لیں۔ اگر ہم نے غلطی کی تو ہمارا اللہ رحیم ہے اور قربانی اور روزے کے ساتھ اس کا راضی کر لینا ممکن ہے۔ لیکن اگر یہ

آدمی بادشاہ ہو گیا .... تو ہر گز راضی نہ کیا جا سکے گا جب تک خدا کی عبادت (اطاعت)

ویسے ہی ہونے نہ دیکھے جیسی موسیٰ ؑ نے لکھی ہے۔ (انجیل برنباس، ص ۱۴۲)

آپ نے غور فرمایا کہ اس آسمانی دعوت کی اس قدر شدید مخالفت کی وجہ کیا تھی؟ ــــ بس وہی ایک وجہ! یعنی اگر خدا کا قانون رائج ہو گیا تو ہم اپنی ان مسندوں سے الگ کر دیئے جائیں گے اور چونکہ ہمیں کوئی کام آتا نہیں جس سے ہم اپنی روٹی کما سکیں' اس لئے ہمیں اپنی روٹی عطیہ کے طور پر مانگنی پڑے گی۔ آپ نے دیکھا کہ جسے مذہبی سوال کہہ کر پیش کیا جاتا ہے' وہ درحقیقت یکسر معاشی مسئلہ ہوتا ہے۔

انجیل برنباس کے اس بیان سے آپ نے یہ بھی دیکھا ہو گا کہ مذہبی پیشوائیت ہمیشہ اس اندازِ حکومت کو پسند کرتی ہے جسے آج کل کی اصطلاح میں سیکولر کہتے ہیں' یعنی امورِ مملکت حکومت کے پاس رہیں اور امورِ شریعت (پرسنل لاز) مذہبی پیشوائیت کی تحویل میں دے دیئے جائیں۔ نہ مذہبی پیشوائیت، حکومت کے معاملات میں دخل دے اور نہ ہی حکومت ان کے حیطۂ اقتدار میں دخیل ہو۔

نبی اکرم ﷺ کی دعوت

اور آخر میں اس عظیم و جلیل داعیٔ انقلاب کی طرف آئیے جس پر سلسلۂ نبوّت کا خاتمہ ہو گیا (صلے اللہ علیہ وسلّم)۔ حضور ﷺ کے ظہورِ قدسی کا مقصد ہی یہ بتایا گیا ہے کہ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۷:۱۵۷) وہ نوعِ انسان کو ان زنجیروں سے آزاد کر دے گا جن میں وہ جکڑے چلی آ رہی ہے اور ان کے سر سے وہ بوجھ اتار دے گا جس کے نیچے وہ بُری طرح دبی اور کچلی ہوئی ہے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے حضور ﷺ نے بھی وہی دعوت پیش کی جو حضرت نوح ؑ سے حضرت عیسےٰ ؑ تک مسلسل و متواتر پیش ہوتی چلی آ رہی تھی اور مترفین کے طبقہ کی طرف سے اس کا جواب بھی وہی ملا جو شروع سے ملتا چلا آ رہا تھا' یعنی مَا سَمِعْنَا بِهَٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْآخِرَةِ ــــ جو بات یہ شخص کہتا ہے اسے ہم نے اسلاف کے مذہب میں کہیں نہیں سنا لہٰذا: إِنْ هَٰذَا إِلَّا اخْتِلَاقٌ (۳۸:۷) یہ غلط، جھوٹی اور بنائی ہوئی بات ہے' یعنی اس کے غلط ہونے کی دلیل یہ ہے کہ ہمارے اسلاف میں سے کسی نے یہ بات نہیں کہی۔ اس کے بعد اس طبقہ کی طرف سے جو کچھ نبی اکرم ﷺ اور حضور ﷺ کے رفقا کے ساتھ ہوا' اس پر قرآن شاہد اور تاریخ کے اوراق گواہ ہیں۔

نبی کے بعد کیا ہوتا تھا

اس مقام پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ جب حضرات انبیاء کرامؑ، خدا کا سچا دین انسانوں کو دے جاتے تھے تو اس کے بعد اس دین کے ساتھ کیا بیتتی تھی کہ بعد میں آنے والے نبی کے وقت، سابقہ نبی کے پیش کردہ دین کی آواز کہیں سے بھی سنائی نہیں دیتی تھی۔ اس نبی کی اولین مخاطب (بالعموم) وہی قوم ہوتی تھی جو اپنے آپ کو سابقہ نبی کی متبع کہتی تھی۔ پھر یہ کیا تھا کہ آنے والا نبی اس قوم کے مسلک کو باطل قرار دیتا تھا اور یہ قوم اس نبی کی دعوت کی اس قدر شدید مخالفت کرتی تھی۔

ہوتا یہ تھا کہ جب ایک نبی دینِ خداوندی دے کر چلا جاتا تو اس کے بعد اس قوم میں ایسے مفاد پرست لوگ پیدا ہو جاتے جو اس دین کو اپنے خیالات کی آمیزش سے مذہب میں تبدیل کر دیتے لیکن لوگوں سے کبھی یہ نہ کہتے کہ یہ ہمارے خیالات ہیں۔ وہ اسی مذہب کو خدا کی سچی تعلیم کہہ کر پیش کرتے۔ یَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ۔ وہ شریعت خود وضع کرتے اور کہتے کہ یہ خدا کی طرف سے ہے۔ ایسا کیوں کرتے۔ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا۔ (۲/۷۹) تاکہ اس سے کچھ پیسے کما لئے جائیں۔ چنانچہ اس طرح خدا کا دین مذہب میں تبدیل ہو جاتا۔

مذہب اور دین کا تقابل

یہ عجیب بات ہے کہ جب دینؔ، اس طرح مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو یہ نہیں ہوتا کہ اس میں کچھ جزوی تبدیلیاں پیدا ہو جائیں، یا مذہب دین کی پست سطح کا نام ہو۔ یہ دونوں بالکل ایک دوسرے کی ضد بن جاتے ہیں اور یکسر ایک دوسرے کے مدِمقابل کھڑے ہوتے ہیں۔ چنانچہ جن لوگوں نے مذہب اور دین کا تقابلی مطالعہ کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ

مذہب، خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق اور داخلی تجربہ کا نام ہے۔	دین اجتماعی نظامِ زندگی اور خارجی حقیقت ہے۔
مذہب میں ہر فرد اپنے طور پر مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس کا خدا کے ساتھ رشتہ قائم ہو گیا ہے۔	دین میں معاشرہ کا انداز اور آئین بتا سکتے ہیں کہ وہ قوانینِ خداوندی کے مطابق متشکل ہوا ہے یا نہیں؟

مذہب میں ہر فرد کا منتہیٰ اپنی اپنی نجات ہوتا ہے	دین کا مقصود عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود ہوتا ہے۔
مذہب میں کوئی خارجی معیار ایسا نہیں ہوتا، جس سے پرکھا جا سکے کہ انسان کے اعمال صحیح نتائج پیدا کر رہے ہیں یا نہیں؛	دین میں اجتماعی زندگی کے نتائج ساتھ کے ساتھ بتاتے چلے جاتے ہیں کہ ملت صحیح راستے پر چل رہی ہے یا نہیں؛
مذہب علم کا دشمن اور عقل کا حریف ہے۔	دین، انسان کی علمی اور عقلی صلاحیتوں کو جلا دینے کا موجب ہے۔
مذہب عقل کے دیئے گُل کرتا ہے کہ اُس کا چراغ جلے۔	دین، عقل کے دیئے میں روغن ڈالتا ہے کہ زندگی کے راستے جگمگائیں۔
مذہب اپنے آپ کو اندھی عقیدت کی بنا پر منواتا ہے۔	دین اپنے ہر دعویٰ کو دلیل اور برہان کے ساتھ پیش کرتا ہے۔
مذہب لوگوں کو روشنی سے، تاریکیوں کی طرف لے جاتا ہے۔ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ (۲/۲۵۷)	دین، انسان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (۲/۲۵۷)
مذہب کی تلقین یہ ہوتی ہے کہ تم بھیڑ بکریوں کی طرح سر جھکائے، آنکھیں بند کئے پامال راستوں پہ چلتے جاؤ۔	دین کا پیغام یہ ہوتا ہے کہ تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش براہِ دیگراں رفتن حرام است!
مذہب عوام کے جذبات کے پیچھے چلتا ہے اور ان کی تسکین کا سامان فراہم کئے چلا جاتا ہے،	دین انہیں حقائق کے پیچھے چلاتا ہے اور ان کے سطحی جذبات کی کچھ پروا نہیں کرتا۔
اس لئے مذہب ہر زمانے میں نئے نئے بُت تراشتا رہتا ہے تاکہ عوام کو بہلائے رکھے۔	دین تیشۂ ابراہیمیؑ سے ہر قدیم اور جدید بُت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔
مذہب کی تعلیم یہ ہے کہ زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز	دین کا پیغام یہ ہے کہ زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

مذہب انسان کے دل میں ہر وقت خوف پیدا کرتا رہتا ہے اور اپنی ہر بات ڈر سے منواتا ہے۔

دین، خوف کو شرک قرار دیتا ہے اور انسان کے دل کو جرأت اور بےباکی کا مسکن بناتا ہے۔

مذہب انسان کو ہر بڑی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہونا سکھاتا ہے۔

دین اسے دنیا کے ہر آستانے سے سرفرازانہ مستانہ وار گزر جانے کی تلقین کرتا ہے۔

مذہب کشمکشِ حیات سے فرار سکھاتا ہے۔

دین زندگی کے حقائق کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے۔

مذہب کی تعلیم یہ ہے کہ

بدریا در منافع بےشمار است !
دگر خواہی سلامت بر کنار است

دین کی پکار یہ ہے کہ

بدریا غلط و باموجش در آویز
حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

مذہب مادّی کائنات کو قابلِ نفرت قرار دے کر اسے تیاگ دینے کی تلقین کرتا ہے۔

دین مادّہ کی تسخیر سے، انسان کو حدود فراموش بلندیوں تک لے جاتا ہے۔

یعنی مذہب اس دنیا کو ترک کر دینے سے آخرت کی جنّت دلاتا ہے۔

اور دین اس دنیا کو سنوارنے سے یہاں بھی جنّت حاصل کرتا ہے اور وہاں بھی۔

مذہب تقدیر کے بہانے انسان کو یکسر بےعمل بنا دیتا ہے۔

دین اسے تقدیر شکن قوّت عطا کر کے حرکت و عمل کا شعلۂ جوّالہ بنا دیتا ہے۔

مذہب کمزوروں، ناتوانوں، مظلوموں کو یہ تعلیم دے کر مطمئن رکھتا ہے کہ یہاں سب کچھ خدا کی مرضی سے ہوتا ہے اور راضی برضا رہنا خدا کے مقرّب بندوں کی نشانی ہے۔ اس سے مستبد، ظالم اور غاصب قوتیں بےلگام چھوڑ دی جاتی ہیں کہ وہ جو جی میں آئے کریں

دین، ظلم و استبداد، سلب و نہب کے خلاف اعلانِ بغاوت ہے۔ وہ کمزور انسانوں سے کہتا ہے کہ وہ قوانینِ خداوندی کے اتباع سے ایسا نظام قائم کریں جس میں ہر ظالم اور مستبد حق اور انصاف کے سامنے جھکنے پر مجبور ہو جائے۔

مذہب خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات کا نام عبادت رکھ کر انسانوں کو خود فریبی میں مبتلا رکھتا ہے۔

دین، اسے وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل کا پیغام دیتا اور نظامِ خداوندی کو دنیا کے ہر نظامِ باطل پر غالب کرنے کو عبادت کی غایت بتاتا ہے۔

مذہب ہر خوشی میں غم کا پہلو دیکھتا ہے اور انسان میں ایسی مایوسانہ ذہنیت پیدا کر دیتا ہے جس میں ان کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ

آئے مجھے ہنسی بھی تو میں رو دیا کروں

دین ہر غم کو خوشی کا پیش خیمہ سمجھتا ہے اور انسان کی نگاہ میں ایسی تبدیلی پیدا کرتا ہے کہ وہ نامساعد حالات کی انتہائی تاریکیوں میں بھی روشنی کی کرن دیکھتا ہے اور بے ساختہ پکار اٹھتا ہے کہ ؎

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے

مذہب، کائنات کی ہر حسین شے پر منہ لبسورنا اور تیوریاں چڑھانا سکھاتا ہے۔

دین اعلان کرتا ہے کہ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ - (۷/۳۲) وہ کون ہے جو زیب و زینت کی ان چیزوں کو حرام قرار دے سکتا ہے جنہیں اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے۔

مذہب، موت کی سسکیاں ہیں۔

دین، زندگی کے قہقہے۔

مذہب، ایک خوابِ پریشاں ہے۔

دین، زندہ حقیقت۔

مذہب ہر جدّت (نئی چیز) کو گناہ قرار دیتا ہے۔

دین کہتا ہے کہ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ - (۵۵/۲۹) زندگی کے تقاضے ہر دور میں بدلتے رہتے ہیں۔ اس لئے جدّت طرازی عین تقاضائے حیات ہے۔

مذہب انسانی بستیوں کو قبرستانوں میں تبدیل کر دیتا ہے۔

دین، قبرستانوں میں صورِ اسرافیل پھونک کر مُردوں کو حیاتِ تازہ عطا کرتا ہے۔

مذہب، انسانیت کی موت ہے۔

دین[1] ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام
دین خدا کا رسول — دین خدا کا کلام!

دین فقیہہ حرم — دین امیرِ جنود ——— دین ہے ابن السّبیل، اس کے ہزاروں مقام
دین کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات ——— دین ہے نورِ حیات، دین سے نارِ حیات

---

[1] اصل اشعار میں "دین" کے بجائے "عشق" کا لفظ ہے۔

یہ ہے وہ دین جو مذہب میں تبدیل ہو کر انسانیت کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔

چونکہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے اس لئے وہ ہمیشہ اپنے آپ کو سچ کے نقاب میں پیش کرتا ہے۔ مذہب بھی یہی کرتا ہے۔ وہ دین کے الفاظ، اصطلاحات، رسوم و مناسک اسی شکل میں قائم رکھتا ہے لیکن ان کی روح نکال دیتا ہے۔ یہی دین کے وہ بے روح خدوخال ہیں جن سے مذہب عوام کو دھوکا دیتا ہے۔ مذہب، درحقیقت، دین کی ممی شدہ لاش کا نام ہے۔

دین کے ساتھ برادران! جو کچھ اقوامِ سابقہ کے ہاتھوں ہوا تھا وہی کچھ اسلام کے ساتھ بھی ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اس دین کو قرآنِ کریم میں مکمل کیا اور حضورؐ نے یہ قرآن، اُمّت کو دے دیا۔ لیکن حضورؐ کی تشریف بری کے تھوڑے عرصے بعد مفاد پرست قوتوں نے اُبھرنا شروع کر دیا۔

اِسلام کے ساتھ یہی کچھ ہوا

اس دفعہ پہلے ملوکیت آئی۔ اس کے ساتھ سرمایہ داری۔ اور ان دونوں نے اپنے تحفظ کے لئے دین کو مذہب میں بدلنا شروع کر دیا۔ چنانچہ یہ دین بھی آہستہ آہستہ اسی طرح مذہب میں تبدیل ہو گیا جس طرح سابقہ انبیائے کرامؑ کا لایا ہوا دین تبدیل ہوا تھا اس فرق کے ساتھ کہ اس دین کا ضابطہ —— قرآنِ کریم —— اپنی اصلی شکل میں محفوظ رہا، کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمّہ خود خدا نے لے لیا تھا۔ لیکن اس کتاب کا محفوظ رہنا، مذہب کی نگاہ میں کانٹے کی طرح کھٹکتا رہا۔ چنانچہ اس نے اسے قوم کی زندگی سے عملاً خارج کرنے اور اس طرح اسے ایک ضابطۂ حیات کے طور پر غیر مؤثر بنانے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ رسول اللہؐ کے بعد کسی نبی کو نہیں آنا تھا جو دین کو اس کی اصلی شکل میں پھر سے دنیا کے سامنے پیش کرتا۔ اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ کیونکہ دین قرآن کے اندر منضبط تھا اور قرآن حرفاً حرفاً محفوظ۔ اس لئے اب دین کو اسکی اصلی شکل میں پیش کرنے کی صورت یہی تھی کہ قرآنِ کریم کو عملی زندگی کا ضابطہ بنانے کی کوشش کی جائے۔ یہی وہ کوشش تھی جو ہمارے زمانے میں تحریکِ پاکستان کی شکل میں سامنے آئی۔ جیسا کہ معلوم ہے پاکستان

تحریکِ پاکستان

کا تصوّر علامہ اقبالؒ کی بصیرتِ قرآنی کا رہینِ منّت ہے۔ انہوں نے اس مطالبہ کی بنیاد ہی اس حقیقت پر رکھی تھی کہ قرآنِ کریم مسلمانوں کی عملی زندگی کا ضابطہ اسی صورت میں بن سکتا ہے جب ان کی اپنی آزاد مملکت ہو جس میں قرآنی اصول و احکام نافذ کئے جا سکیں۔ غیروں کی حکومت میں مذہب تو باقی رہ سکتا ہے، دین نہیں رہ سکتا۔ آپ احباب کو معلوم ہے

کہ تحریکِ پاکستان کی سب سے زیادہ مخالفت ہمارے مذہب پرست طبقہ کی طرف سے ہوئی تھی۔ یہ درحقیقت، دین اور مذہب کی وہی کشمکش تھی جو ازل سے تا امروز باہمدگر ستیزہ کار چلی آرہی ہے۔ اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھ لینے کی ضرورت ہے۔

تحریکِ پاکستان کی مخالفت

مذہب کی اوّلین کوشش یہ ہوتی ہے کہ مملکت کا پورا اقتدار مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں رہے اور حکمران طبقہ اُن کے فیصلوں کو نافذ کرنے کی مشینری کا کام دے۔ اس انداز کو تھیاکریسی کہتے ہیں لیکن اگر ایسا ممکن نہ ہو تو مذہبی پیشوائیت کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ مملکت میں ایسا نظام قائم ہو جس میں امورِ سیاست، حکومت کی تفویض میں رہیں اور امورِ مذہب، مذہبی پیشوائیت کی تحویل میں۔ اسے سیکولر اندازِ حکومت کہا جاتا ہے۔ ہمارے قرنِ اوّل کے بعد جب دین، مذہب میں تبدیل ہوگیا تو مسلمانوں کی حکومتوں کا انداز سیکولر رہا۔ اسی انداز کو انگریزوں نے ہندوستان میں قائم رکھا۔ ان کے عہدِ حکومت میں بھی پبلک لاز، حکومت کی تحویل میں تھے اور پرسنل لاز اربابِ مذہب کے سپرد۔ تحریکِ پاکستان سے مقصود یہ تھا کہ اس مملکت میں دین کی حکمرانی ہو۔ ظاہر ہے کہ اس میں (ملوکیت اور سرمایہ داری کی طرح) مذہبی پیشوائیت کی بھی کوئی گنجائش نہیں رہتی تھی۔ دوسری طرف ہندو نے یقین دلایا کہ انگریز کے چلے جانے کے بعد مملکت کا نظام بدستور سیکولر رہے گا۔ چونکہ یہ انداز مذہبی پیشوائیت کو (SUIT) کرتا تھا اس لئے انہوں نے ہندوؤں سے مفاہمت کر لی ــــــ مذہب اپنے مفاد کے تحفّظ کے لئے ہر ایک سے مفاہمت کر سکتا ہے لیکن دین لاشریک ہوتا ہے۔ اس لئے وہ کسی سے مفاہمت نہیں کر سکتا۔

عقل عیّار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے
عشق بے چارہ نہ مُلّا ہے نہ زاہد نہ حکیم

اِس لئے تحریکِ پاکستان جو دین کی بنیادوں پر اٹھی تھی نہ ہندو سے مفاہمت کر سکتی تھی نہ مذہبی پیشوائیت سے۔ چنانچہ جب اس تحریک نے مذہبی پیشوائیت سے مفاہمت نہ کی تو اس نے اس کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ انہیں نیشنلسٹ یا (قوم پرست) علماء کا طبقہ کہا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ وہاں ایک مختصر سا گروہ ان لوگوں کا بھی تھا جو مذہب کے نام پر مملکت میں پورا اقتدار اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا تھا' یعنی یہ طبقہ تھیاکریسی قائم کرنے کا متمنّی تھا۔ چونکہ دین کی نظروں میں تھیاکریسی بھی ایسی ہی باطل ہے جیسی سیکولرازم' اس لئے تحریکِ پاکستان' اس طبقہ سے بھی مفاہمت نہیں کر سکتی تھی، لہٰذا یہ طبقہ بھی ــــــ متحدہ قومیّت کے نظریّہ کا مخالف ہونے

کے باوجود ــــــ تحریکِ پاکستان کا مخالف تھا۔ یہ طبقہ جماعتِ اسلامی کے نام سے معروف تھا۔

آپ نے غور فرمایا کہ تحریکِ پاکستان کی کش مکش، کس طرح درحقیقت دین اور مذہب کی وہی کش مکش تھی جو ازل سے تا امروز ستیزہ کار چلی آرہی ہے۔

پاکستان بننے کے بعد

مذہبی طبقہ کی اس قدر مخالفت کے باوجود، پاکستان وجود میں آگیا اور اس کے ساتھ ہی مخالفین کا یہ لشکر بھی اُمنڈ آیا۔ اب وہی کش مکش بندرہ سولہ برس سے یہاں بھی جاری ہے[1] اس طبقہ کی انتہائی کوشش یہ ہے کہ یہاں قرآن کی حکمرانی نہ ہونے پائے۔ اس کی بجائے یہ چاہتے ہیں کہ اولاً یہاں مذہبی تھیاکریسی قائم ہوجائے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر اس انداز کی سیکولر حکومت قائم ہوجائے جس میں پبلک لاز حکومت کے ہاتھ میں رہیں اور پرسنل لاز، مذہبی پیشوائیت کی تحویل میں۔ چونکہ سیکولر اندازِ حکومت، مغربی ذہنیت رکھنے والے طبقہ کے نزدیک بھی زیادہ پسندیدہ ہے، اس لئے اسے اس معاملہ میں مذہبی پیشوائیت کے ساتھ مفاہمت کرنے میں تامّل نہیں ہوسکتا۔ اس بناء پر یہاں اس انداز کی حکومت قائم ہوجانے کے امکانات زیادہ روشن ہیں۔ وہ طبقہ بھی جو یہاں تھیاکریسی قائم کرنے کا متمنّی ہے، سرِدست ان لوگوں کے ساتھ مفاہمت کرنے پر آمادہ ہے، اگرچہ ان کی آخری منزل تھیاکریسی ہی ہے۔

دستورِ پاکستان

ان حضرات کی یہ کوشش دستور سازی کے سلسلے میں برابر جاری ہے۔ چنانچہ پہلی دستور ساز اسمبلی کے پیشِ نظر یہ تجویز تھی کہ قانون سازی کے آخری اختیارات ایک علماء بورڈ کے سپرد کر دیئے جائیں۔ یہ تھیاکریسی کی شکل تھی، اس لئے یہ حضرات اس پر بہت خوش تھے۔ جب وہ اسمبلی ٹوٹ گئی تو ان کی کوشش سیکولر انداز کی طرف منتقل ہوگئی۔ چنانچہ ۱۹۵۶ء کا دستور، جس کے منظور ہونے پر ان حضرات کی طرف سے شادیانے بجائے گئے تھے، اسی اندازِ حکومت کا مظہر تھا۔ اس میں پرسنل لاز کو پبلک لاز سے الگ رکھا گیا تھا اور مختلف فرقوں کے وجود کو قانوناً تسلیم کر لیا گیا تھا۔ ۱۹۶۲ء کا آئین اس لحاظ سے ۱۹۵۶ء کے آئین سے بہتر ہے کہ اس میں نہ پرسنل لاز اور پبلک لاز میں تفریق کی گئی ہے اور نہ ہی مختلف فرقوں کے وجود کو تسلیم۔ یہی وجہ ہے کہ ان حضرات کی طرف سے ۱۹۶۲ء کے آئین کی،

---

[1] یہ خطاب ۱۹۶۳ء کا ہے۔

اس قدر مخالفت ہورہی ہے اور مطالبہ یہ ہے کہ اس کی جگہ ۱۹۵۶ء کے دستور کا "اسلامی حصّہ" اس دستور میں شامل کیا جائے۔

عائلی قوانین کی مخالفت

آپ نے برادرانِ عزیز! کبھی اس پر غور کیا ہے کہ یہ حضرات، ملک کے تمام قوانین کو چھوڑ کر عائلی قوانینؒ کی تنسیخ کے لئے اس قدر شور کیوں مچا رہے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ ملک میں اس وقت ایسے ایسے قوانین رائج ہیں جو صریحاً اسلام کے خلاف ہیں۔ مثلاً یہاں زنا کاری قانوناً جائز ہے۔ عصمت فروشی کے بازار ہر شہر میں کھلے ہیں۔ علاوہ بریں ایک بالغ لڑکے اور لڑکی کا باہمی رضامندی سے، بغیر نکاح، جنسی اختلاط قانوناً جرم نہیں۔ آپ نے کبھی سنا ہے کہ ان حضرات کی دینی غیرت نے کبھی ان قوانین کے خلاف بھی جوش کھایا ہو اور انہیں منسوخ کرنے کے لئے انہوں نے محاذ قائم کئے ہوں؟ یہ کیوں ہے کہ ان قوانین کے خلاف ان کی طرف سے کبھی جدوجہد نہیں ہوتی لیکن عائلی قوانین کے خلاف اس قدر قیامت برپا کی جارہی ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ عائلی قوانین پرسنل لاز تھے جو مذہبی پیشوائیت کی تحویل میں چلے آرہے تھے۔ قرنِ اوّل کے بعد مسلمانوں کی تاریخ میں یہ پہلا موقعہ ہے حکومت ان قوانین کو مذہبی پیشوائیت کے حیطۂ اقتدار سے نکال کر حکومت کے دائرہ اختیار میں لائی ہے۔ مذہبی پیشوائیت اسے اپنی حدود میں حکومت میں دخل اندازی سمجھتی ہے۔ اس لئے وہ اسے کس طرح برداشت کرسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ حضرات ان قوانین کے خلاف متحدہ محاذ بنا کر کھڑے ہوگئے ہیں؛ ورنہ ان قوانین میں کوئی بات ایسی نہیں جس سے اسلام خطرے میں پڑ جاتا ہو۔

آپ کی دعوت

اس تمام کش مکش میں برادرانِ عزیز! دینِ خالص کی طرف دعوت دینے والی آواز آپ کی طرف سے اُٹھ رہی ہے۔ اس لئے مذہبی پیشوائیت کی ساری مخالفت کا رخ آپ کی سمت ہے۔ کس قدر خوش بخت ہیں وہ لوگ جو دین اور مذہب کی کش مکش میں اُس طرف کھڑے ہیں جدھر حضرات انبیائے کرامؑ اور قدوسیوں کی وہ جماعتیں کھڑی ہوا کرتی تھیں جنہیں خدا نے حزب اللہ

ؒ مارشل لاء (۱۹۵۸ء — ۱۹۶۲ء) کے دوران حکومت کی طرف سے چند قوانین جاری ہوئے تھے جن میں مسلمانوں کے نکاح، طلاق، تعددِ ازدواج وغیرہ سے متعلق مروجہ قوانین کو قرآن کریم کے قریب لانے کی کوشش کی گئی تھی۔ مذہب پرست طبقہ کی طرف سے ان قوانین کی سخت مخالفت ہوئی تھی۔

کہہ کر پکارا ہے۔ یہ حضرات اپنی اس خوش بختی پر جس قدر بھی ناز کریں کم ہے۔

چونکہ مذہب، ہر نظریہ، ہر تصوّر، ہر نظام اور ہر ادارہ کے ساتھ مفاہمت کر سکتا ہے ـــ اور سرمایہ دار طبقہ اس کا پشت پناہ ہوتا ہے، اس لئے ان لوگوں کے پاس نہ روپے پیسے کی کمی ہوتی ہے نہ اسباب و ذرائع کی محتاجی۔ روپے کے زور پر یہ لوگ پراپیگنڈہ کی مشینری پر قابو پا لیتے ہیں اور جھوٹ کو

سامان و ذرائع کی فراوانی

سچ کر کے دکھاتے چلے جاتے ہیں۔ دین، ان قوتوں میں سے کسی کے ساتھ مفاہمت نہیں کر سکتا۔ اس لئے جو لوگ اس کی دعوت کو لے کر اُٹھتے ہیں ان کے پاس ان میں سے کوئی چیز بھی نہیں ہوتی۔

فقر جنگاہ میں بے ساز و یراق آتا ہے

پھر مذہب اپنے مقاصد کے حصول کے لئے ہر حربے کا استعمال جائز سمجھتا ہے۔ وہ جھوٹ بولنے میں

اور مختلف حربے

کوئی باک نہیں محسوس کرتا۔ وہ سینٹ پال کے الفاظ میں بڑے فخر سے کہتا ہے کہ

اگر میرے جھوٹ کے سبب سے، خدا کی سچائی اس کے جلال کے واسطے زیادہ ظاہر ہوئی تو پھر مجھ پر گنہگار کی طرح کیوں حکم دیا جاتا ہے۔ (رومیوں کے نام، ۳/۷)

وہ بڑے طمطراق سے فتویٰ دیتا ہے کہ

راست بازی اور صداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے اور جھوٹ اس کی نگاہ میں ایک بدترین بُرائی ہے لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے۔

(ابوالاعلیٰ مودودی، ترجمان القرآن، مئی ۱۹۵۸ء)

وہ تعلیم یہ دیتا ہے کہ

دُنیا کو اپنے ساتھ ملانے کے لئے بڑے مقدّس اور زرّیں اصول پیش کرو، لیکن جب اس طرح قوّت حاصل ہو جائے تو تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر عملاً وہ کچھ کرو جس میں اپنا مفاد سمجھو۔ (ترجمان القرآن، مئی ۵۸ء)

اپنے مقصد کے حصول کے لئے اگر رشوت تک بھی دینی پڑے تو اسے کارِ ثواب سمجھو، البتہ اس کا

نام تالیفِ قلب لکھو۔[1]

مذہب ہمیشہ سے یہی کچھ کرتا چلا آرہا ہے اور آج بھی یہی کچھ کر رہا ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ اپنی فریب کاریوں سے دین کو شکست دے سکتا ہے۔ دین خدا کے اٹل قوانین کا نام ہے اور ان قوانین کا آخر الامر غالب آنا خدائی پروگرام ہے۔ خدا کے پروگرام کو دنیا کی کوئی قوت شکست نہیں دے سکتی۔ لیکن (جیسا کہ آپ احباب کو اچھی طرح معلوم ہے) حق آہستہ آہستہ باطل کے نظام پر غالب آتا ہے۔ آہستہ آہستہ اس لئے کہ خدا کا ایک ایک دن ہزار ہزار سال، بلکہ پچاس پچاس ہزار سال کا ہوتا ہے جن اربابِ نظر کی نگاہیں ان انقلابات پر ہیں جو اس وقت دنیا کے ہر گوشے میں رونما ہو رہے ہیں (اور جنہیں علامہ اقبالؒ نے قیامتِ موجود سے تعبیر کیا ہے) انہیں نظر آرہا ہے کہ اب مشیت کے پروگرام کے مطابق باطل کے نظامہائے زندگی کے مٹنے کا وقت بڑی تیزی سے آرہا ہے۔ دنیا سے ملوکیت کا دور ختم ہو رہا ہے۔ ہر نئے سورج کے ساتھ کوئی نہ کوئی تاج فضا میں اُڑتا دکھائی دیتا ہے۔ نظامِ سرمایہ داری (جاگیرداری، زمینداری) حرفِ غلط کی طرح مٹ رہا ہے اور ان کے ساتھ ہی مذہب کی سحر کاریاں بھی ابخرات کی طرح ہوا میں اڑتی چلی جا رہی ہیں۔ آپ ذرا غور کریں گے تو یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ انسانی قلوب و اذہان پر مذہب کی جو گرفت آج سے پچاس سال پہلے تھی، وہ بڑی حد تک ڈھیلی پڑ چکی ہے۔ ہندوستان سے سناتن دھرم بڑی تیزی سے ختم ہو رہا ہے۔ بدھ مت کا مامن و مسکن چین تھا، اسے وہاں سے دیس نکالا مل چکا ہے۔ تبت ان کے خداؤں (لاماؤں) کا پایۂ تخت تھا۔ وہ وہاں سے بیک بینی و دو گوش نکالے جا چکے ہیں۔ اور اپنی جان کی حفاظت کے لئے در بدر مارے مارے پھر رہے ہیں۔ یہودیت، مذہب کو چھوڑ کر، سیاست میں بدل چکی ہے۔ عیسائیت کی قدیم عمارت کا وسطی ستون پوپ ہے اس لئے ابھی پچھلے دنوں جس نئی پالیسی کا اعلان کیا ہے وہ اس حقیقت کی غماز

دین کا غلبہ

مذہب کا انجام

---

[1] حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب نے اپنے اخبار "المنبر" بابت ۱۹ ستمبر ۱۹۵۸ء میں لکھا تھا کہ مودودی صاحب نے انہیں ملتان جیل میں کہا تھا کہ کراچی جاؤ اور طلوعِ اسلام کے دفتر کے کسی شخص کی "تالیفِ قلب" کر کے اس سے طلوعِ اسلام کے پتے حاصل کر لو۔

ہے کہ اس کا اقتدار بھی خطرہ میں ہے۔ غرضیکہ مذہب کی دُنیا میں آپ جہاں بھی دیکھیں گے آپ کو نظر آجائے گا کہ

مے خانہ کی بنیاد میں آیا ہے تزلزل ۔۔۔ بیٹھے ہیں اسی فکر میں پیرانِ خرابات

جب ساری دنیا میں مذہب کے ساتھ یہ کچھ ہو رہا ہے تو آپ سمجھتے ہیں کہ وہ مذہب (دین نہیں، مذہب) جو ہمارے ہاں رائج ہے باقی رہ جائے گا؟ اس وقت سوال اُس مذہب یا اِس مذہب کا نہیں سوال نفسِ مذہب کا ہے خواہ اس کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لیا جائے۔ یہ کہنا کہ دوسروں کا مذہب باطل ہے اور ہمارا مذہب حق، اس لئے یہ فنا نہیں ہو سکتا' خود فریبی سے زیادہ کچھ نہیں۔ دنیا میں ہر مذہب کے علمبردار یہی کہتے ہیں۔ لیکن مذہب حق پر ہوتا ہی نہیں۔ حق پر تو خدا کا دین ہوتا ہے۔ اب مذہب کا دور ختم ہو رہا ہے' اس لئے مذہبی مفاد پرستوں کی ہزار کوششوں اور مقدّس آرزوؤں کے باوجود یہ باقی نہیں رہ سکتا۔ علامہ اقبالؒ نے عرصہ ہوا، لیگ اوف نیشنز (آنجہانی) کے متعلق کہا تھا کہ

بے چاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے ۔۔۔ ڈر ہے خبرِ بد نہ مرے منہ سے نکل جائے
تقدیر تو مبرم نظر آتی ہے ولیکن ۔۔۔ پیرانِ کلیسا کی دعا یہ ہے کہ ٹل جائے!
ممکن ہے کہ یہ داشتۂ پیرکِ افرنگ ۔۔۔ ابلیس کے تعویذ سے کچھ روز سنبھل جائے

جو کچھ انہوں نے لیگ اوف نیشنز کے متعلق کہا تھا وہی کچھ اب انسانوں کے خود ساختہ مذہب کے متعلق نظر آتا ہے۔ اس وقت اربابِ مذہب کے ہاں جذبات کی جو شدّت نظر آتی ہے وہ ان کی حرکتِ مذبوحی ہے۔ اس سے یہ کچھ وقت کے لئے فضا میں انتشار اور معاشرہ میں خلفشار تو پیدا کر سکتے ہیں' اپنی مسندوں کو گرنے سے بچا نہیں سکتے۔ زمانے کے تقاضے انہیں ختم کر کے رہیں گے۔

لا و اِلّا

لیکن برادرانِ عزیز! جب باطل، زمانے کے تقاضوں کے ہاتھوں مٹتا ہے تو اس میں ایک نقص رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ یہ تقاضے صرف باطل کو مٹاتے ہیں، اس کی جگہ، حق کا نظام ساتھ کے ساتھ قائم نہیں ہوتا۔ ان دونوں کے درمیان ایک خلا رہ جاتا ہے جسے قانونِ خداوندی کی کائناتی رفتار کے مطابق پُر کرنے کے لئے کافی وقت درکار ہوتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں زمانے کے تقاضے "اللہ کے نشتر" ہوتے ہیں جو فصد کھول کر کثیف خون باہر نکال دیتے ہیں، لیکن اس کی جگہ صالح خون ساتھ کے ساتھ پیدا نہیں کرتے۔ یہ کام ان لوگوں کے کرنے کا ہوتا ہے جو دین کا نظام قائم کرنے کا ولولہ

اپنے دل میں رکھتے ہیں۔ وہ وقت، جب زمانے کے تقاضے باطل کے کسی نظام کو مٹا رہے ہوں، ان لوگوں کے لئے بڑا اسازگار بھی ہوتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی بڑا صعوبت انگیز بھی۔ سازگار تو اس لئے کہ ان کا آدھا کام ــــــ یعنی لا الہ کا مرحلہ ــــــ زمانے کے تقاضے یا اللہ کے نشتر پورا کر دیتے ہیں۔ انہیں اس ہموار شدہ زمین پر الا اللہ کی عمارت استوار کرنی ہوتی ہے لیکن پُراز صعوبات اس لئے کہ جس طرح ایک "مجبوت" نکلتے وقت بڑی دہشت انگیز نشانی پیچھے چھوڑتا ہے، باطل کی قوتیں نزع کی حالت میں بڑی سخت لکدکوبی کرتی ہیں ــــــ بدر و حُنین کے میدان باطل کی قوتوں کے اسی رقصِ بسمل کی یادگار ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس آئینی دور میں کم از کم پاکستان میں ان رزم گاہوں کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اس میں شبہ نہیں کہ قضا کر لیبی قائم کرنے والوں کے عزائم کچھ اور ہیں۔ چنانچہ انہوں نے بہت پہلے اس پروگرام کا اعلان کر دیا تھا، جب کہا تھا کہ

> اسلام جب اس طرح اپنے آدمیوں کو تیار کر لیتا ہے تب وہ ان سے کہتا ہے کہ ہاں! اب تم روئے زمین پر سب سے زیادہ صالح بندے ہو لہٰذا آگے بڑھو اور لڑ کر خدا کے باغیوں کو حکومت سے بے دخل کر دو اور حکمرانی کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لو۔
>
> (خطباتِ مودودی، ص ۲۳۵)

طلوعِ اسلام کا پروگرام

طلوعِ اسلام کا پروگرام اس کے بالکل برعکس ہے۔ ہم نہایت پُرامن اور آئینی طریق سے قرآنی فکر کو عام کرتے جانا چاہتے ہیں۔ اس سے زیادہ ہمارے پیشِ نظر کوئی پروگرام نہیں ــــــ حتیٰ کہ ہم ملک کی عام عملی سیاسیات میں بھی حصّہ نہیں لیتے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس دور میں کسی فکر کی نشر و اشاعت کے لئے جس قدر سامان و ذرائع کی ضرورت ہے، ہمارے پاس ان کی بے حد کمی ہے لیکن وہ جو قرآن نے کہا ہے کہ تم دین کی آواز بلند کرنے کے لئے اٹھو تو خدا کی کائناتی قوتیں تمہارا ساتھ دیں گی، کچھ اس کا اثر ہے کہ سامان و ذرائع کی اس قدر کمی کے باوجود قرآن کی آواز جس تیزی سے پھیلتی جا رہی ہے وہ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ آپ ذرا دس بیس برس پہلے اُدھر کا نقشہ سامنے لائیے اور پھر آج کی فضا پر غور کیجئے۔ آپ کو نظر آ جائے گا کہ یہ آواز کس طرح، خاموشی ہی خاموشی سے ہر گوشے کو متاثر کئے جا رہی ہے اور یہ حقیقت کس طرح ایک واقعہ بن کر سامنے آ رہی ہے کہ

حُسن کے رازِ نہاں، شرح دبیاں تک پہنچے — آنکھ سے دل میں گئے دل سے زباں تک پہنچے
دل نے آنکھوں سے کہی آنکھ نے دل سے کہدی — بات چل نکلی ہے اب دیکھیں کہاں تک پہنچے

یہ بات کے چل نکلنے کا نتیجہ ہی تو ہے کہ قرآن کی عظمت و صداقت کے معترف تو ایک طرف، اس آواز کے شدید ترین مخالف بھی اپنے مواعظ اور تقاریر میں، قرآن کی آیات، دین کی اصطلاحات اور نظامِ خداوندی کے استعارات استعمال کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔

جنابِ شیخ وضو کے لئے سہی، لیکن — کسی بہانے لبِ جُو نکل ہی آتے ہیں

اس سے بھی بڑھ کر خوشی کا مقام یہ ہے کہ یہ آواز اب پاکستان کی حدود سے نکل کر آگے، مغربی ممالک میں بھی پھیلتی جا رہی ہے۔ پچھلے سال میں نے آپ احباب سے ذکر کیا تھا کہ کس طرح ایک جرمن مصنف نے اپنی پاکستانی سیاحت کی روئداد کے سلسلہ میں یہ لکھا تھا کہ یہاں ایک ہی تحریک قابلِ ذکر ہے اور وہ طلوعِ اسلام کی تحریک ہے۔ اب حال ہی میں ایک کتاب ہالینڈ سے شائع ہوئی ہے۔ کتاب کا نام ہے :

مغربی ممالک میں آواز

(MODERN MUSLIM QURAN INTERPRETATION) اور مصنف کا نام (J.M.S. BALJON) ہے۔ اس میں فاضل مصنف نے بتایا ہے کہ اس وقت دنیائے اسلام میں قرآن کی جدید تعبیرات کی کوششیں کہاں کہاں ہو رہی ہیں۔ اس سلسلہ میں اس نے پاکستان سے صرف دو مصنفوں کو منتخب کیا ہے، ایک علامہ مشرقی اور دوسرے آپ کا یہ رفیق ——— اس نے سلسلہ معارف القرآن اور سلیم کے نام خطوط وغیرہ کا براہِ راست (اُردو سے) مطالعہ کیا ہے اور اپنی کتاب میں ان کے اقتباس پر اقتباس دیئے چلا جاتا ہے۔ وہ میری زندگی کے مختصر حالات بیان کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ

پرویز کی خوبی یہی نہیں کہ اس نے قرآنی حقائق کی ایسی عمدہ تشریح کی ہے یا انہیں اس قدر بلند پایہ ادبیانہ انداز سے پیش کیا ہے۔ وہ درحقیقت ایک عمدہ معلّم ہے جسے فطرت نے اعلےٰ صلاحیتوں سے نوازا ہے اور ان نوجوانوں کے لئے جو مذہب سے برگشتہ ہو رہے ہیں اور ان کی زندگی کی کشتی کو لنگر کی ضرورت ہے، ایک مشفق دوست ہے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ وہ جس موضوع پر بھی گفتگو کرتا ہے اس کے متعلق نہایت محکم اور آزاد رائے رکھتا ہے

اور نہایت معقول نتیجہ پر پہنچتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ عصرِ حاضر کے تقاضوں پر بڑی گہری نگاہ رکھتا ہے۔ اس لئے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ جوں جوں وقت گزرتا جائے گا اس کا اثر بڑھتا جائے گا۔ (ص۱۵)

مصر سے آواز مصر کے علامہ سید احمد السیفی کے مضامین کے تراجم، طلوعِ اسلام کی گذشتہ اشاعتوں میں آپ کی نظروں سے گزرے ہوں گے۔ ان مضامین کی کیفیت یہ ہے کہ اگر ان پر علامہ موصوف کا نام نہ لکھا ہو تو پہچانا نہ جاسکے کہ یہ مضامین خود طلوعِ اسلام کے ہیں یا ان کا لکھنے والا کوئی اور ہے۔ علامہ سیفی کے علاوہ مصر میں اور علماء بھی ہیں جو اسی نہج سے قرآن پر غور و فکر کرتے ہیں۔ ان ممالک نیز، یورپ اور امریکہ سے مطالبات موصول ہو رہے ہیں کہ طلوعِ اسلام کا لٹریچر انہیں بھیجا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ جب قرآن اپنی اصلی شکل میں ان ممالک کے اربابِ فکر و نظر کے سامنے آیا، تو وہ اس کا استقبال آگے بڑھ کر کریں گے وہ اپنے غلط تصوّرات اور باطل نظامِ زندگی سے سخت تنگ آئے ہوئے ہیں اور کسی جدید نظام کے لئے بے حد مضطرب و بے قرار نظر آتے ہیں۔ مذہب ان کی تسکین نہیں کر سکتا۔ بلکہ سچ پوچھئے تو وہ مذہب کے ہاتھوں تنگ آکر ہی زندگی کی کسی نئی شاہراہ کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ اور یہ شاہراہ قرآن کے سوا کہیں سے نہیں مل سکتی۔ کیا عجب ہے کہ اگر ان کے سامنے خدا کا دین اپنی حقیقی شکل میں آجائے تو جس آدمِ نو کے انتظار میں زمانے کی آنکھ بار بار اُٹھ رہی ہے، اس کی نمود وہیں سے ہو جائے۔ میری تو کیفیت یہ ہے کہ

اسی اُمیّد پہ بیٹھا ہوں سرِ راہ گذر ہجر کی رات ہوئی ہے تو سحر بھی ہوگی

قرآن کا مطالبہ برادرانِ من! آپ نے قرآن کی آواز کو آگے بڑھانے کے لئے جو کچھ کیا ہے اس کا میرے دل پر خاص اثر ہے۔ آپ نے سخت نامساعد حالات میں، اپنی بے بضاعتی اور کم مائیگی کے باوجود اس دیئے کو اپنے خونِ جگر سے روشن رکھا ہے لیکن اس کے باوجود مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ قرآنِ کریم ہم سے جو توقعات وابستہ کئے ہوئے ہے ہم انہیں کماحقہٗ پورا نہیں کر رہے۔ یہ تو اس کی کشادہ نگہی اور وسعتِ ظرف ہے جو وہ ہمیں اپنے دامن سے جھٹک نہیں دیتا۔ ورنہ حق بات یہی ہے کہ ہم اس کے معیار پہ پورے نہیں اُتر رہے۔ قرآن کو ہم سے بہت سے شکوے ہیں اور بالکل بجا شکوے۔

نہ جانے کتنے رنگلے اس میں مضطرب ہیں ندیم — وہ ایک دل جو کسی کا گلہ گزار نہیں

اس کے وابستگانِ دامن کو تو جان اور مال دونوں اس کے ہاتھوں بیچ دینے پڑتے ہیں۔ ہم اس سودے کا بیعانہ تک بھی ادا نہیں کر سکے۔ اِس لئے میں آپ احباب سے درخواست کروں گا کہ آپ اس باب میں مزید ہمّت کیجئے —— انسانی تاریخ میں یہ وقت بڑا نازک آیا ہے۔ جیسا کہ پہلے میں کہہ چکا ہوں قدیم تصوّراتِ حیات اور نظامہائے زندگی کا دور دورہ ختم ہو رہا ہے —— ملوکیّت سرمایہ داری، مذہب، سب ایک ایک کر کے اُٹھتے اور مٹتے جا رہے ہیں۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

عالمگیر انقلاب

زمانے کے انداز بدلے گئے — نیا راگ ہے، ساز بدلے گئے!

پرانی سیاست گری خوار ہے — زمیں میر و سلطان سے بیزار ہے

گیا دورِ سرمایہ داری گیا! — تماشا دکھا کر مداری گیا!

زمانے میں انقلابات اس تیزی سے آ رہے ہیں یا کروٹیں بدل رہے ہیں۔ لیکن جس اُمّت نے ایسے مقام پر کاروانِ انسانیت کی صحیح راستے کی طرف راہ نمائی کرنی تھی اس کی اپنی حالت یہ ہے کہ

مسلماں ہے توحید میں گرم جوش — مگر دل ابھی تک ہے زنّار پوش

تمدّن، تصوّف، شریعت، کلام — بتانِ عجم کے پجاری تمام

حقیقت خرافات میں کھو گئی — یہ اُمّت روایات میں کھو گئی

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

اس وقت لَا کی طوفانی قوتیں (کمیونزم وغیرہ) بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہیں۔ اگر اِلَّا اللہ کا تصوّر اس وقت سامنے نہ لایا گیا تو انہیں اس کے بعد ان کے مقام سے ہٹانے یا اِلّا اللہ تک لانے میں نہ معلوم کتنا وقت لگ جائے —— اور انسانیت کو کتنا عرصہ اور اس جہنّم میں گزارنا پڑے جس میں وہ صدیوں سے پڑی جھلس رہی ہے اس لئے

ایکہ آسودہ نشینی لبِ ساحل برخیز — کہ ترا کار بگرداب و نہنگ است ہنوز

قرآن کی تو کیفیت یہ ہے کہ جب اس کی عظمت انسان کے دل کی گہرائیوں میں اُتر جائے تو یہ اس میں

عجیب و غریب انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ حالات کی ناسازگاری اور زمانے کی

حُدی را تیز تر می خواں

مخالفت اس کے جذبۂ سرشاری کو تیز تر کر دیتی ہے۔ اَلَّذِیۡنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدۡ جَمَعُوۡا لَكُمۡ فَاخۡشَوۡهُمۡ فَزَادَهُمۡ اِيۡمَانًا ۖۚ وَّقَالُوۡا حَسۡبُنَا اللّٰهُ وَنِعۡمَ الۡوَكِيۡلُ ۔ (۳/۱۷۲) یہ وہ صاحبانِ عزم و یقین ہیں کہ جب ان سے لوگ کہتے ہیں کہ دشمن نے تمہارے خلاف لشکرِ جرّار جمع کر رکھا ہے اس لئے تمہیں اس سے ڈرنا چاہیئے تو اس سے ان کے ایمان میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے اور دل کے پورے اطمینان سے کہتے ہیں کہ دشمن کا لشکر بڑا ہے تو ہوا کرے، ہمارے ساتھ اللہ کی تائید و نصرت ہے اور یہ وہ قوت ہے جس پر پورا پورا بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ قرآن سے شیفتگی انسان کو کسی مقام پر بھی دل گرفتہ نہیں ہونے دیتی۔ وہاں تو حالت یہ ہو جاتی ہے کہ

مجھ کو اداس کر گیا جبکہ سلوکِ انجمن — اٹھ کے نگاہِ دلبری ہاتھ میرا دبا گئی

اس لئے برادرانِ گرامی قدر! وقت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ اپنی کوششوں کو تیز تر کر دیجئے اور قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے لئے پہلے سے بھی زیادہ جوش و انہماک کے ساتھ مصروفِ عمل ہو جائیے۔ جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے آپ احباب نے اس وقت تک میرے پروگرام کی تکمیل کے لئے جس مخلصانہ رفاقت

میری آرزو

کا ثبوت دیا ہے اس کا گہرا نقش میرے دل پر ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ جیسے رفقائے سفر ہر رہروِ حیات کے نصیب کرے۔ میرا پروگرام یہ ہے کہ اس پیغام کو مغربی ممالک تک پہنچانے کے بعد ایک ایسی درس گاہ قائم کی جائے جس میں نونہالانِ ملّت کی تعلیم و تربیت خالص قرآنی خطوط پر ہو۔ اور وہ اس قابل ہو سکیں کہ اس چراغ کو بدستور روشن رکھیں اور میں مرتے وقت ان سے کہہ سکوں کہ

بگیر ایں ہمہ سرمایۂ بہار از من! — کہ گُل بدستِ تو از شاخ تازہ تر ماند

کس قدر پُرسکون ہو گی ایسی موت جس پر ہر دیکھنے والا بے ساختہ پکار اُٹھے کہ

قسمت نگر کہ کشتۂ شمشیرِ عشق یافت — مرگے کہ زندگاں بدعا آرزو کنند

آخر میں عزیزانِ گرامی قدر! میں ایک ایسے نکتہ کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں جسے اچھی طرح نہ سمجھنے

سے کئی ذہنوں میں پریشانی اور بعض دلوں میں افسردگی تک پیدا ہو جاتی ہے۔ مجھ سے اکثر کہا جاتا ہے کہ ہم اتنے عرصے سے اس آواز کو بلند کر رہے ہیں لیکن لوگ اس طرف کم متوجہ ہوتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں دوسری جماعتوں کو دیکھئے تو ان کے پیچھے لاکھوں افراد نظر آتے ہیں۔

یہ ٹھیک ہے۔ ہماری برسوں کی تگ و تاز سے، گنتی کے افراد ہمارے شریکِ سفر ہوئے ہیں اور مذہب پرست طبقہ کی ایک آواز پر لاکھوں افراد ان کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ اس کی بیّن وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ پانی کے بہاؤ کے ساتھ تیرتے ہیں اور آپ اس کے چڑھاؤ کی طرف جاتے ہیں۔ وہ لوگ عوام کو انہی باتوں کی دعوت دیتے ہیں جنہیں وہ پہلے سے مان رہے ہوتے ہیں، اور آپ انہیں ان راستوں پر چلنے سے روکتے ہیں۔ جن پر صدیوں سے آنکھیں بند کئے چلے آ رہے ہیں۔ نتیجہ اس کا ظاہر ہے۔ آپ ذرا غور کیجئے کہ بنی اسرائیل کی طرف خدا کے دو جلیل القدر نبی ——— حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ مبعوث ہوتے ہیں۔ وہ برسوں تک ان کی تعلیم و تربیت میں اپنا خون پسینہ ایک کر دیتے ہیں لیکن اس کا نتیجہ صرف اس قدر نکلتا ہے کہ فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ۔ (۱۰/۸۳) ان پر قوم کے چند نوجوانوں کے سوا کوئی ایمان نہ لایا۔ اس کے برعکس سامری انہیں ایک بُت تراش کر دیتا ہے اور ساری قوم اس کے پیچھے لگ جاتی ہے۔

گوسالہ سامری

اس میں سامری کی کاریگری اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ اس نے قوم کی نفسیات کا مطالعہ کیا اور گوسالہ پرستی کے جو جذبات ان کے دل کی گہرائیوں میں پہلے سے موجود تھے ان کی تسکین کا سامان فراہم کر دیا۔ یہی ہر زمانے کا سامری کرتا ہے۔ وہ قوم کی خوئے بت پرستی سے فائدہ اٹھاتا ہے اور ان کے ذوقِ عبودیت کی تسکین کے لئے ایک نیا بت تراش کر دے دیتا ہے اور خود اس بتکدے کا پجاری (مہنت) بن جاتا ہے۔ وہ اس بُت تراشی میں بھی ایک پائی اپنی جیب سے خرچ نہیں کرتا۔ وہ قوم ہی کے زیوروں کو ڈھال کر انہیں ایک بُت بنا کر دے دیتا ہے۔ جب تک قوم میں خوئے بُت پرستی موجود ہے کسی بُت ساز کو بھی پجاریوں کی کمی کی شکایت نہیں ہو سکتی۔ ہر بتکدہ آباد رہے گا، صرف اس فرق کے ساتھ کہ جس بُت خانے کا مہنت زیادہ شاطر اور چالاک ہوگا اس میں چڑھاوا زیادہ چڑھے گا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ آپ کے ہاں پہلے سے اس قدر خانقاہوں، درگاہوں اور مقبروں کی موجودگی کے باوجود ہر نئی قبر پر کس دھوم دھام سے میلہ لگتا ہے۔ اس میلے کی رونق کا راز اس قبر کی جاذبیت میں نہیں بلکہ قوم کی خوئے بُت پرستی میں مضمر ہوتا ہے۔

اس کے برعکس جو شخص قوم کے دل سے بت پرستی کے جذبات نکالنا چاہتا ہے اس کی منزل بڑی کٹھن اور اس کے راستے بڑے پُرخار ہوتے ہیں۔ دین اور مذہب کی یہی وہ کشمکش ہے جس میں صاحبِ ضربِ کلیم ؑ کا ساتھ تو قوم کے چند افراد دیتے ہیں اور سامری کے پیچھے ساری قوم لگ جاتی ہے۔ یہی چار ہزار سال پیشتر ہوتا تھا اور یہی آج ہو رہا ہے۔ اس لئے برادرانِ من! آپ نہ تو اپنے دعوت کے نتائج کی شکست روی سے گھبرائیے اور نہ ہی سامریانِ عصرِ حاضر کی کامیابی کو ان کے مسلک کی صداقت کی علامت سمجھئے۔ آپ صرف یہ دیکھئے کہ آپ کی دعوت، اس پیغام کی نقیب ہے یا نہیں جسے خدا کی کتاب پیش کرتی ہے۔ اسے قدم قدم پر جانچتے رہیے اور اس کی خاص احتیاط برتئے کہ اس دعوت کی کامیابی کے لئے کوئی طریق ایسا اختیار نہ کیا جائے جو ضابطۂ خداوندی کے نزدیک پسندیدہ نہ ہو۔ یاد رکھئے! اس تحریک کی کامیابی کے لئے اگر آپ کا ایک قدم بھی غلط اُٹھ گیا تو وہی آپ کی شکست اور ناکامی کا مقام ہوگا۔ اور اسے بھی اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ اس راستہ میں سب سے زیادہ گراں بہا متاعِ سفر اور محکم ترین سامانِ حفاظت، آپ کی سیرت کی بلندی اور کیریکٹر کی پختگی ہے۔ آپ کی کامیابی کا سب سے بڑا راز، آپ کی اپنی ذات کے ساتھ دیانت اور دوسروں کے ساتھ حُسنِ معاملہ میں پوشیدہ ہے۔ اگر آپ نے اپنے اندر یہ جوہر پیدا کر لئے تو پھر آپ کو دنیا کی کوئی طاقت شکست نہیں دے سکتی کہ

جہادِ زندگی میں ہیں یہی مردوں کی شمشیریں

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت مسیحؑ کی انقلاب آفریں تعلیم

(ایک درسِ قرآن کا ملخّص)

(مارچ ۱۹۶۲ء)

عیسائیت کی مروّجہ تعلیمات کی رُو سے حضرت مسیح علیہ السّلام کی شخصیّت کا جو نقشہ سامنے آتا ہے وہ کچھ اس نوعیّت کا ہے کہ خدا کے اس جلیل القدر پیغمبرؑ کی زندگی ایک تارک الدنیا اور عاجز و ناتواں زاہدِ گوشہ نشین کی سی تھی اور انہوں نے قدسیوں کی جو جماعت پیدا کی وہ بھی دربدر پھرنے والے مفلوک الحال فقیروں کا سا ایک گروہ تھا جو مسکینی، عاجزی اور بے چارگی میں برّۂ معصوم کی طرح زندگی بسر کرتا رہا۔ کچھ اس قسم کی تعلیمات آپ کی ذاتِ گرامی کی طرف منسوب کی جاتی ہیں کہ ایک گال پر تھپڑ کھا کر دوسرا گال آگے بڑھا دو۔ جو کوئی کرتا لینا چاہے اُسے از خود چُغہ اتار کر دے دو۔ جو ایک کوس بیگار میں لے جائے اس کے ساتھ دو کوس تک چلے جاؤ۔ دشمن سے بھی محبت کرو۔ شریر کا مقابلہ نہ کرو۔ ظلم کا انتقام نہ لو۔ مظلومی، عاجزی اور انکساری کی زندگی بسر کرو۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہ الفاظ بظاہر بڑے خوش آیند اور نگاہ فریب نظر آتے ہیں لیکن جن لوگوں کی نگاہیں قرآنی حقائق پر ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس قسم کی تعلیم کبھی آسمانی تعلیم نہیں ہو سکتی۔ انہیں معلوم ہے کہ تمام انبیائے کرام اس دنیا میں ایک انقلابِ عظیم کی دعوت لے کر آئے تھے۔ ان کی بعثت کا مقصدِ اولیٰ ظلم و جبر کی قوتوں کے پنجے توڑ کر مظلوم و مقہور نوعِ انسانی کو آزادی اور سربلندی عطا کرنا تھا۔ ان کی حیاتِ طیّبہ اس مقدّس فریضہ کی امین تھی کہ انسانوں کو بے بسی اور بے چارگی کے بندھنوں سے نجات دلا کر کشادِ زندگی

سے بہرہ ور کیا جائے۔ ان سب کی دعوتِ انقلاب اس نصب العین کی نقیب تھی کہ اولادِ آدم کو ملوکیت، سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت اور اسی قسم کی دوسری زنجیروں میں مقید نہیں رکھا جا سکتا۔

مسیح علیہ السلام اسی انقلاب آفریں اور جہاد انگیز پیغام کے داعی تھے اور انہوں نے اولوالعزم قدوسیوں کی جو جماعت تیار کی تھی ان میں سر دھڑ کی بازی لگانے کے ولولے اسی شدتِ آرزو اور بے تابیٔ تمنّا کے ساتھ موجود تھے جو دیگر انبیائے کرامؑ کے رفقائے جلیل کے قلوب میں موجزن ہوتے تھے جس طرح صاحبِ ضربِ کلیمؑ نے اپنی دعوتِ انقلاب کی لرزہ خیز قوتوں کے زور پر فرعون کی ملوکیت، قارون کی سرمایہ داری اور ہامان کی مذہبی پیشوائیت کی مہیب قہرمانیوں سے ٹکر لی، بعینہٖ اسی عزم و جلال سے مسیح علیہ السلام بھی بنی اسرائیل کو رومی شہنشاہیت، سرمایہ داری اور یہودی علماء و مشائخ کے استبداد سے نجات دلانے آئے تھے، بلکہ سچ پوچھئے تو حضرت مسیح علیہ السلام کی راہ میں جو مشکلات حائل تھیں وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بھی بڑھ چڑھ کر تھیں اور سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ خود بنی اسرائیل اپنے احبار و رہبان کی قیادت میں ان کے خون کے پیاسے اور جان کے لاگو تھے۔ ان یہودی احبار و رہبان کو صاف نظر آ رہا تھا کہ جس مسلکِ حیات کی طرف خدا کا یہ اولوالعزم نبی دعوت دے رہا ہے اس سے ان کی مذہبی سیادت اور پیشوائیت کی مسندیں ہمیشہ کے لئے چھن جائیں گی۔

مصائب و مشکلات کے اس نامساعد ماحول میں مسیح علیہ السلام کی دعوتِ انقلاب کا آغاز ہوا۔ بدقسمتی یہ ہے کہ صدیوں کی تحریفات سے حضرت عیسیٰؑ کی صحیح تعلیم اناجیل سے بمشکل سامنے آتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس رطب و یابس میں پھولوں کی بکھری ہوئی پتیوں کی طرح کہیں کہیں اس آسمانی دعوت کی جھلک موجود ہے جو حضرت عیسےٰ علیہ السلام نے پیش کی۔ چونکہ ہر نبی کی تعلیم (اپنے بنیادی مقاصد کے اعتبار سے) ملوکیت، سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کے استبداد اور قہرمانیوں کے خلاف کھلا چیلنج ہوتی ہے اس لئے اس پیغام میں بھی اسی اعلانِ جنگ کی صدائے بازگشت سنائی دے گی۔

اس سلسلہ میں آپ سب سے پہلے مشہور مؤرّخ (CECIL ROTH) کی مشہور کتاب (A SHORT HISTORY OF THE JEWISH PEOPLE) کا یہ اقتباس سامنے لے آیئے کہ

> حضرت مسیحؑ ان لوگوں میں سے تھے جنہیں رومی اربابِ حکومت نے اس جرم کی پاداش میں حوالۂ دار و رسن کر دیا کہ انہوں نے اپنی قوم کے حقوق و مفاد کی بازیابی کی جرأت کی تھی حضرت

یسوع کے سامنے دو مقاصد تھے۔ ایک طرف آپ مسیحِ موعود ہونے کے مدعی تھے جسے بنی اسرائیل کو غیروں کی غلامی اور محکومی سے چھڑانے کے لئے آنا تھا۔ اور دوسرے انہیں ان اخلاقی اور معاشرتی ضوابط کی پابندی کرانی تھی جو بنی اسرائیل کے مصلحین کی نمایاں خصوصیت تھی۔

(صفحہ ۱۴۰)

اعلانِ جہاد

مسیح علیہ السلام کی تعلیم عاجزی اور بے چارگی اختیار کرنے کی تعلیم نہیں تھی بلکہ یہ ظلم و جبر کی مستبد قوتوں کے خلاف زندگی اور اس کی ہر متاعِ عزیز کی بازی لگا دینے کا اعلان تھا۔ متی کی انجیل اس دعوتِ جہاد کو یوں پیش کرتی ہے۔

یہ نہ سمجھ کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں۔ صلح کرانے نہیں بلکہ تلوار چلانے آیا ہوں۔ کیونکہ میں اس لئے آیا ہوں کہ آدمی کو اس کے باپ سے اور بیٹی کو اس کی ماں سے اور بہو کو اس کی ساس سے جدا کردوں۔ اور اس آدمی کے دشمن اس کے گھر ہی کے لوگ ہونگے۔ جو کوئی باپ یا ماں کو مجھ سے زیادہ عزیز رکھتا ہے وہ میرے لائق نہیں۔ اور جو کوئی اپنی صلیب نہ اٹھائے اور میرے پیچھے نہ چلے، وہ میرے لائق نہیں۔

(متی $\frac{10}{24-38}$)

رفقائے انقلاب کے نام

حضرت مسیحؑ اپنے سرفروش فدائیوں کو جب آسمانی دعوت کی اشاعت و تبلیغ کے لئے روانہ کرتے تو انہیں حسبِ ذیل ہدایات سے مستفید فرماتے تھے۔

اِن بارہ کو یسوع نے بھیجا اور انہیں حکم دے کر کہا کہ غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا۔ بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی بھیڑوں کے پاس جانا اور چلتے چلتے یہ منادی کرنا کہ آسمان کی بادشاہت نزدیک آگئی ہے۔ بیماروں کو اچھا کرنا، مُردوں کو جِلانا ـــ کوڑھیوں کو پاک صاف کرنا، بدروحوں کو نکالنا۔ تم نے مفت پایا مفت دینا۔ نہ سونا اپنے کمربند میں رکھنا نہ چاندی نہ پیسے۔ نہ راستے کیلئے جھولی لینا۔ نہ دو، دو کرتے، نہ جوتیاں، کیونکہ مزدور اپنی خوراک کا حق دار ہے اور جس شہر یا گاؤں میں داخل ہونا، دریافت کرنا کہ اس میں کون لائق ہے اور جب تک وہاں سے روانہ نہ ہو اسی کے ہاں رہو۔ اور گھر میں داخل ہوتے وقت

اسے دعائے خیر دو۔ اور اگر وہ گھر لائق ہو تو تمہارا سلام اسے پہنچے۔ اور اگر لائق نہ ہو تو تمہارا سلام تم پر پھر آئے اور اگر تمہیں کوئی قبول نہ کرے اور تمہاری بات نہ سنے تو اس گھر یا اس شہر سے نکلتے وقت اپنے پاؤں کی گرد جھاڑ دو۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ عدالت کے دن اس شہر کی نسبت سدوم اور عمورہ کے علاقہ کا حال زیادہ برداشت کے لائق ہوگا۔

اس کے بعد فرمایا کہ

دیکھو میں تمہیں بھیجتا ہوں گویا بھیڑوں کو بھیڑیوں کے بیچ میں۔ پس سانپوں کی مانند ہوشیار اور کبوتروں کے مانند بھولے بنو، مگر آدمیوں سے خبردار رہو۔ کیونکہ وہ تمہیں عدالتوں کے حوالے کر دیں گے اور اپنے عبادت خانوں میں تمہارے کوڑے ماریں گے۔ اور تم میرے سبب حاکموں اور بادشاہوں کے سامنے حاضر کئے جاؤ گے تاکہ ان کے اور غیر قوموں کے لئے گواہی ہو۔ لیکن جب وہ تمہیں پکڑوائیں تو فکر نہ کرنا کہ ہم کس طرح کہیں اور کیا کہیں۔ کیونکہ جو کچھ کہنا ہوگا اس گھڑی تمہیں بتایا جائے گا۔ کیونکہ بولنے والے تم نہیں بلکہ تمہارے باپ کا رُوح ہے جو تم میں بولتا ہے۔ بھائی کو بھائی قتل کے لئے حوالے کرے گا اور بیٹے کو باپ۔ بیٹے اپنے ماں باپ کے برخلاف کھڑے ہو کر انہیں مروا ڈالیں گے اور میرے نام کے باعث سب لوگ تم سے عداوت کریں گے مگر جو آخر تک برداشت کرے گا وُہی نجات پائے گا لیکن جب تمہیں ایک شہر میں ستائیں تو دوسرے کو بھاگ جاؤ۔ کیونکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ تم اسرائیل کے سب شہروں میں نہ پھر چکو گے کہ ابنِ آدم آجائے گا۔

(متی ۱۰ / ۱۶ — ۲۳)

یہودی پیشوائیت زلزلے میں

مذہبی اجارہ دار جو اپنی "خدائی" کی مسندیں بچھا کر، خدا اور مذہب کے نام پر، اپنی ہوسناکیوں کے لئے سامانِ تسکین پیدا کرتے ہیں کس طرح دینِ خداوندی کی آسمانی دعوت کو اپنی پیشوائیت کی مفاد پرستیوں کے لئے سامانِ موت سمجھتے ہیں، اس کا اندازہ یہودی علماء و شیوخ کی اس چیخ و پکار سے لگائیے جسے انجیل برنباس میں بالفاظِ ذیل پیش کیا گیا ہے۔

"تب ان لوگوں نے کاہنوں کے سردار کے ساتھ مشورہ کیا اور کہا" اگر یہ آدمی بادشاہ ہوگیا تو ہم کیا

کریں گے۔ البتہ یہ ہم پر بڑی مصیبت ہو گی اس لئے کہ وہ اللہ کی عبادت میں قدیم طریقہ کے موافق اصلاح کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ وہ ہماری تقالید (رسومات) کو باطل کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ تب اس جیسے آدمی کی حکومت کے ماتحت ہمارا کیا انجام ہو گا۔ یقیناً ہم اور ہماری اولاد (سب) تباہ ہو جائیں گے۔ اس لئے کہ ہم اپنی خدمت سے نکال دیئے جائیں گے تو ہم مجبور ہونگے کہ اپنی روٹی خطیہ کے طور پر مانگیں۔"

حالانکہ اس وقت یہ خدا کا شکر ہے کہ ہمارا ایک بادشاہ اور ایک حاکم دونوں ہماری شریعت سے اجنبی ہیں اور ہماری شریعت کی کوئی پروا کرنے والے نہیں، جیسے کہ ہم ان کی شریعت کی کچھ پروا نہیں کرتے اور اسی سبب سے ہم قدرت رکھتے ہیں کہ جو چاہیں وہ کریں۔ پس اگر ہم نے غلطی کی تو ہمارا اللہ رحیم ہے قربانی اور روزہ کے ساتھ اس کا راضی بنا لینا ممکن ہے۔ مگر جب کہ یہ آدمی بادشاہ ہو گیا تو ہرگز راضی بنایا جا سکے گا مگر جب کہ اللہ کی عبادت ویسے ہی ہوتے دیکھے جیسی کہ موسےٰؑ نے لکھی ہے۔　　(انجیل برنباس فصل صفحہ ۱۴۲)

علماء و مشائخ کے کردار کی ایک جھلک

یہ یہودی علماء و مشائخ کس خبثِ باطن کے مظہر اور کس پستی کردار کے پیکر تھے، اس کی تصویر بھی اناجیل کے اوراق میں ملے گی۔ سچ پوچھئے تو مسیح علیہ السلام کا سب سے بڑا "جرم" یہی تھا کہ انہوں نے ان احبار و رہبان کی دسیسہ کاریوں کے خلاف جو اپنے مصنوعی تقدس کے زرّیں نقاب میں نوعِ انسانی کی بدبختی کا سامان بن گئے تھے، صدائے حق بلند کی تھی۔ یہ تنقید کس قدر شدت کا انداز اختیار کئے ہوئے تھی اس کا اندازہ اناجیل کے حسبِ ذیل بیانات سے بخوبی ہو سکے گا۔ سنئے متی کی انجیل میں ہے کہ

اس وقت یسوع نے بھیڑ سے اور اپنے شاگردوں سے یہ باتیں کہیں کہ فقیہہ اور فریسی موسیٰؑ کی گدی پر بیٹھے ہیں۔ پس وہ جو کچھ تمہیں بتائیں وہ سب کرو اور مانو۔ لیکن ان کے سے کام نہ کرو، کیونکہ وہ کہتے ہیں اور کرتے نہیں۔ وہ ایسے بھاری بوجھ جن کا اٹھانا مشکل ہے باندھ کر لوگوں کے کندھوں پر رکھتے ہیں۔ مگر آپ انہیں انگلی سے بھی ہلانا نہیں چاہتے۔ وہ اپنے سب کام لوگوں کے دکھانے کو کرتے ہیں، کیونکہ اپنے تعویذ بڑے بناتے اور اپنی پوشاک کے کنارے چوڑے رکھتے ہیں اور ضیافتوں میں صدر نشینی اور عبادت خانوں میں اعلےٰ درجے کی

کرسیاں اور بازاروں میں سلام اور آدمیوں سے ربّی کہلانا پسند کرتے ہیں۔ مگر تم ربّی نہ کہلاؤ، کیونکہ تمہارا استاد ایک ہی ہے اور تم سب بھائی ہو۔ اور زمین پر کسی کو اپنا باپ نہ کہو، کیونکہ تمہارا باپ ایک ہی ہے جو آسمانی ہے۔ اور نہ تم ہادی کہلاؤ، کیونکہ تمہارا ہادی ایک ہی ہے یعنی مسیحؑ۔ لیکن جو تم میں بڑا ہے وہ تمہارا خادم ہے۔ اور جو کوئی اپنے آپ کو بڑا بنائے گا وہ چھوٹا کیا جائے گا۔ اور جو اپنے آپ کو چھوٹا بنائے گا وہ بڑا کیا جائے گا۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ آسمان کی بادشاہت لوگوں پر بند کرتے ہو۔ کیونکہ نہ تو آپ داخل ہوتے ہو اور نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ ایک مرید کرنے کے لئے تری اور خشکی کا دورہ کرتے ہو۔ اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے تو اُسے اپنے سے دونا جہنم کا فرزند بنا دیتے ہو۔

اے اندھے راہ بتانے والو! تم پر افسوس ہے! جو کہتے ہو کہ اگر کوئی مقدس کی قسم کھائے تو کچھ بات نہیں۔ لیکن اگر مَقدس کے سونے کی قسم کھائے تو اس کا پابند ہوگا۔ اے احمقو! اور اندھو! کون سا بڑا ہے، سونا یا مَقدس جس نے سونے کو مُقدّس کیا؟ اور پھر کہتے ہو کہ اگر کوئی قربان گاہ کی قسم کھائے تو کچھ بات نہیں۔ لیکن جو نذر اس پر چڑھی ہو اگر اس کی قسم کھائے تو اس کا پابند ہوگا۔ اے اندھو! کونسی چیز بڑی ہے؟ نذر یا قربان گاہ۔ جو نذر کو مَقدس کرتی ہے۔ پس جو قربان گاہ کی قسم کھاتا ہے وہ اس کی اور سب چیزوں کی، جو اس پر ہیں قسم کھاتا ہے۔ اور جو مَقدس کی قسم کھاتا ہے وہ اس کی اور اس کے رہنے والے کی قسم کھاتا ہے جو آسمان کی قسم کھاتا ہے وہ خدا کے تخت کی اور اس پر بیٹھنے والے کی قسم کھاتا ہے۔ اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ پودینے اور سونف اور زیرے پر دہ یکی[لے] دیتے ہو اور تم نے شریعت کی زیادہ بھاری باتوں یعنی انصاف اور رحم اور ایمان کو چھوڑ دیا ہے۔ لازم تھا کہ یہ بھی کرتے اور وہ بھی نہ چھوڑتے۔ اے اندھے راہ بتانے والو! جو مچھر کو تو چھانتے ہو اور اونٹ کو

لے۔ دیکھئے استثنا۔ $\frac{۱۴}{۲۲}$ ۔ $\frac{۲۶}{۱۲}$ + احبار $\frac{۲۷}{۳۰ - ۳۲}$

نگل جاتے ہو۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ تم نبیوں کی قبریں بناتے اور راستبازوں کے مقبرے آراستہ کرتے ہو اور کہتے ہو کہ اگر ہم اپنے باپ دادوں کے زمانے میں ہوتے تو نبیوں کے خون میں ان کے شریک نہ ہوتے۔ اس طرح تم اپنی نسبت گواہی دیتے ہو کہ ہم نبیوں کے قاتلوں کے فرزند ہیں۔ غرض اپنے باپ دادوں کا پیمانہ بھر دو۔ اے سانپو! اے افعی کے بچو! تم جہنّم کی سزا سے کیونکر بچو گے۔ اس لئے دیکھو۔ میں نبیوں اور داناؤں اور فقیہوں کو تمہارے پاس بھیجتا ہوں۔ ان میں سے بعض کو قتل کرو گے اور صلیب پر چڑھاؤ گے اور بعض کو عبادت خانوں میں کوڑے مارو گے اور شہر بہ شہر ستاتے پھرو گے تاکہ سب راستبازوں کا خون جو زمین پر بہایا گیا تم پر آئے۔ راستباز ہابیل کے خون سے لے کر برکیاہ کے بیٹے زکریا کے خون تک جسے تم نے مقدس اور قربان گاہ کے درمیان قتل کیا۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ یہ سب کچھ اس زمانے کے لوگوں پر آئے گا۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو جو اوپر سے خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہوئی ہیں۔ اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راستباز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہوئے ہو۔ (متی ۲۲/۱ — ۳۶)

یہ ہے ایک دھندلا سا عکس اس برگزیدہ ہستی کی انقلابی تعلیم کا جو اپنی آسمانی دعوتِ انقلاب اور عظمت سے بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کو نجات دلانے اور مقامِ انسانیت پر فائز کرنے آیا تھا۔ لیکن ملوکیت اور پیشوائیت کی مخصوص مصلحتوں اور مفاد پرستیوں نے اس تعلیم کو نگاہوں سے اوجھل کر دیا اور اپنی پُرفریب تحریفات سے اس انقلاب آفریں شخصیت کے مقام و پیام پر ایسے پردے ڈال دئے کہ اب عیسائیت اپنی مروّجہ تعلیمات کی رو سے خانقاہ نشین زاہدوں، مسکینوں، عاجزوں اور بے بسوں کا مذہب نظر آتی ہے۔ یاد رکھئے! مسیح علیہ السّلام کی پیغمبرانہ دعوت کے جو گوشے ہم نے ان صفحات میں پیش کئے ہیں وہ کسی ایک دور سے وابستہ نہیں۔ ملوکیت، سرمایہ داری اور پیشوائیت ہر دور میں اسی کردار کا مرقّع نظر آئے گی جس کی تصویر ان اقتباسات میں جھلک رہی ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حضور رسالتمآبؐ کی کہانی ــــ خدائے بزرگ کی زبانی

(عیدِ میلاد النبیؐ پر تقریر)

(اکتوبر ۱۹۶۰ء)

غالبؔ ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

خدا نے مخلوق کو پیدا کیا تو اس کی پرورش کا ذمہ بھی خود ہی لیا۔ اسے خدا کی ربوبیت کہتے ہیں۔ حیوانات تک پرورش محض طبیعی زندگی (PHYSICAL LIFE) کی ہوتی ہے۔ اس کے لئے خدا نے صفحہ ارض پر سامانِ رزق کو پھیلا دیا اور ساتھ ہی ہر نوع (SPECIES) کو وہ ہدایات (DIRECTIONS) دے دیں جن کے مطابق وہ سامانِ رزق سے مستفید ہو سکتی ہے۔ یہ ہدایات، ہر نوع کے ہر فرد کے اندر پیدائش کے ساتھ ہی رکھ دی جاتی ہیں۔ انہیں جبلت (INSTINCT) کہتے ہیں۔ یہی وہ جبلت ہے جس کی رُو سے (مثلاً) بطخ کا بچہ انڈے سے نکلتے ہی پانی کی طرف لپکتا ہے اور مرغی کا چوزہ خشکی کی طرف دوڑتا ہے، یا بکری گھاس کھاتی ہے۔ گوشت کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھتی۔ اور شیر گوشت کھاتا ہے گھاس کی طرف تکتا نہیں خواہ وہ بھوکوں کیوں نہ مر جائے۔

انسانی ہدایت کا سرچشمہ

انسان کو دُہری زندگی ملی ہے۔ ایک تو وہی طبعی زندگی (اس کے جسم کی زندگی) جو ہر حیوان کو ملی ہے اور دوسری "انسانی زندگی" جو کسی حیوان کو نہیں ملی۔ جہاں تک اس کی طبعی زندگی کا تعلق ہے انسانی بچے کو بھی اس امر کی ہدایت پیدائش کے ساتھ ہی مل جاتی ہے کہ وہ بھوک کے وقت کس طرح اپنے رزق (دودھ) کے چشموں سے فائدہ اُٹھائے۔ اس چیز کے لئے اسے کسی خارجی ہدایت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن جہاں تک اس کی انسانی زندگی کا تعلق ہے، اس کے لئے انسان کے اندر کوئی ہدایت نہیں ہوتی۔ یہ ہدایت اُسے خارج سے ملتی ہے۔ اس ہدایت کا طریق یہ تھا کہ اللہ تعالےٰ کسی انسان کو یہ ہدایت بذریعہ وحی عطا کرتا تھا۔ (اسے خدا کا نبی یا رسول کہتے ہیں) اور وہ اس ہدایت کو دوسرے انسانوں تک پہنچاتا تھا۔ انسانوں کے لئے اس طریقِ ہدایت کو اختیار کرنے میں ایک خاص مصلحت تھی۔ جو ہدایت کسی کے اندر پیدائشی طور پر رکھ دی جاتی ہے، وہ اس ہدایت کے مطابق چلنے پر مجبور ہوتا ہے۔ بکری گھاس کے کھانے پر اور مچھلی پانی میں تیرنے پر مجبور ہے۔ وہ اس کی خلاف ورزی کر ہی نہیں سکتی۔

لیکن انسان کو خدا نے صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا ہے۔ یہی وہ خصوصیت ہے جس سے یہ حیوانات سے ممتاز ہے۔ اگر یہ ہدایت اس کے اندر رکھ دی جاتی تو یہ بھی (حیوانات کی طرح) اس پر چلنے کے لئے مجبور ہوتا اور اس طرح اس کا اختیار و ارادہ باقی نہ رہتا۔ یعنی یہ بھی حیوانات کی سطح پر آجاتا۔ اس لئے اس کی صورت میں، خدا نے یہ کیا کہ اس کی طرف ہدایت (بذریعہ انبیاء کرامؑ) خارج سے بھیجی اور اس سے کہہ دیا کہ یہ چاہے تو اسے اختیار کرے اور چاہے اس سے انکار کر دے۔ اگر یہ اسے اختیار کرلے گا تو اس کے شرفِ انسانیت کی نشو و نما ہوتی جائے گی۔ اگر یہ اس سے انکار کر دے گا تو حیوانی سطح پر رہ جائے گا اور اس کی زندگی جہنمی ہو جائے گی۔

آخری ہدایت

جن حضرات (انبیاء کرامؑ) کی وساطت سے خدا کی ہدایت دوسرے انسانوں تک پہنچی تھی وہ پہلے خود اس ہدایت پر عمل کرتے تھے اور ان کا یہ عمل دوسروں کے لئے نمونہ بن جاتا تھا۔ آسمانی ہدایت کا یہ سلسلہ حضرت نوحؑ سے شروع ہوا اور نبی آخر الزماں محمد رسول اللہ پر جا کر ختم ہو گیا۔[۱] یعنی خدا نے جو ہدایت نوعِ انسانی کو دینی تھی وہ قرآن کریم میں تکمیل

---

[۱] قرآن کریم نے بتایا ہے کہ آسمانی ہدایت کا یہ سلسلہ اقوامِ عالم میں جاری رہا تھا اور کوئی بستی ایسی نہیں گزری جس میں

(باقی ص۲۴۵ پر)

تک پہنچ گئی جس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا۔ اس لئے اس کے بعد کسی مزید آسمانی ہدایت کی ضرورت نہ رہی اور جب کسی مزید ہدایت کی ضرورت نہ رہی تو کسی ہدایت لانے والے (نبی یا رسول) کی بھی ضرورت نہ رہی۔ **اس لئے قرآنِ کریم خدا کی آخری کتاب اور نبیٔ اکرمؐ خدا کے آخری نبی ہیں۔**

قرآنِ کریم نے جہاں یہ بتایا ہے کہ جو ہدایت اس میں دی گئی ہے اصولی طور پر وہی ہدایت پہلے انبیائے کرامؑ کو بھی دی گئی تھی، اس کے ساتھ ہی اس نے سابقہ انبیائے کرامؑ کی زندگی کے احوال و کوائف بیان کر کے یہ بتایا ہے کہ انہوں نے اس ہدایت کو کس طرح پیش کیا، اس پر کس طرح عمل کر کے دکھایا اور ان کی قوم کی طرف سے ان کی دعوت کا کیا جواب ملا۔ جس طرح اس نے انبیائے سابقہ کے متعلق یہ کچھ بتایا ہے اسی طرح اس نے خود نبی آخر الزماں (ص) کے متعلق بھی یہ کچھ بیان کیا ہے۔ قرآنِ کریم میں یہ کچھ اس شرح و بسط سے بیان ہوا ہے کہ ان درخشندہ موتیوں کو ایک لڑی میں پرو لیا جائے تو اس سے سیرتِ نبیٔ اکرمؐ کی سلکِ گہروار نہایت آب و تاب سے مرتب ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ میں نے اپنی کتاب (معراجِ انسانیت) میں جو بڑے سائز کے قریب نو سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے، حضورؐ کی سیرت کو قرآنی آیات کی روشنی میں مرتب کیا ہے۔ ذیل کی سطور میں اسی تفصیل کو سمٹائی ہوئی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میں اپنی اس کوشش نا تمام کو عید میلاد النبیؐ کی تقریبِ سعید پر تحفۃً پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں۔ میں نے کوشش کی ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ آسان زبان میں پیش کیا جائے، کیونکہ احباب کا تقاضا ہے کہ حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کے قرآنی خط و خال سلیس زبان میں سامنے لانے چاہئیں تاکہ اس سے ہمارا کم تعلیم یافتہ طبقہ بھی مستفید ہو سکے۔

قرآنی سیرت

⁂

نبوت کوئی ایسی چیز نہیں جسے انسان اپنے کسب و ہنر سے محنت کر کے حاصل کر لے۔ یہ خدا کی طرف سے وہبی طور پر ملتی تھی۔ جس ہستی کو یہ خصوصیت عطا کی جانی مقصود ہوتی تھی اس کی شروع سے تربیت

(حاشیہ بقیہ صفحہ ۲۴۴) خدا کا رسولؐ نہ آیا ہو لیکن اس نے تفصیلی طور پر صرف سامی اقوام کے انبیائے کرامؑ ہی کا ذکر کیا ہے، کیونکہ قرآنِ کریم کی اوّلین مخاطب قوم، ان انبیائے کرامؑ سے واقف تھی اور وہ خود بھی سامی اقوام سے تھی۔

خود اللہ تعالیٰ کی زیرِ نگرانی ہوتی تھی۔ اس شخص کو اس کا کوئی علم نہیں ہوتا تھا کہ اسے نبوّت کے لئے تیار کیا جا رہا ہے۔ لیکن اس کی کیفیت یہ ہوتی تھی کہ وہ اپنے زمانے کی غلط باتوں سے متنفر ہوجاتا تھا۔ اسے حقیقت کا علم تو نہیں ہوتا تھا لیکن باطل کی باتوں میں اس کا جی نہیں لگتا تھا۔ وہ تلاشِ حقیقت میں سرگرداں

تلاشِ حقیقت میں سرگرداں

رہتا تھا۔ یہی وہ کیفیت ہے جس سے قرآنِ کریم نے سب سے پہلے نبیٔ اکرمؐ کا تعارف یہ کہہ کر کرایا ہے کہ

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى۔ (۹۳/۷)

ہم نے تجھے (تلاشِ حقیقت میں) سرگرداں پایا تو راستہ دکھا دیا۔

اس کیفیت تک پہنچنے کے لئے ذرا تصوّر میں لائیے اس منظر کو کہ چھٹی صدی عیسوی کا زمانہ ہے۔ سرزمینِ حجاز کا سب سے بڑا اور مشہور شہر مکّہ، اپنی تمام جاذبیتوں کے ساتھ، وہاں کے باشندوں اور باہر والوں کے لئے مرکزِ توجّہ بن رہا ہے۔ اس توجّہ کی بنیادی وجہ خانۂ کعبہ ہے جس کا حقیقی مقصد تو ان کی نگاہوں سے اوجھل ہوچکا ہے، لیکن اس کی عقیدت لوگوں کو دُور دُور سے اس کی طرف کھینچے لئے آتی ہے۔ یہ لوگ فرطِ عقیدت میں اس کے گرد جمع ہیں۔ کوئی تالیاں پیٹتا ہے، کوئی سیٹیاں بجاتا ہے۔ کوئی جذب و کیف کے عالم میں اس کے گرد گھومتا ہے۔ کوئی ناچتا ہے کوئی کودتا ہے۔ کوئی بتوں کے استھانوں پر جانور ذبح کرکے ان کا گرم گرم لہو پی رہا ہے۔ کوئی زمزم کے کنارے بیٹھا مصروفِ بادہ پرستی ہے ـــــ کاہنوں کے گرد عورتوں کا ہجوم ہے جو اُن سے اپنے فسانۂ عشق و محبت کا انجام معلوم کرنا چاہتی ہیں۔ ادھر عکاظ کے بازار میں شعرائے جادُو بیاں اپنی سحر آفرینیوں سے سننے والوں کی ناک میں نکیل ڈالے جس وادی میں چاہے لئے لئے پھرتے ہیں۔ وہ کسی کے دل میں افسونِ محبت پھونکتے ہیں اور کہیں آتشِ انتقام کے شعلے بلند کرتے ہیں۔

لیکن مکّہ کی انہی گلیوں میں ایک ایسا شخص بھی دکھائی دیتا ہے جو ان میں سے ہوتے ہوئے بھی ان کا نظر نہیں آتا۔ اسے حریمِ کعبہ کی ان ہنگامہ آرائیوں میں کوئی جاذبیت دکھائی دیتی ہے نہ عکاظ کی رستاخیزیوں میں کوئی کشش ـــــ وہ اَن پڑھ ہے لیکن عیسائی راہبوں اور یہودی عالموں کے پاس جاتا ہے کہ شاید انہی سے حقیقت کا سراغ مل جائے۔ وہ وہاں سے دل برداشتہ اٹھتا ہے تو صحرا کی کھلی فضاؤں میں چلا جاتا

عروسِ حقیقت کی بے نقابی

ہے اور کائنات کی نیرنگیوں پر غور و فکر کرتا ہے۔ غرضیکہ وہ انسانوں کی ہر مجلس میں جاتا اور کائنات کے ہر گوشے میں گھومتا ہے کہ کہیں اسے وہ شے مل جائے جس کا اُسے خود بھی علم نہیں کہ وہ کیا ہے لیکن ہر مقام سے یہ کہتا ہوا ناکام لوٹتا ہے کہ

تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی

وہ اسی طرح مضطرب و بے قرار پھرتا ہے کہ ایک شب لیلائے حقیقت یک بیک اس کے سامنے نمودار ہو جاتی ہے اور اپنے حسین چہرے سے یوں نقاب اٹھاتی ہے کہ اس کے تبسم سے کائنات جگمگا اُٹھتی ہے۔ یہ رمضان کا مہینہ تھا (۱؎ ۲/۱۸۵) اور ایسی مبارک رات جس میں خدا کی حکمتِ بالغہ سے حق و باطل نکھر کر الگ الگ ہو گئے اور نوعِ انسانی کو زندگی کی نئی اقدار مل گئیں۔ (۴۴/۴-۲، ۹۷/۱) ۲؎۔

یوں خدا کی وحی اس پہ نازل ہوئی جو جانتا ہی نہیں تھا کہ کتاب کسے کہتے ہیں اور ایمان کیا ہوتا ہے۔

عطائے وحی

وَكَذٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا ۚ مَا كُنتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ وَلٰكِن جَعَلْنَاهُ نُورًا نَّهْدِي بِهِ مَن نَّشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا ۚ وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۙ (۴۲/۵۲)۔

نہ وہ جانتا تھا اور نہ ہی اسے اس کی کوئی توقع تھی۔

وَمَا كُنتَ تَرْجُو أَن يُلْقَىٰ إِلَيْكَ الْكِتَابُ إِلَّا رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ (۲۸/۸۶)۔

وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُن تَعْلَمُ ...... (۲۸/۸۶)

یوں اس متلاشیِ حقیقت کو نبوّت عطا ہو گئی اور اسے وہ کچھ سکھا دیا گیا جسے وہ پہلے نہیں جانتا تھا۔

یہ حاملِ نبوّت یتیم بھی تھا اور غریب بھی۔ (أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوَىٰ ..... وَوَجَدَكَ

۱؎ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ۔ (۲/۱۸۵)

۲؎ إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةٍ مُّبَارَكَةٍ ۚ إِنَّا كُنَّا مُنذِرِينَ ۔ فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ ۙ (۴۴/۴-۳) إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ (۹۷/۱)۔

عَآئِلاً فَاَغْنٰی .... (۹۳ / ۸-۳۰) ۔ نیز نبوت سے پہلے، اَن پڑھ بھی (وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ ...... (۲۹ / ۴۸)۔

یوں اس بے یار و مددگار، یتیم، غریب اور نادار، اَن پڑھ، صحرا نشین کو تمام عالمِ انسانیت کا سب سے بڑا معلّم بننے کے لئے منتخب کیا گیا۔

عام طور پر خیال کیا جائے گا کہ جب اس شخص نے وہ کچھ پا لیا جس کی اُسے تلاش تھی تو پھر وہ زندگی کے باقی دن آرام و سکون سے بیٹھ رہا ہوگا۔ اس لئے کہ جب مقصد حاصل ہو جائے تو پھر جدّ و جُہد ختم ہو جاتی ہے۔ عام طور پر تو یہی ہوتا ہے۔ لیکن نبی کی کیفیّت عام لوگوں سے بالکل الگ ہوتی ہے۔ اسے

نبوّت کی ذمّہ داریاں

نبوّت تو بلا مزد و معاوضہ ملتی ہے لیکن اس پر ذمّہ داریاں اس قدر عائد کی جاتی ہیں جن سے اس کی کمر ٹوٹ جاتی ہے۔ (وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۔ (۹۴ / ۲-۳) چنانچہ منصب نبوّت پر سرفراز کئے جانے کے بعد، نبیِ اکرم سے کہا گیا کہ يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۙ اے وہ کہ جس کے ذمّہ نظامِ عالم کو درست کرنا ہے۔ قُمْ فَاَنْذِرْ ۙ اُٹھ اور لوگوں کو غلط نظامِ زندگی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کر وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۙ (۷۴ / ۱-۳)۔ اور ساری دنیا میں اعلان کر دے کہ

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بُتانِ آذری!

ظاہر ہے کہ جس دعوت سے مراد یہ ہو کہ انسانوں کے نظامِ کہن کی بساط اُلٹ کر اس کی جگہ ایک جدید نظام قائم کیا جائے اس دعوت کی مخالفت ہر طرف سے ہوگی۔

دنیا کا عام قاعدہ یہ ہے کہ جو شخص غیروں کی مخالفت مول لیتا ہے وہ اپنوں کو اپنے ساتھ ضرور رکھتا ہے۔ اس کا اپنا قبیلہ اور خاندان ہوتا ہے جو دوسروں کی مخالفت میں اس کا پشت پناہ بنتا ہے۔ وہ انہی کی مدد اور حمایت کے بھروسہ پر دوسروں کے خلاف اُٹھتا ہے۔ لیکن آسمانی انقلاب کے داعی کا انداز، اس باب میں بھی دنیا جہان سے نرالا ہوتا ہے۔ اس سے کہا جاتا ہے کہ اس دعوت کا آغاز ہی اپنے خاندان اور قبیلے سے کرو۔

سلسلۂ دعوت

وَ اَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ (۲۶/۲۱۴)
"اے رسولؐ! اپنے قریبی رشتہ داروں کو، ان کی غلط روش کے نتائج سے آگاہ کرو"۔ اس کے بعد آگے بڑھو اور سارے اہلِ مکہ اور اس کے گرد و نواح کی آبادیوں تک اس دعوت کو پہنچاؤ۔ (وَ كَذٰلِكَ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَ مَنْ حَوْلَهَا...... (۴۲/۷) اس کے بعد اس سلسلہ کو اور وسیع کرو اور پوری کی پوری عرب قوم کو اس کے دامن تلے لے آؤ۔

كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِیْۤ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَاۤ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَاۡ عَلَیْهِمُ الَّذِیْۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ وَ هُمْ یَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ ... (۱۳/۳۰)

اور اسی طرح ہم نے تجھے ایک ایسی قوم کی طرف بھیجا ہے جس سے پہلے بہت قومیں ہو گزری ہیں۔ (بھیجا اس لئے ہے) تاکہ جو بات تجھ پر وحی کی گئی ہے تو اسے ان کے سامنے پیش کر دے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خدائے رحمٰن کا انکار کرتے ہیں (تو انہیں اس پر ایمان کی دعوت دے)۔

اور اس کے بعد اس سلسلے کو ایسا حدود فراموش کر دے کہ یہ تمام نوعِ انسانی کو اپنے آغوش میں لے آئے۔

قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا (۷/۱۵۸)۔

تو عالمِ انسانیت کو پکار کر کہہ دے کہ میں تم سب کی طرف خدا کا رسول ہوں۔

یہ تھیں وہ عظیم ذمہ داریاں جو نبوت عطا ہونے پر اس ذاتِ گرامیؐ پر عائد کی گئیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ

یہ دعوت کیا تھی؟

دعوت کیا تھی جسے اس طرح عام کرنے کے لئے اس قدر تاکید کی جا رہی تھی؟ یہ دعوت کوئی نئی دعوت نہیں تھی یہ وہی دعوت تھی جو ہر آسمانی انقلاب لانے والے (نبیؑ) کے ذریعہ انسانوں تک پہنچائی گئی تھی یعنی یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ـــ (۷/۵۹) حکومت صرف خدا کے قوانین کی اختیار کرو۔ اس کے سوا کوئی ہستی ایسی نہیں جس کے سامنے سر جھکایا جائے۔ یعنی

لَاۤ اِلٰهَ ـــ اِلَّا اللّٰهُ

دیکھنے میں تو یہ چار لفظ ہیں لیکن ان میں کائنات کے چاروں گوشے سمٹ کر آگئے ہیں۔ اس کا مطلب

یہ ہے کہ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ ط (۱۲/۴) خدا کے سوا کسی کو حق حاصل نہیں کہ انسانوں پر اپنا حکم چلائے۔ دنیا میں اقتدار صرف قوانینِ خداوندی کا ہے۔ اس کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار و اختیار نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دعوت تھی محکوموں کو حاکموں کے استبداد سے نجات دلانے کی۔ یہ دعوت تھی مظلوموں کو ظالموں کے ظلم سے رہائی دلانے کی۔ یہ دعوت تھی ان زنجیروں کو توڑنے کی جن میں ناتواں انسانیت جکڑی چلی آرہی تھی اور اس کے سر سے اس بوجھ کو اتارنے کی جس کے نیچے وہ بُری طرح کچلی جا رہی تھی۔ (وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْهِمْ۔ (۷/۱۵۷)

اعلانِ جنگ

اور دوسری طرف یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ دعوت، دنیا کے ہر صاحبِ اقتدار و ذی اختیار کے خلاف اعلانِ جنگ تھی۔ اس لئے ان کا اس دعوت کے خلاف محاذ پر اُٹھ کھڑے ہونا بالکل فطری تھا۔ اس میں ایک طرف اربابِ حکومت تھے تو دوسری طرف مذہبی پیشوائیت کے علمبردار۔ دائیں کو سرمایہ داروں کا گروہ تھا، تو بائیں طرف فریب کاروں کا۔ وَکَذٰلِکَ جَعَلْنَا لِکُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِیْنَ ط (۲۵/۳۱)۔ "اور اس طرح انسانیت کی عدالت کے مجرمین آسمانی دعوت لانے والے نبی کی مخالفت کے لئے اُٹھ کھڑے ہوتے تھے"۔ یہ سرکشی اور مخالفت اس لئے ہوتی تھی کہ وہ سمجھتے تھے کہ ہمارے پاس بڑی دولت ہے اور ہمارا جتھہ بھی بہت بھاری ہے اس لئے ہم پر کون ہاتھ ڈال سکتا ہے؛ وَقَالُوْا نَحْنُ اَکْثَرُ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ (۳۴/۳۵)۔ قرآن انہیں مترفین کا گروہ کہہ کر پکارتا ہے، یعنی وہ تن آسان جو دوسروں کی کمائی پر عیش اڑائیں۔ آسمانی انقلاب کی دعوت جب اور جہاں بھی بلند ہوئی اس طبقہ کی طرف سے اس کی مخالفت ہوئی۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ کٰفِرُوْنَ۔ (۳۴/۳۴) ہم نے کسی بستی میں کوئی نذیر نہیں بھیجا کہ وہاں کے تن آسان خوشحال طبقہ کی طرف سے اس کے پیغام کی مخالفت نہ ہوئی ہو"۔ یہی وہ طبقہ

مخالفت

تھا جس کی طرف سے نبی اکرمؐ کی دعوت کی مخالفت ہوئی۔ اسی طبقہ کا وہ نمائندہ تھا جس کے متعلق خدا نے کہا ہے کہ وَجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا وَّ بَنِیْنَ شُهُوْدًا (۷۴/۱۲-۱۳) ہم نے اسے فراواں دولت اور (کثیر) بیٹے دیئے تھے جو وہاں موجود تھے۔ وَمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِیْدًا (۷۴/۱۴)" اور میں نے اس کے تمام معاملات درست کر رکھے تھے بڑا ساز و سامان دے رکھا تھا۔ یہی تھا

جس نے یہ پروپیگنڈہ شروع کر رکھا تھا کہ فَقَالَ اِنْ ھٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ یُّؤْثَرُ - اِنْ ھٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ (۲۴-۲۵ / ۷۴) یعنی رسول اللہؐ کا یہ دعویٰ کہ انہیں خدا کی طرف سے وحی ملتی ہے غلط ہے۔ یہ (معاذ اللہ) جھوٹ ہے جو یونہی چلا آ رہا ہے۔ یہ صرف انسانی کلام ہے۔ چنانچہ کبھی آپ کو ساحر کہا گیا اور کبھی کذاب، کبھی شاعر کبھی مجنون۔ وہ اس کی مخالفت دلیل و برہان کی رُو سے نہیں کر سکتے تھے اس لئے وہ عوام کو یہ کہہ کر بھڑکاتے تھے کہ یہ شخص تمہیں تمہارے اسلاف کے مسلک سے برگشتہ کرنا چاہتا ہے۔ یہی ان کی دلیل تھی اور یہی برہان۔ وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ - (۲۳ / ۴۳) "اے رسولؐ! جس طرح آج مکہ کے سردار تمہاری مخالفت میں سرگرم ہیں، اسی طرح تجھ سے پہلے بھی ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ ہم نے جس آبادی کی طرف اپنا رسول بھیجا تو وہاں کے مترفین نے یہ کہہ کر اس کی مخالفت کی کہ ہم اس نئی دعوت کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ ہم نے اپنے اسلاف کو ایک روش پر چلتے دیکھا ہے اور ہم انہی ... کے نقوشِ قدم کی پیروی کرتے چلے جائیں گے۔ لیکن انہیں اس دلیل کی کمزوری کا احساس تھا اور اس امر کا یقین تھا کہ جس شخص نے ایک مرتبہ بھی قرآن کو توجہ سے سن لیا تو وہ ضرور اس پر ایمان لے آئے گا۔ اس لئے وہ اپنے لوگوں کو تاکید کرتے تھے کہ لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ (۲۶ / ۴۱) اس قرآن کو مت سنو۔ جہاں اس کی تعلیم دی جا رہی ہو وہاں شور مچا دو۔ یہی ایک طریق ہے جس سے شاید تم اس تحریک پر غالب آسکو۔

قرآن مت سنو

قرآن کے متعلق تو وہ یہ کہتے اور خود رسول اللہؐ کے متعلق لوگوں کو یہ کہہ کر بہکاتے کہ ذرا دیکھو تو سہی! یہ کس قسم کا رسول ہے کہ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ - عام لوگوں کی طرح کھاتا پیتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ رسول کو عام انسانوں سے الگ قسم کا ہونا چاہیئے۔ اس کے پاس فوق الفطرت قوتیں ہونی چاہئیں۔ اگر اس پر خدا کی وحی نازل ہوتی ہے تو لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا - (۷ / ۲۵) ایسا کیوں نہ ہوا کہ اس کے پاس کوئی فرشتہ آتا اور وہ اس کے ساتھ لوگوں کو ان کی غلط روش کے نتائج سے آگاہ کرتا۔ اس طرح ساری دنیا دیکھ لیتی کہ واقعی اس کی طرف فرشتے خدا کا پیغام لے کر آتے ہیں؟

وہ تو ہم پرستی کا زمانہ تھا۔ اس لئے لوگوں کا ان کے اس معیار سے میں آجانا لازمی تھا۔ چنانچہ لوگ حضورؐ کے پاس آتے اور آپؐ سے کہتے کہ آپ کے پاس اس کا ثبوت کیا ہے کہ آپؐ خدا کے رسول ہیں۔ آپؐ

سب سے بڑا معجزہ

ان کی ان باتوں کو صبر و سکون سے سنتے اور ایک تبسم جاں نواز سے ان سے کہتے کہ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ۔ (۱۰/۱۶)۔ میں کہیں باہر سے نہیں آیا کہ تمہیں میرے متعلق کچھ علم نہ ہو۔ میں نے اس دعویٰ نبوت سے پہلے ایک عمر تمہیں لوگوں میں گزاری ہے۔ کیا تم اس سے اندازہ نہیں لگا سکتے کہ میں اپنے دعویٰ میں سچا ہوں یا جھوٹا؟ کیا میری زندگی تمہیں یہی بتاتی ہے کہ میں جھوٹا اور فریب کار ہوں؟ تم ذرا عقل و فکر سے کام لو اور سوچو کہ جھوٹے کی زندگی ایسی ہی ہوتی ہے؟

اس کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ یہ وہ معجزہ تھا جس کے سامنے سب کی نگاہیں جھک جاتی تھیں۔ لیکن مفاد پرست گروہ کے دل میں اس سے مخالفت کی آگ اور بھی زیادہ تیز ہو جاتی تھی۔ چنانچہ انہوں نے الزام تراشی اور تہمت بافی سے آگے بڑھ کر، دست درازی بھی شروع کر دی۔ قرآن کریم نے اس مخالفت کی تفصیل کو چار لفظوں کے اجمال میں یوں سمٹا دیا ہے کہ وَأَنَّهُ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللَّهِ يَدْعُوهُ كَادُوا يَكُونُونَ عَلَيْهِ لِبَدًا۔ (۷۲/۱۹)۔ "اور جب اللہ کا یہ بندہ خدا کو پکارنے کے لئے اٹھا تو قریب تھا کہ مخالفین چاروں طرف سے یورش کر کے اس سے لپٹ جائیں۔

جوں جوں ادھر سے مخالفت کی شدت بڑھتی جاتی تھی، خدا کی طرف سے آپؐ کو استقامت اور استقلال کی تاکید زیادہ ہوتی جاتی تھی۔ کبھی کہا جاتا اِصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ ——— (۳۸/۱۷) جو کچھ یہ تم سے کہتے ہیں

استقامت کی تلقین

اس پر استقلال و استقامت کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ ۖ وَلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِينَ لَا يُوقِنُونَ (۳۰/۶۰)۔ تم اپنے مشن کو آگے بڑھانے میں مستقل مزاجی سے کام لو اور اس حقیقت پر یقین رکھو کہ خدا نے تم سے جو وعدہ کر رکھا ہے کہ آخر الامر تمہارا مشن کامیاب ہوگا وہ بالکل سچا ہے اور یاد رکھو تم سے کوئی ایسی بات سرزد نہ ہونے پائے جس کی وجہ سے تم ان مخالفین کی نظروں میں ہلکے ہو جاؤ۔ استقامت سے کام لو اور ان کی حرکات سے دل برداشتہ ہو کر اپنی کوششوں میں کمی نہ ہونے دو جن سے تم ان لوگوں کو تباہی سے بچانا چاہتے ہو۔ وَذَكِّرْ بِهِ أَن تُبْسَلَ نَفْسٌ بِمَا كَسَبَتْ (۶/۷۰)۔ اور قرآن کے ذریعہ

لوگوں کو نصیحت کرتے رہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی انسان اپنی بدعملی کی وجہ سے ہلاکت میں چھوڑ دیا جائے۔ فَلِذٰلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ (۴۲/۱۵)۔ تو اسی طرح انہیں صحیح نظامِ زندگی کی طرف دعوت دیتا رہ اور جیسا کہ تجھے حکم دیا گیا ہے استقامت و عزیمت سے اس راہ پر جا رہ اور ان مخالفین کی خواہشات کا اتباع مت کر۔ وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ وَاصْبِرْ (۱۰/۱۰۹) جو کچھ تجھ پر وحی کیا جاتا ہے اس کا اتباع کئے جاؤ اور اپنی راہ پر استقامت سے قائم رہو، تم بھی اور وہ لوگ بھی جو اپنی غلط روش کو چھوڑ کر تمہارے ساتھ ہو لئے ہیں۔ فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ۔ (۱۱/۱۱۲) ثابت قدم رہو اور اپنی تگ و تاز کو تیز تر کرتے جاؤ۔ فَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوبِهَا ۖ وَمِنْ آنَاءِ اللَّيْلِ فَسَبِّحْ وَأَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضَىٰ۔ (۲۰/۱۳۰) جو کچھ تیرے خلاف کہتے (اور کرتے) ہیں تم اس پر ہمت نہ ہارو۔ ثابت قدم رہو اور اپنے نشو و نما دینے والے کے پروگرام کو وجہِ حمد و ستائش بنا کر دکھانے میں پوری تگ و تاز سے کام لو، صبح شام، راتوں کے اوقات میں، اطرافِ نہار میں، غرضیکہ دن رات اس پروگرام کی تکمیل میں مصروفِ جدّ و جہد رہو، تاکہ اس طرح تم اس کے خوشگوار نتائج کو اپنے سامنے دیکھ کر خوش ہو جاؤ۔

جب مخالفین نے دیکھا کہ اتنی شدید مخالفت کے باوجود، اس جماعت کی تگ و تاز میں کوئی فرق نہیں آتا اور یہ تحریک آگے ہی بڑھتی جا رہی ہے تو جیسا کہ بساطِ سیاست کے مہرہ بازوں کا قاعدہ ہے،

مفاہمت کی کوشش

انہوں نے چاہا کہ آپؐ سے مفاہمت (COMPROMISE) کر لی جائے۔ وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُونَ (۶۸/۹) ان کی یہ خواہش ہے کہ اگر تم کچھ مداہنت برتو، اپنے مقام سے تھوڑا سا پھسل جاؤ، تو یہ بھی مداہنت سے کام لیں۔ ظاہر ہے کہ قرآنی نظام میں ان لوگوں کی مفاد پرستیوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ یا تو باہمی مفاہمت سے اس نظام کی جگہ کوئی دوسرا نظام قائم کر لیا جائے، یا قرآنی نظام میں ایسی تبدیلی کر دی جائے جس سے ان کی مفاد پرستیوں کے لئے کچھ گنجائش نکل آئے۔ وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ ۙ قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا ائْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَٰذَا أَوْ بَدِّلْهُ (۱۰/۱۵) جب ان کے سامنے ہمارے واضح قوانین پیش کئے جاتے ہیں تو جو لوگ ہمارے سامنے آنے کی امید نہیں رکھتے، وہ کہتے

ہیں کہ اس قرآن کے بجائے کوئی دوسرا قرآن لاؤ یا اس میں ہماری حسبِ منشاء تبدیلی کردو، تو پھر ہم آپؐ سے مصالحت کرلیں گے۔ اس "بیشکش" کے جواب میں آپؐ سے کہا گیا کہ فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِينَ (۶۸/۸)۔ ان جھٹلانے والوں کی بات ہرگز نہ ماننا۔ وَلَا تَرْكَنُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا ...... (۱۱/۱۱۳) ان ظالمین کی طرف ذرا سا بھی نہ جھکنا۔ ان سے کہہ دو کہ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِن تِلْقَاءِ نَفْسِي ۖ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ ۖ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ —— (۱۰/۱۵)۔ میری کیا بساط ہے کہ میں اپنی طرف سے قرآن میں کوئی ردّ و بدل کرسکوں۔ میرا منصب یہ ہے کہ میں اس کا اتباع کروں جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے اور اس کے علاوہ اور کسی چیز کا اتباع نہ کروں۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں ایک سخت مصیبت کے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں —— یہ بات کسی ضد کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ اس لئے تھی کہ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ وَمَن فِيهِنَّ ۔ (۲۳/۷۱) اگر حق لوگوں کے خیالات اور خواہشات کے پیچھے چلنے لگ جائے تو ارض و سموٰت اور جو کچھ اس کے اندر ہے درہم برہم ہو جائے۔ لہٰذا حق کی باطل کے ساتھ مفاہمت نہیں ہوسکتی۔ البتہ ان سے ایک بات کہی جاسکتی ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ جس روش پر یہ چل رہے ہیں وہ خوشگواریوں اور کامیابیوں کی روش ہے۔ تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ وہ روش تباہیوں اور بربادیوں کی طرف لے جانے والی ہے۔ زندگی کی کامرانیوں کا ضامن وہ پروگرام ہے جس کی طرف تم دعوت دیتے ہو۔ وَقُل لِّلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنَّا عَامِلُونَ ۔ وَانتَظِرُوا إِنَّا مُنتَظِرُونَ ۔ (۱۱/۱۲۱-۱۲۲) ان لوگوں سے جو تمہاری بات کا یقین نہیں کرتے یہ کہو کہ تم اپنے پروگرام پر عمل پیرا رہو اور ہمیں اپنے پروگرام پر عمل کرنے دو۔ اس کے بعد تم بھی انتظار کرو اور ہم بھی انتظار کرتے ہیں۔ نتائج خود بتائیں گے کہ حق و صداقت کی راہ کون سی ہے؟

اس کے ساتھ ان سے یہ بھی کہو کہ إِنَّمَا أَعِظُكُم بِوَاحِدَةٍ ۖ میں تم سے صرف ایک بات کی نصیحت کرنا چاہتا ہوں۔ أَن تَقُومُوا لِلَّهِ مَثْنَىٰ وَفُرَادَىٰ ۔ اور وہ یہ ہے کہ تم زیادہ نہیں تو ایک ایک، دو دو کرکے اللہ کے لئے کھڑے ہو جاؤ۔ ثُمَّ تَتَفَكَّرُوا ۔ اور اپنے جذبات سے الگ ہٹ کر جن میں تم اس وقت اندھا دھند بہے چلے جا رہے ہو، سوچ و غور و فکر کرو۔ اگر تم نے

سوچو

خالی الذہن ہو کر سوچنے کی کوشش کی تو تم خود بخود اس نتیجہ پر پہنچ جاؤ گے کہ مَا بِصَاحِبِکُمْ مِّنْ جِنَّۃٍ۔ (۳۴/۴۶) ۔ تمہارا یہ ساتھی پاگل نہیں ہے۔ یہ جو کچھ کہتا ہے یہ بڑی سمجھ بوجھ کی بات کہتا ہے۔ اس کے ماننے میں تمہارا ہی بھلا ہے ـــــ مَا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مِنْ اَجْرٍ (۲۵/۵۷) میں تو تم سے اس کا کوئی معاوضہ بھی نہیں مانگتا۔

اس سے بہت سے سعادت مند افراد نے، رفتہ رفتہ ادھر آنا شروع کر دیا، اور اس جماعت میں ترقی ہونی شروع ہو گئی۔ ان کے سامنے بہت بڑا پروگرام تھا۔ غلط معاشرہ کی جگہ ایک جدید معاشرہ کا قیام، جس میں مفاد پرستوں کی ہوس رانیوں کے لئے کوئی گنجائش نہ ہو۔ کوئی چھوٹا کام نہ تھا۔ قدوسیوں کا یہ مختصر سا گروہ دن رات اسی فکر میں غلطاں و پیچاں اور اسی مقصد کے حصول کے لئے جنباں و کوشاں رہتا تھا۔ اس باب میں اس کی شدّتِ شوق خود فراموشی تک پہنچ جاتی تھی جسے روکنے کے

دن رات کا پروگرام

لئے خود دستِ قدرت کو اس قافلۂ رشد و ہدایت کے ہدی خواں کی دامن کشی یہ کہہ کر کرنی پڑی تھی کہ یٰٓاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ۔ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا۔ نِّصْفَہٗٓ اَوِانْقُصْ مِنْہُ قَلِیْلًا۔ (۷۳/۱-۳) راتوں کو تھوڑا جاگا کرو، نصف شب تک یا اس سے کم و بیش، اس لئے کہ ابھی تو آغازِ سفر ہے۔ اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْکَ قَوْلًا ثَقِیْلًا۔ (۷۳/۵) تجھ پر بہت بڑی ذمّہ داری ڈالی جانے والی ہے۔ اور اِنَّ لَکَ فِی النَّھَارِ سَبْحًا طَوِیْلًا۔ (۷۳/۷)۔ تجھے دن کو کون سا آرام کا وقت مل جاتا ہے۔ اس میں بھی تمہارا پروگرام لمبا چوڑا ہوتا ہے۔

جوں جوں یہ پروگرام قرار گیر ہوتا جا رہا تھا، مخالفین کی ایذا رسانیاں شدید تر ہوتی جا رہی تھیں۔ عام لوگوں کو مخالفین پر غصہ آتا ہے اور ان کے خلاف آتشِ انتقام تیز ہوتی جاتی ہے۔ لیکن نبی کی کیفیت اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ ـــــــــــــــــــــــ

جیسے ایک طبیبِ مشفق کو نادان مریض کی بے احتیاطی اور بدپرہیزی سے دکھ ہوتا ہے، اسی طرح ان مخالفین کی ضد اور ہٹ دھرمی پر نبی اکرمؐ کا جی کڑھتا تھا اور اس تصوّر سے آپ کا دل خون ہو جاتا تھا کہ یہ نادان محض تعصّب اور جہالت کی وجہ سے کس طرح اپنے آپ کو تباہیوں اور بربادیوں کے جہنم کی طرف کشاں کشاں لئے جا رہے ہیں۔ حضورؐ کی شدّتِ احساس کی یہ کیفیت تھی کہ خود اللہ تعالیٰ کو یہ

مخالفین سے ہمدردی

کہنا پڑا کہ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ (۲۶/۳) ایسا نظر آتا ہے کہ تم اس غم میں کہ یہ لوگ حق وصداقت کی راہ کو تسلیم نہیں کرتے، اپنی جان ہلاک کر لو گے۔ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرَاتٍ (۳۵/۸) ایسا نہ ہو کہ ان لوگوں کی حالت، پر غم کھانے سے تم اپنی جان گنوا بیٹھو۔ فَإِنْ أَعْرَضُوا فَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا ۖ إِنْ عَلَيْكَ إِلَّا الْبَلَاغُ (۴۲/۴۸) اگر یہ لوگ اس راہ سے اعراض برتتے ہیں تو ہم نے تجھے اُن کا محافظ بنا کر نہیں بھیجا۔ تمہارے ذمہ بس اتنا ہی ہے کہ تم اس پیغام کو ان تک پہنچا دو۔ ہم نے انہیں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت عطا کی ہے اور اپنا راستہ آپ اختیار کرنے کی استعداد بخشی ہے۔ ماننا نہ ماننا ان کا اپنا کام ہے۔ فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنتَ مُذَكِّرٌ لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ (۸۸/۲۲-۲۱) تم انہیں حقیقت کی یاد دہانی کراتے رہو۔ تمہارا فریضہ یاد دہانی کرانا ہے۔ تم ان پہ داروغہ نہیں مقرر کئے گئے۔

یہ سلسلہ جاری رہا تاآنکہ وہ وقت آ پہنچا جب دیکھ لیا گیا کہ ان میں سے جن لوگوں نے عقل وفکر اور دلیل وبرہان کی رُو سے صحیح راستہ اختیار کرنا تھا وہ اس جماعت میں شامل ہو گئے اور باقی وہ رہ گئے ہیں جن پر پند ونصیحت کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (۲/۶)۔ انہیں ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج

اعراض

سے آگاہ کیا جائے یا نہ کیا جائے ان کے لئے یکساں ہے۔ جو شخص خودکشی کرنے پر تلا بیٹھا ہو، اس سے یہ کہنا کہ دیکھنا راستے میں کھائی ہے، بے کار ہے۔ جو شخص حیوانی سطحِ زندگی ...... (PHYSICAL LIFE) ہی کو زندگی سمجھتا ہے اور انسانی زندگی کو تسلیم نہیں کرتا اور باوجود ہر طرح سمجھانے کے اپنی ضد نہیں چھوڑتا، اسے انسانی سطحِ زندگی کے اصول وقوانین کی تلقین کیا فائدہ پہنچا سکتی ہے۔ لہٰذا اس مقام پر حضورؐ سے کہا گیا کہ فَأَعْرِضْ عَن مَّن تَوَلَّىٰ عَن ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ إِلَّا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا (۵۳/۲۹) سو جو شخص ہمارے قوانین سے رُوگردانی کرتا ہے اور طبعی زندگی کے سوا اور کچھ ارادہ ہی نہیں رکھتا اس سے تم اعراض برتو۔ فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلَامٌ ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ (۴۳/۸۹) ان سے الگ ہو جاؤ اور کہہ دو کہ میرا اب سلام ہے۔ عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا کہ جو کچھ تم کہتے تھے وہ کس طرح حرفاً حرفاً ٹھیک تھا۔

لیکن ان مخالفین کا جوشِ انتقام اس کے باوجود ٹھنڈا نہ ہوا اور وہ حضورؐ کے خلاف طرح طرح کی سازشیں کرنے لگے۔ وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ؕ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ

حضورؐ کے خلاف سازشیں

اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۔ (۸/۳۰)۔ (اور اے رسولؐ! وہ وقت یاد کر جب، مخالفین تیرے خلاف اپنی خفیہ تدبیروں میں لگے ہوئے تھے تاکہ تجھے گرفتار کرلیں یا قتل کر ڈالیں یا جلاوطن کردیں۔ وہ اپنی تدبیروں میں لگے ہوئے تھے اور خدا اپنی تدبیر کررہا تھا اور (یہ ظاہر ہے کہ) خدا بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔

چنانچہ اس تدبیر کے مطابق حضورؐ نے مکہؔ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی جہاں کی فضا کے متعلق علم تھا کہ وہ نظامِ خداوندی کی تشکیل کے لئے زیادہ سازگار رہے۔ ہجرت سے یہی مقصود ہوتا ہے، اسی لئے مکہ چھوڑتے وقت حضورؐ کے لب پر یہ دعائیں تھیں کہ (وَقُلْ) رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ

ہجرت

مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا ۔ (۱۷/۸۰)۔ اے میرے نشوونما دینے والے! تو مجھے جہاں کہیں پہنچا سچائی کے ساتھ پہنچا اور جہاں سے نکال سچائی کے ساتھ نکال اور مجھے اپنے ہاں سے ایسی قوت عطا فرما جو ہر حال میں مدد کرنے والی ہو۔

آپؐ اس حالت میں مکہ سے نکلے کہ صرف ایک رفیق ہمراہ تھا۔ لیکن اس (بظاہر) بیکسی اور بے بسی کے عالم میں بھی اپنے مشن کی صداقت اور کامیابی پر ایسا یقین محکم تھا کہ اپنے ساتھی کو تلقین فرمارہے تھے کہ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۔ (۹/۴۰)۔ مت گھبراؤ۔ یہ حقیقت ہے کہ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

مدینہ کے مسلمانوں نے، مکہؔ سے آنے والے مسلمانوں کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا۔ اور یوں ایک ایسی برادری کا وجود عمل میں آیا جو خون، رنگ، وطن کی نسبتوں سے بلند ہوکر محض آئیڈیالوجی کے اشتراک کی بنا پر متشکل ہوئی تھی اور جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ تصدیق عطا ہوئی کہ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْۤا اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ (۸/۷۲) جو لوگ

ایک نئی برادری

ایمان لائے، ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جانوں سے جہاد کیا اور جن لوگوں نے (ان مہاجرین کو) جگہ دی، اور ان کی مدد کی، تو یہی لوگ ہیں جو ایک دوسرے کے رفیق اور دوست ہیں۔

اب (بظاہر) مخالفین کی مخالفت ختم ہو جانی چاہیئے تھی لیکن انہیں معلوم تھا کہ اگر وہ نظام جس کی طرف نبی اکرمؐ دعوت دیتے تھے، کسی ایک مقام میں بھی متشکل ہو گیا تو اس کے حیات بخش نتائج کو دیکھ کر دوسرے مقامات کے لوگ اس کی طرف لپک کر بڑھیں گے اور یوں ان کے اقتدار کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس لئے انہوں نے اس جماعت کا یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ اور لڑائی کے لئے اُمڈ آئے۔ اب اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ ان کا مقابلہ میدانِ جنگ میں کیا جائے۔ چنانچہ اس مختصر سی جماعت کو جنگ کی اجازت دی گئی۔ اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرُ۔ ان مظلوموں کو (جنگ کی) اجازت دی جاتی ہے جن کے خلاف جنگ کرنے کے لئے دشمن اُمنڈ آئے ہیں۔ اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے، الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ۔ یہ وہ مظلوم ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکالے گئے۔ ان کا جرم اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ یہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ انہیں جنگ کی اجازت اس لئے دی

جنگ کی اجازت

گئی ہے کہ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ لَّھُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِیَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ یُذْکَرُ فِیْھَا اسْمُ اللّٰہِ کَثِیْرًا۔ اگر خدا ایسا انتظام نہ کرے کہ (جو لوگ دوسروں پر زیادتی کرنے کی غرض سے چڑھ دوڑتے ہیں) ان کی مدافعت دوسرے انسان کریں تو اس دھاندلی کا نتیجہ یہ ہو کہ دنیا میں مذہب کی آزادی ختم ہو جائے اور نہ راہبوں کی کوٹھڑیاں باقی رہیں نہ عیسائیوں کے گرجے نہ یہودیوں کے معبد سلامت رہیں نہ مسجدیں جن میں خدا کا ذکر اس کثرت سے ہوتا ہے۔ یہ ہے خدا کا پروگرام وَلَیَنْصُرَنَّ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ۔ اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ۔ سو جو شخص اس پروگرام کی تکمیل میں خدا کی مدد کرے گا، خدا اس کی ضرور مدد کرے گا۔ یقیناً اللہ بڑا طاقتور اور غالب ہے۔ اس مقام پر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ یہ مظلوم جنہیں جنگ کی اجازت دی گئی ہے اگر غالب آگئے اور انہوں نے اپنی حکومت قائم کر لی تو ان کی حکومت دوسرے اربابِ اقتدار سے کس طرح مختلف ہو گی۔

اسلامی مملکت کا مقصد

فرمایا کہ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ۔ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ۔ (۲۲/۳۹-۴۱) یہ وہ لوگ ہیں جب انہیں ملک میں تمکن حاصل ہو گا تو یہ نظامِ صلوٰۃ قائم کریں گے، نوعِ انسان کی پرورش کا انتظام کریں گے، لوگوں کو قوانینِ خداوندی کی اطاعت کا حکم

دیں گے اور بجز خداوندی قوانین کی اطاعت سے ردکیں گے۔ غرضیکہ اس میں تمام امور آخرالامر خدا کے پروگرام کے مطابق طے پائیں گے۔

اس مقصد کے لئے انہیں جنگ کی اجازت دی گئی۔ دونوں جماعتوں کا آمنا سامنا بدر کے مقام پر ہوا۔ (۲۲/۲۱)۔ مسلمانوں کے لشکر کی کمان خود نبی اکرمؐ کر رہے تھے۔ مخالفین کو شکست ہوئی اور مظلومین کی یہ جماعت جو ابھی تھوڑا ہی عرصہ پہلے اپنے گھروں سے نکالی گئی تھی، فاتح و منصور واپس لوٹی۔

شکست خوردہ مخالفین نے اپنی ذلت اور رسوائی کا بدلہ اُن بے گناہ مسلمانوں سے لینا شروع کر دیا جو مکہ میں رہ گئے تھے اور ہجرت کر کے مدینہ نہیں آنے پائے تھے۔ یہ مظلوم اپنی مدد کے لئے مسلمانوں کے سوا اور کسے پکار سکتے تھے۔ ان کی اُن پر لازم تھی اور اگر اس کے لئے جنگ ناگزیر ہو جائے تو جنگ بھی کی جاسکتی تھی۔ یعنی ظلم کی روک تھام کے لئے جنگ خواہ وہ ظلم کہیں ہو رہا ہو۔ اس لئے کہا گیا کہ وَمَا لَكُمْ

مظلوموں کی امداد

لَا تُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْیَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِیْرًا ۔ (۴/۷۵)۔ (مسلمانو!) تمہیں کیا عذر ہے کہ تم اللہ کی راہ میں جنگ نہ کرو؟ ان کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کی حفاظت کے لئے جو (چیخ چیخ کر) پکار رہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں اس بستی سے نجات ڈالے جس کے رہنے والے اس قدر ظالم ہیں اور اپنی جناب سے ہمارا کوئی پشت پناہ بنا اور اپنے حضور سے ہمارا کوئی مددگار بھیج۔

فرائضِ رسالت

لڑائیوں کا یہ سلسلہ سات آٹھ سال تک مسلسل رہا تاآنکہ (آخرالامر) مکہ فتح ہو گیا اور یوں ہر طرف دینِ خداوندی غالب آگیا۔ اس دوران میں آپؐ اس نظامِ نو کی تشکیل اور اس کے مختلف گوشوں کی تعمیر و تحسین کے لئے مسلسل کوشاں رہے۔ اس پروگرام کی متعدد شقیں تھیں۔ مثلاً

۱۔ سب سے پہلی شق یہ ہے کہ جو کچھ آپ پر خدا کی طرف سے نازل ہوا اسے دوسروں تک پہنچایا جائے، اس کے لئے ارشادِ خداوندی تھا کہ یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ (۵/۶۷) اے رسولؐ! جو کچھ تیری طرف تیرے رب کی طرف سے نازل کیا جاتا ہے اُسے دوسروں تک پہنچا دے۔

۲۔ لوگوں کو قوانین اور ان کی غرض و غایت کی تعلیم دینا اور ان کی صلاحیتوں کی نشوونما کا سامان بہم پہنچانا ـــــ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (۶۲/۲)۔ یہ رسول لوگوں کے سامنے قوانینِ خداوندی کو پیش کرتا ہے، ان کی صلاحیتوں کی نشوونما کا انتظام کرتا ہے، انہیں قوانینِ الٰہیہ اور ان کی غرض و غایت کی تعلیم دیتا ہے۔

۳۔ خود قرآنِ کریم کا اتباع کرنا (۶/۵۰) اور اپنی جماعت کو حکم دینا کہ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ (۷/۳) جو کچھ اللہ نے تمہاری طرف نازل کیا ہے اس کا اتباع کرو اور اس کے علاوہ دوسرے کارسازوں کا اتباع مت کرو۔

۴۔ لوگوں کے متنازعہ فیہ معاملات کا فیصلہ قرآنِ کریم کے مطابق کرنا۔ اس کے لئے ارشادِ خداوندی تھا: وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (۵/۴۹) جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اس کے مطابق اُن میں فیصلے کرو۔ اس لئے کہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)۔ جو اس کے مطابق فیصلے نہیں کرتا جو خدا نے نازل کیا ہے تو یہی لوگ کافر ہیں۔

۵۔ امورِ مملکت کے فیصلے اپنی جماعت کے مشورے کے ساتھ سرانجام دینا۔ اس کے لئے حکمِ خداوندی تھا۔ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (۳/۱۵۸) اے رسولؐ! تو معاملات میں اپنے رفقاء کے ساتھ مشورہ کیا کر اور جب اس کے بعد کسی فیصلے پر پہنچ جائے تو پھر قانونِ خداوندی پر پورا پورا بھروسہ کر کے معاملۂ پیشِ نظر کی سرانجام دہی کے لئے عمل پیرا ہو جا۔ اس جماعت کی اہمیت اور قدر و منزلت کو خدائے بزرگ و برتر نے ان وجد آفریں الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

جماعتِ مومنین

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۡ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ۭ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ڔ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ڔ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْــــَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰي سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ۭ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ـــــ (۴۸/۲۹)۔

محمدؐ اللہ کے رسول اور اُن کے ساتھ (قدّوسیوں کی جماعت) جن کی خصوصیّت یہ ہے کہ حق وصداقت سے انکار کرنے والوں کے مقابلہ میں چٹان کی طرح سخت لیکن باہمد گر سرتاپا رافت ومحبّت ہیں۔ وہ دنیا میں کسی طاغوتی طاقت کے سامنے نہیں جھکتے، جھکتے ہیں تو فقط ایک اللہ کے سامنے۔ اسی سے وہ فضل وعنایات کے خواہاں اور اسی کی رضاجوئی کے طالب! قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکنے سے ان کے دل میں اطمینان وسکون اور شادابی وشگفتگی کی جو جنّت پیدا ہوتی ہے' اس کے اثرات ان کے چہروں سے نمایاں ہیں۔ یہی ہے قدّوسیوں کی وہ جماعت جس کے تذکرے تورات وانجیل میں آچکے ہیں۔ یہ جماعت کیا ہے؟ یوں سمجھئے کہ حق وصداقت کی لہلہاتی کھیتی ہے۔ شروع میں اس کی کیفیت یہ تھی کہ ایمان کی زمینِ صالح سے اعمال کا تخمِ حسنہ نرم ونازک پتّی کی شکل میں نمودار ہوا۔ پھر اس میں تقویت پیدا ہوئی تو وہ ایک شاخِ نو دمیدہ کی صورت اختیار کرگیا۔ پھر اس میں اور توانائی پیدا ہوئی تو وہ دیکھو وہ ایک سرسبز وشاداب کھیتی بن گیا جسے دیکھ کر کسان کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا اور حاسدوں کے سینے پر سانپ لوٹنے لگے۔ یہ تھے حفاظت اور اجرِ عظیم کے وہ درخشندہ وعدے جو اللہ نے ایمان واعمالِ صالحہ کے بدلے میں اس جماعت کے ساتھ کئے تھے اور جنہیں اس کی شانِ ربوبیّت نے اس حسن ورعنائی سے پورا کیا۔

ذرا جماعتِ مومنین کی اس خصوصیّتِ کبریٰ پر ایک بار پھر نگاہ ڈالیے کہ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ۔

اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر　　شبستانِ محبّت میں حریر وپرنیاں ہوجا!
گذرجابن کے سیلِ تندرَو کوہ وبیاباں سے　　گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہوجا

حضورؐ کو اپنے رفقاء کے ساتھ مشورہ کرنے کا جو حکم دیا گیا تھا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ان امور میں خدا کی طرف سے وحی نہیں آتی تھی ورنہ ظاہر ہے کہ جو امور وحی کی رُو سے طے پا جائیں ان میں انسانوں سے مشورہ کے کیا معنی؟ یہ امور، وحی کے قوانین کی روشنی میں زمانے کے تقاضوں کے مطابق عقل وفکر کی رُو سے طے کئے جاتے تھے جس میں غلطی کا امکان بھی تھا۔ اس کے لئے واضح الفاظ میں اعلان کر دیا گیا کہ ——

قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰى نَفْسِىْ ۚ وَاِنِ اهْتَدَيْتُ فَبِمَا يُوْحِىْٓ اِلَىَّ رَبِّىْ ؕ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ قَرِيْبٌ ۔ (۳۴/۵۰) ۔ ان سے کہہ دو کہ میں اگر کبھی غلطی کر جاتا ہوں تو وہ

غلطی کا امکان

غلطی میری اپنی وجہ سے ہوتی ہے اور جب میں صحیح راستہ پر ہوتا ہوں تو وہ اس وحی کی بنا پر جو میرا ربّ میری طرف بھیجتا ہے۔ وہ سب کچھ سننے والا اور ہر ایک کے قریب ہے" جو کچھ وحی کی رُو سے طے ہوتا تھا اس میں نہ رسُولُ اللہ کو کسی قسم کا اختیار ہوتا تھا اور نہ جماعتِ مومنین کو۔ لیکن جو امور ذاتی رائے پر چھوڑ دیئے جاتے تھے اُن میں لوگوں کو ایسی آزادیٔ رائے اور حرّیتِ فکر و عمل حاصل تھی جس کی مثال تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ اسی آزادیٔ فکر و آرا کا نتیجہ تھا کہ ایک عام عورت تک اپنے معاملہ میں حضورؐ کے ساتھ پوری جراُت کے ساتھ جھگڑ سکتی تھی' ایسی جراُت جس کی شہادت خود اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر دی کہ قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِىْ تُجَادِلُكَ فِىْ

آزادیٔ فکر

زَوْجِهَا وَتَشْتَكِىْٓ اِلَى اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ ۢ بَصِيْرٌ ۔ (۵۸/۱) اللہ نے اس عورت کی بات کو سن لیا جو تجھ سے (اے رسُول) اپنے خاوند کے بارے میں جھگڑتی تھی اور اللہ کے حضور شکایت کرتی تھی۔ وہ تم دونوں کی گفتگو کو سن رہا تھا۔ وہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے ۔ اور جب آپؐ نے اپنے آزاد کردہ غلام اور منہ بولے بیٹے زید سے کہا کہ اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ (۳۳/۳۷) اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھ، اسے طلاق مت دے" تو انہوں نے اس مشورہ کو ماننے سے انکار کر دیا اور بیوی کو طلاق دے دی۔ اس سے نہ مشورہ دینے والے کے دل میں کوئی ملال پیدا ہوا نہ مشورہ سے انکار کر دینے والے کے دل میں کسی قسم کا خیال۔ حقیقت یہ ہے کہ حضورؐ کا مشن ہی یہ تھا کہ نوعِ انسان کو قوانینِ خداوندی کی اطاعت کے سوا ہر قسم کی غلامی اور محکومی سے نجات دلائی جائے۔ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِىْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۔ (۷/۱۵۷) ۔ اس رسول کی بعثت کا مقصد یہ ہے کہ یہ انسانوں کے سر سے وہ بوجھ اتار دے جس میں وہ دبے ہوئے تھے اور انہیں ان زنجیروں سے آزاد کرا دے جن میں وہ جکڑے چلے آ رہے ہیں۔ تیئیس سال کی مسلسل جِدّ و جہد سے آپؐ نے وہ فضا پیدا کر دی جس میں ہر انسان پوری طرح آزادی کا سانس لے رہا تھا اور علیٰ وجہ البصیرت محسوس کرتا تھا کہ وہ سوائے قوانینِ خداوندی کے کسی کا محکوم اور غلام نہیں۔ اس طرح یہ حقیقت ہر ایک کے سامنے اُبھر کر آ گئی کہ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّىْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (۳/۷۸)

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ خدا اسے کتاب اور حکومت اور نبوت دے اور وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم خدا کو چھوڑ کر میرے محکوم بن جاؤ۔ (اسے یہی کہنا چاہیئے کہ) تم اس کتابِ خداوندی کی رُو سے جس کی تم تعلیم دیتے ہو اور جس کے مطالب کو تم اپنے دلوں میں نقش کرتے ہو، اپنے ربّ کے بندے بن جاؤ۔ اسی حقیقت کو اجاگر کرنے کے لئے آپؐ بار بار اس کا اعلان فرماتے تھے کہ (قُلْ) اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَىَّ (۱۸/۱۱۰)

بشریّت

میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں فرق یہ ہے کہ میری طرف خدا کی جانب سے وحی آتی ہے اور میں خود اس وحی کا اتباع کرتا ہوں۔ (۶/۵۰)۔

اس طرح رفتہ رفتہ دین کی تکمیل ہو گئی اور خدا نے اعلان کر دیا کہ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔ (۶/۱۱۶)۔ اور تیرے رب کی باتیں صدق و عدل کے ساتھ تکمیل تک پہنچ گئیں۔ اب انہیں کوئی بدلنے والا نہیں اور وہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔ خدا کی یہ باتیں جو اس نے نوعِ انسان کی ہدایت کے لئے دینی تھیں قرآنِ کریم میں جمع ہو گئیں جس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ——— (۱۵/۹) یقیناً ہم نے اس ضابطۂ قوانین کو نازل کیا ہے اور ہمیں اس کے محافظ ہیں۔ اس کے بعد نبی اکرمؐ سے کہہ دیا گیا کہ قانونِ فطرت کے مطابق آپؐ کی حیاتِ طبیعی بھی ایک دن ختم ہو جانے والی ہے۔ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ

حضورؐ کے بعد

مَّيِّتُوْنَ۔ (۳۹/۳۰) اور جماعتِ مومنین سے کہہ دیا کہ حضورؐ کی وفات سے اس نظام میں قطعاً کوئی فرق نہیں آ سکتا جسے آپؐ نے وحیٔ خداوندی کی روشنی میں متشکل فرمایا ہے۔ یاد رکھو وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ محمدؐ بجز این نیست کہ خدا کے ایک پیغامبر ہیں —— قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ آپ سے پہلے بھی خدا کے کئی رسول آئے اور گزر گئے۔ اَفَاۡىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۭ سو اگر وہ مر جائے یا قتل کر دیا جائے تو کیا تم (یہ سمجھ کر کہ یہ سلسلہ صرف آپؐ کی ذات تک محدود تھا) اپنے پچھلے نظام کی طرف لوٹ جاؤ گے۔ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰي عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَـيْــــًٔا ۭ (۳/۱۴۳) جو تم میں سے اُلٹے پاؤں پھر جائے گا تو وہ اللہ کا کچھ نقصان نہیں کرے گا۔ اپنا ہی نقصان کرے گا۔

رسول کا فریضہ یہ تھا کہ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (۷/۱۵۷) وہ لوگوں کو ان باتوں کے کرنے کا حکم دیتا ہے جنہیں قرآن نے صحیح تسلیم کیا ہے اور ان سے روکتا ہے جنہیں قرآن نے ناپسندیدہ

ٹھہرایا ہے۔ رسولِ اکرمؐ کے بعد یہی فریضہ تمہارا ہوگا۔ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (۳/۱۰۹) تم وہ بہترین قوم ہو جسے نوعِ انسانی کی بھلائی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ تمہارا فریضہ یہ ہے کہ لوگوں کو معروف کا حکم دو اور انہیں منکر سے روکو۔ یہ معروف و منکر اس کتاب کے اندر ہے جس کا تمہیں وارث بنایا جا رہا ہے۔ ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ... (۳۵/۳۲)۔ لیکن اس کے لئے ایک بنیادی شرط ہے اور وہ یہ کہ تمہارے رسول نے یہ کچھ اس لئے کر کے دکھا دیا تھا کہ وہ اخلاق کے بلند ترین مقام پر فائز تھا۔ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ۔ (۶۸/۴) اس لئے تمہیں بھی بلند ترین اخلاق کا حامل ہونا ہوگا۔ اس باب میں رسولؐ کی زندگی تمہارے لئے بہترین نمونہ ہے۔

علیٰ خلقٍ عظیم

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ (۳۳/۲۱)۔ اس کا (TEST) اور معیار یہ ہے کہ جس طرح رسول اللہؐ بھرے مجمع میں مخالفین سے کہتے تھے کہ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔ (۱۰/۱۶) میں نے تمہارے اندر اس سے پہلے اپنی عمر بسر کی ہے۔ کیا تم اس سے اندازہ نہیں لگا سکتے کہ میں کس قسم کا آدمی ہوں! اسی طرح تم میں سے بھی جو کوئی اپنے مخالفین کے سامنے سینہ تان کر اس کا دعویٰ کر سکے گا: فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ۔ وہی رسول اللہؐ کے نقشِ قدم پر چلنے والا ہوگا اور اسی قسم کے لوگوں کے ہاتھوں یہ نظام آگے بڑھے گا۔ نبی اکرمؐ کے خلقِ عظیم کا اعتراف صرف آپؐ کے مخاطبین ہی نے نہیں کیا، دنیا کے بڑے بڑے مؤرخین اور مفکرین اس باب میں رطب اللسان ہیں اور (LAMARTINE) کے الفاظ میں باوازِ بلند کہتے ہیں کہ

> ان تمام معیاروں اور پیمانوں کو اپنے ساتھ لے آؤ جن سے انسانی عظمت و بلندی کو ماپا اور پرکھا جاتا ہے۔ اور اس کے بعد ہمارے اس سوال کا جواب دو کہ —— کیا دنیا میں اس سے بڑا انسان بھی کوئی پیدا ہوا ہے؟ (معراجِ انسانیت ص ۴۶۰ ایڈیشن ۱۹۷۶ء)

یہ ہیں نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ کے وہ نمایاں خط و خال جنہیں خود اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں بیان کیا ہے۔ قرآنِ کریم میں اس زریں داستان کو بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے لیکن ہم نے اس مقام پر اختصار سے کام لیا ہے۔ یہی حضورؐ کی وہ سیرتِ مقدسہ ہے جس کے حرفاً حرفاً سچا ہونے میں ذرا بھی شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ۔ (۲/۲)۔ باقی رہے تاریخی واقعات، سو ظاہر ہے کہ ان میں وہی

سچے قرار پاسکتے ہیں جو حضورؐ کی سیرتِ قرآنیہ کے مطابق ہوں۔ یہی وہ حسنِ سیرت اور رعنائی کردار ہے جس کے پیشِ نظر، خدا اور اس کے فرشتے اس ذاتِ گرامیؐ پر تبریک و تہنیت کے پھول برساتے ہیں۔

إِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ۭ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔ (۳۳/۵۶)

صرف حضورؐ پر ہی نہیں بلکہ اس جماعتِ مومنین پر بھی جو حضورؐ کے اتباع میں نظامِ خداوندی کے قیام کا باعث بنتی ہے۔

هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا۔ (۳۳/۴۳)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی مملکت کے سربراہ کی معاشی ذمہ داریاں

(تقریر بتقریبِ سعید جشنِ عیدِ میلاد النبیؐ ۱۹۶۳ء)

برادرانِ عزیز! اسلام و رحمت!

یہ امر موجبِ ہزار برکات و مسرت ہے کہ ہم آج کی تقریبِ سعید اس ذاتِ اقدس و اعظمؐ کی حسین و شاداب یاد میں منا رہے ہیں جسے خود خدا تعالیٰ نے رحمۃ للعالمین قرار دیا ہے اور جس کے متعلق یہ کہہ کر کہ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ اس آفتابِ جہاں تاب کو شرف و تکریم انسانیت کے معراجِ کبریٰ پر جلوہ بار دکھایا ہے۔ میں اپنی اس خوش بختی اور فیروزمندی پر جس قدر بھی فخر و ناز کروں کم ہے کہ مجھے اس بارگاہِ رسالت مآبؐ میں نذرِ عقیدت پیش کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے جس پر خدا اور اس کے فرشتے تبریک و تہنیت کے پھول برساتے اور نوامیسِ فطرت جس کی حمد و ستائش کے گیت گاتے ہیں۔

وہ رازِ خلقتِ ہستی وہ معنیٔ کونین　　　وہ جانِ حسنِ ازل، وہ بہارِ صبحِ وجود
وہ آفتابِ حرم، نازنینِ کُنجِ حرا　　　وہ دل کا نور، وہ اربابِ درد کا مقصود
وہ سرورِ دو جہاں وہ محمدؐ عربی!
بروحِ اعظم و پاکش درود بے لا محدود

عزیزانِ من!

اللہ تعالیٰ نے انسانی راہ نمائی کے لئے تعلیم بھیجی تو اس کے ساتھ اپنے رسولوں کو بھی بھیجا۔ رسول کا کام اتنا ہی نہیں تھا کہ وہ ایک ڈاکیہ کی طرح خدا کا پیغام انسانوں تک پہنچا دیتا اور بس۔ اگر مقصود

تمہید

صرف خدا کی کتاب کو انسانوں تک پہنچا دینا ہوتا تو خدا آسمان سے لکھی لکھائی کتاب کیوں نہ نازل کر دیتا؟ کتاب کے ساتھ رسول کے بھیجنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ وہ رسول اس کتاب کی تعلیم کو عملاً جاری کر کے یہ دکھا دے کہ وہ تعلیم محض نظری حقائق کا مجموعہ یا ناممکن العمل اصولوں کا مرقع نہیں۔ وہ ایک ایسا قالب ہے جس میں انسانی معاشرہ ڈھلتا ہے۔ خدا کی طرف سے یہ راہ نمائی اپنی آخری اور مکمل شکل میں حضور نبی اکرمؐ کی وساطت سے قرآنِ کریم میں دی گئی۔ آپؐ نے اس آسمانی تعلیم کے مطابق ایک مملکت قائم کی جس نے دنیا کو دکھا دیا کہ جب انسانی معاشرہ کی تشکیل وحی کی روشنی میں کی جاتی ہے تو وہ کس طرح نوعِ انسان کے لئے صد ہزار برکات و سعادت کا موجب بن جاتا ہے، لیکن اس مملکت کی تشکیل کے لئے ضروری ہے کہ اس کا سربراہ خود اپنی سیرت و کردار کو قرآن کے قالب میں ڈھالے۔ بلکہ یوں کہئے کہ وہ اپنی سیرت کو قرآن کے پیکر میں ڈھالتا ہے اور مملکت اس کے حسنِ سیرت کی آئینہ دار ہو جاتی ہے۔ جس مملکت کی بنیاد حضور نبی اکرمؐ کے مقدس ہاتھوں نے رکھی اور جسے آپؐ کے سچے جانشینوںؓ نے پروان چڑھایا، ظاہر ہے کہ اس کے متعدد گوشے تھے اور ان گوشوں میں سے ہر ایک میں اس مملکت کے سربراہ کی سیرت جھلمل جھلمل کرتی نظر آتی تھی۔ یہ مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے کہ میں اس مملکت کے تمام گوشوں کو ایک نشست میں آپ کے سامنے لاسکوں۔ اس لئے میں اس وقت اس کے صرف ایک گوشے کی نقاب کشائی کروں گا۔ اس سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آجائے گی کہ اس مملکت کے سربراہوں، یعنی نبی اکرمؐ اور حضورؐ کے سچے جانشینوںؓ ــ کی عملی مثال نے اس گوشے کو کس طرح تاریخِ انسانیت کا درخشندہ باب بنا دیا تھا اور آنے والوں کو بتا دیا تھا کہ جس مملکت کو نوعِ انسان کے لئے آیۂ رحمت بننا ہو اس کے سربراہ کی اپنی زندگی کیسی ہونی چاہیئے۔ واللہ المستعان علیہ توکلت والیہ انیب۔

انسانی عجز کا اعتراف

عصرِ حاضر کا ایک ماہرِ سیاسیات پروفیسر مینکن (H.J. MENCKEN) دنیا کی سیاسی تاریخ کا جائزہ لینے کے بعد بصد حسرت و یاس اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ تمام ناکامیوں میں سب سے بڑی ناکامی خود انسان کی ہے ــ اس انسان کی جو سب سے زیادہ مدنی الطبع اور سب سے زیادہ عقلمند ہے۔ اور وہ ناکامی یہ ہے کہ یہ اپنے لئے آج تک کوئی ایسا نظام وضع نہیں کر سکا جسے دور سے بھی اچھی طرح حکومت کہا جاسکے۔ اس نے اس باب میں بڑی بڑی کوششیں کی ہیں۔ بہت سی ایسی جو فی الواقعہ محیر العقول ہیں اور بہت

سی ایسی جو بڑی جرأت آزما ہیں۔ لیکن جب ان کے عملی نفاذ کا وقت آیا تو نتیجہ حسرت و یاس کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ نظری طور پر حکومت کا خاکہ کھینچ لینا اور بات ہے اور عملی طور پر اُسے نافذ کرنا اور بات۔ نظری طور پر حکومت اِس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ افرادِ مملکت کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کا ذریعہ ہے اور اربابِ حکومت پبلک کے خادم ہیں۔ لیکن جب حکومت کو عملاً قائم کیا جاتا ہے تو اس کا مقصد، عوام کی خدمت کے بجائے انہیں لوٹنا کھسوٹنا ہوتا ہے۔

(TREATISE ON RIGHT AND WRONG)

اس مؤرخ نے بے شک اقوامِ عالم کی سیاسی تاریخ کا مطالعہ کیا ہوگا لیکن نظر آتا ہے کہ تاریخ کا ایک باب یا تو اس کی نگاہوں سے اوجھل رہا اور یا اس نے اسے عمداً نظر انداز کر دیا۔ اس لئے کہ یہ ہو نہیں سکتا کہ وہ باب ایک غیر جانبدار مؤرخ کے سامنے آئے اور وہ اس نظامِ حکومت کی کامیابی کا تذکرہ نہ کرے جس کی رُو سے دنیا نے دیکھ لیا کہ ایک ایسا نظام قائم کیا جا سکتا ہے جس میں حکومت کا فریضہ، عوام کے خدّام کی حیثیت سے ان کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنا ہو اور یہ فریضہ محض نظری طور پر اس کے سامنے نہ ہو۔ بلکہ وہ حکومت اسے عملاً

ایک استثناء

پورا کر کے دکھا دے۔ یہ نظام قائم ہوا تھا، آج سے قریب چودہ سو سال پہلے محمدؐ رسول اللہ والذین معہٗ کے انسانیت ساز ہاتھوں سے جس سے دنیا نے دیکھ لیا تھا کہ انسان اگر وحی کی راہ نمائی میں اپنا معاشرہ متشکّل کر لے تو کس طرح اس کی ناکامیاں، کامیابیوں میں بدل جاتی ہیں۔ جیسا کہ میں نے ابھی ابھی عرض کیا ہے، اس نظام کے متعدد گوشے ہیں جن میں سے ہر گوشہ اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ جو حکومت مستقل اقدار کی بنیادوں پر قائم ہوتی ہے، اس کا ہر قدم کس طرح تعمیرِ انسانیت کے لئے اٹھتا ہے۔ لیکن چونکہ پروفیسر مینکن نے ان میں سے سب سے زیادہ اہمیت اس گوشے کو دی ہے جس کا تعلق عوام کی بنیادی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے سے ہے، اس لئے میں آج کی تقریبِ سعید پر اسی گوشے کی ایک ہلکی سی جھلک آپ احباب کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے یہ حقیقت بھی آپ کے سامنے آ جائے گی کہ اسلامی حکومت کے سربراہ کی معاشی ذمہ داریاں کیا ہوتی ہیں اور انہیں پورا کرنے کے لئے وہ کس طرح اپنی زندگی کو بطورِ نمونہ پیش کرتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ کوئی حکومت بھی عمدہ نتائج پیدا نہیں کر سکتی جب تک اس کے سربراہ ان اصولوں پر خود عمل کر کے نہ دکھائیں جنہیں اس حکومت کی اساس قرار دیا جاتا ہو۔

اسلامی حکومت کا بنیادی اصول

اسلامی مملکت کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا ۔ (۱۱/۶) "روئے زمین پر کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو"۔ اسلامی حکومت جو خدا کے نام پر لوگوں سے اطاعت لیتی ہے، خدا کی اس ذمہ داری کو پورا کرنے کا عہد کرتی ہے۔ اس لئے وہ افرادِ مملکت سے اعلانیہ کہتی ہے کہ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِیَّاهُمْ ۔ (۶/۱۵۲) "ہم تمہاری ضروریاتِ زندگی کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کی ضروریات کے بھی"۔ وہ ان میں سے ہر فرد کو اس بات کی ضمانت دیتی ہے کہ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِیْهَا وَلَا تَعْرٰی ۔ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِیْهَا وَلَا تَضْحٰی ۔ (۲۰/۱۱۸-۱۱۹) "ہم ایسا جنتی معاشرہ متشکل کریں گے جس میں تمہیں نہ بھوک کی پریشانی ہو گی نہ لباس کی، نہ پیاس کی تکلیف ہو گی نہ سردی گرمی سے بچنے کی۔ اس میں روٹی، کپڑا، مکان وغیرہ تمام افراد کو میسّر ہو گا۔ اس کی ذمہ داری ہمارے سر پر ہو گی۔

آپ غور کیجئے یہ کتنی عظیم ذمہ داری ہے جسے یہ مملکت اپنے سر پر لیتی ہے۔ اب آپ یہ دیکھئے کہ اس گرانبار ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اس مملکت کا سربراہ، اپنی زندگی کس قسم کی بسر کرتا ہے۔ اس مملکت کے سب سے پہلے سربراہ خود نبی اکرمؐ تھے۔ آپ کی حیاتِ طیبہ کے دو حصے ہیں: ایک مکّی زندگی، دوسری مدنی زندگی۔ مکّہ کی زندگی میں یہ مملکت قائم نہیں ہوئی تھی۔ لیکن حضورؐ اس جماعت کی تشکیل و تربیت میں مصروف تھے جس کی رفاقت سے یہ مملکت قائم ہوئی تھی۔

حضورؐ کی مکّی زندگی

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ آپ کی مکّی زندگی بڑی عسرت اور تنگدستی کی تھی لیکن یہ درست نہیں۔ قرآنِ کریم حضورؐ کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰی ۔ (۹۳/۸) "ہم نے تجھے تنگدست پایا تو غنی کر دیا"۔ اس سے ظاہر ہے کہ حضورؐ کی وہ زندگی ایک غنی کی زندگی تھی —— یعنی ایسی زندگی جس میں آپ کو اپنی ضروریات کے لئے کسی کا محتاج نہیں ہونا پڑتا تھا۔ لیکن وہاں جماعت کے افراد کی ذمہ داریاں بہت زیادہ تھیں۔ ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے سلسلے میں اس وقت حضورؐ کا اسلوبِ زیست کیا تھا اس کا اندازہ صحیحین کی اس روایت سے لگ سکتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

> حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ اشعر قبیلہ والوں کے ہاں دستور یہ تھا کہ جب کسی جنگ میں ان کے ہاں کھانا تھوڑا رہ جاتا، یا ان کے ہاں بال بچوں پر ویسے فاقہ کی نوبت آجاتی

تو یہ لوگ اپنے اپنے کھانے کی چیزوں کو ایک جگہ جمع کر لیتے اور ایک برتن میں برابر حصّے لگا کر آپس میں تقسیم کر لیتے۔

رسول اللہؐ نے فرمایا کہ یہ لوگ مجھ سے ہیں اور میں ان میں سے ہوں۔

اس سے ظاہر ہے کہ اس زمانے میں حضورؐ اور جماعتِ مومنین کا اندازِ زیست ایسا تھا کہ اپنے اپنے کھانے کی چیزوں کو سب اکٹھا کر لیتے اور پھر اس میں سے حصّہ رسدی کھا لیتے۔ چونکہ اس وقت جماعت میں اکثریت محتاجوں اور ناداروں کی تھی، اس لئے ظاہر ہے کہ اس مساواتی تقسیم میں ہر ایک کے حصّے میں کس قدر آتا ہوگا۔ جو کچھ دوسروں کے حصّے میں آتا ہوگا وہی حضورؐ کے حصّے میں آتا ہوگا، بلکہ اس سے بھی کم۔ اس لئے کہ قرآن نے مومنین کا اندازِ زیست یہ بھی تو بتایا ہے کہ یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (۵۹/۹) وہ دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دیتے ہیں خواہ انہیں خود تنگی ہی میں گزارہ کرنا پڑے۔

مدنی زندگی

حضورؐ کی مدنی زندگی میں ایک مملکت وجود میں آگئی تھی۔ آپؐ، قریب دس لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی سلطنت کے سربراہ تھے۔ مولانا شبلی کے الفاظ میں:۔

یہ وہ زمانہ تھا جب تمام عرب، حدودِ شام سے لے کر عدن تک فتح ہو چکا تھا اور مدینہ کی سرزمین میں زر و سیم کا سیلاب آچکا تھا۔ (سیرۃ النبیؐ، جلد اوّل، ص ۵۲-۳۴۹)

لیکن اس کے باوجود آپؐ نے جس انداز کی زندگی بسر کی، اس کے متعلق کتب تاریخ و سیر میں ہے کہ

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپؐ کا کوئی کپڑا تہ کر کے نہیں رکھا گیا۔ صرف ایک جوڑا ہوتا تھا دوسرا نہیں ہوتا تھا جو تہ کر کے رکھا جاتا۔ جن کپڑوں میں آپؐ نے وفات پائی ان میں اوپر تلے پیوند لگے ہوئے تھے۔ گھر میں اکثر فاقہ رہتا تھا۔ اور رات کو اکثر آپؐ اور سارا گھر بھوکا رہتا تھا حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ مدینہ کے قیام سے وفات تک آپؐ نے کبھی دو وقت سیر ہو کر روٹی نہیں کھائی۔ (ایضاً)

اس پر لازماً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اس قدر وسیع علاقہ آپؐ کے زیرِ نگین تھا، اتنی بڑی سلطنت کے

عسرت کی زندگی کیوں؟

آپؐ سربراہ تھے، مدینہ میں زر و سیم کا سیلاب آچکا تھا، تو پھر آپؐ اس قدر عسرت کی زندگی کیوں بسر کرتے تھے۔ اس کا جواب بالعموم یہ دیا جاتا ہے کہ خدا نے حضورؐ کے سامنے دنیا اور آخرت دونوں کو پیش کیا تھا۔ آپ نے آخرت کو ترجیح دی اور

سب کچھ میسّر ہونے کے باوجود، آپؐ نے نہایت تنگدستی اور عسرت کی زندگی بسر فرمائی۔ لیکن یہ توجیہہ صحیح نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ یہ قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے۔ دنیاوی آسائش و لذائذ کو قابلِ نفرت سمجھ کر ترک کر دینا، رہبانیت ہے جسے قرآن، عیسائی راہبوں کا خود ساختہ مسلک قرار دیتا ہے۔ جب کہتا ہے کہ وَرَهْبَانِيَّةَ نِ ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ ـ (۵۷/۲۷) "اس مسلکِ رہبانیّت کو انہوں نے خود وضع کر لیا تھا۔ اسے ہم نے ان پر واجب نہیں ٹھیرایا تھا"۔ اس کے برعکس قرآن دنیاوی آرائش و زیبائش کی چیزوں کو وجہِ جاذبیّت قرار دیتا ہے اور پوری تحدّی سے کہتا ہے کہ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ـ (۷/۳۲) "ان سے کہو کہ وہ کون ہے جو زیب و زینت کی ان چیزوں کو جنہیں اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے اور خوشگوار سامانِ زیست کو حرام قرار دیتا ہے"۔ اور نبی اکرمؐ سے تو خاص طور پر کہا گیا کہ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ...... (۶۶/۱) اے نبیؐ! جس چیز کو خدا نے تیرے لئے حلال قرار دیا ہے تو اسے کیوں حرام کرتا ہے۔ ان تصریحات سے واضح ہے کہ نبی اکرمؐ اس لئے تنگدستی اور عسرت کی زندگی بسر نہیں کرتے تھے کہ آپؐ نے دنیاوی زیبائش و آرائش کی چیزوں کو قابلِ نفرت قرار دے کر ترک کر دیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مملکت کے وجود میں آجانے سے حضورؐ کی ذمہ داریوں میں بے حد اضافہ ہو گیا تھا۔ ملک میں خوشحال لوگوں کی تعداد بہت کم تھی۔ باقی سب مفلوک الحال، ضرورت مند، مفلس اور نادار تھے جن کی کفالت مملکت کے ذمہ تھی۔ ناداری کا یہ عالم تھا کہ لوگوں کے پاس جہاد میں شریک ہونے کے لئے سواری تک نہیں ہوتی تھی اور مملکت کے ذرائع اس قدر محدود تھے کہ ان کے لئے سواری کا انتظام کرنا، اس کے بس کی بات بھی نہیں تھی۔ یہی وہ حالت تھی جس کا نقشہ سورۂ توبہ میں ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے کہ

اکثریت غریبوں کی تھی

وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ۪ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ ـــ (۹/۹۲)

نہ ہی ان لوگوں پر جہاد میں عدمِ شرکت کی وجہ سے کوئی الزام ہے جن کی حالت ہے کہ وہ تیرے پاس درخواست لے کر آئے کہ ان کے پاس سواریاں نہیں۔ تم سواری کا کچھ انتظام کر دو، تو تم نے کہا کہ سواری کا تو میرے پاس بھی کوئی انتظام نہیں۔ چنانچہ وہ بصد حسرت و یاس واپس چلے گئے، اس حالت میں کہ ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور دل اس غم میں ڈوبا جا رہا تھا کہ ہمارے پاس کچھ بھی نہیں جس سے ہم

سواری کا انتظام کر لیتے اور جہاد میں شریک ہو سکتے۔

یہ تھی افرادِ مملکت کی عام حالت۔ ان حالات میں آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس مملکت کے سربراہ کو جس کی ذمہ داریوں کا وہ عالم ہو جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے، کس قسم کی زندگی بسر کرنی پڑتی تھی۔ دنیا کی عام مملکتوں میں رئیسِ مملکت یا دیگر اربابِ حکومت کے اخراجات کے لئے سب سے پہلے روپیہ الگ کر لیا جاتا ہے اور جو باقی بچتا ہے اس میں سے دیگر مدّات پر صرف کیا جاتا ہے۔ لیکن اسلامی مملکت میں صورت اس کے بالکل برعکس ہوتی ہے۔ اس میں سربراہِ مملکت اپنی ضروریات کو سب سے مؤخر رکھتا ہے۔ وہ اس وقت کھاتا ہے

سربراہ سب سے پیچھے

جب سب کھا چکتے ہیں۔ وہ اس وقت پہنتا ہے جب سب پہن چکتے ہیں۔ ابوداؤد کی روایت ہے کہ

حضورؐ نے فرمایا کہ جس کو اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے بعض امور کا نگران بنا دے اور وہ لوگوں کی ضروریات اور احتیاجات سے لاپرواہی برتے تو اللہ تعالیٰ اس کی ضروریات اور احتیاجات کی طرف سے لاپرواہی برتے گا۔ (ابوداؤد، کتاب الخراج)

یہی روایت ترمذی میں ان الفاظ میں آئی ہے:۔

حضورؐ نے فرمایا کہ جو امام ضرورت مندوں، محتاجوں اور مسکینوں پر اپنے دروازے بند کر لیتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی ضروریات اور احتیاجات کے لئے آسمان کے دروازے بند کر لیتا ہے۔

(ترمذی، کتاب الاحکام)

اسی تفصیل کو حضورؐ نے چند الفاظ میں سمٹا کر یوں بیان فرما دیا:۔

جس بستی میں کسی شخص نے اس حال میں صبح کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا، اس بستی سے اللہ تعالیٰ کی نگرانی اور حفاظت کا ذمہ ختم ہو گیا۔ (مسند امام احمد)

کوئی فرد تنہا نہ رہنے پائے

مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ کسی فرد کو محسوس تک نہ ہونے دے کہ وہ تنہا یا لاوارث ہے۔ اس لئے حضورؐ نے فرمایا کہ

جس کا کوئی سرپرست نہ ہو، اس کا سرپرست اللہ اور اس کا رسولؐ ہے۔

(ترمذی، باب الفرائض)

حتّٰی کہ اگر کوئی شخص ایسی حالت میں وفات پا جائے کہ اس پر کسی کا قرض ہو، تو اس کے قرض کی ادائیگی بھی مملکت کے

ذمہ ہو گی حضورؐ نے یہ اعلان فرمایا تھا کہ

میں مسلمانوں سے ان کے اپنے افراد کی نسبت زیادہ قریب ہوں۔ سو ان میں سے جو مقروض وفات پا جائے تو اس کے قرض کی ادائیگی میرے ذمے ہے۔　(ابو عبیدہ "کتاب الاموال)

مقروض کا قرض بھی مملکت ادا کرے گی اور اگر وہ اپنے اہل وعیال کو بے سہارا چھوڑ جائے گا تو ان کی ذمہ داری بھی مملکت کے سر پر ہو گی۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہ رض کی ایک روایت ہے کہ

حضورؐ نے فرمایا کہ جو شخص کچھ ترکہ چھوڑ جائے تو وہ اس کے گھر والوں کے لئے ہے، لیکن جو کسی کو بے سہارا چھوڑ جائے تو اس کی ذمہ داری میرے سر ہو گی۔　(ترمذی "باب الفرائض)

ہر متنفس کے رزق کی ذمہ داری

مملکت کی یہ ذمہ داریاں صرف انسانوں تک محدود نہیں۔ چونکہ قرآن نے کہا ہے کہ" زمین پر کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو" اس لئے اسلامی مملکت کے حدود میں رہنے والے ہر متنفس کے رزق کی ذمہ داری مملکت پر عائد ہوتی ہے۔ اسی لئے حضرت عمر رض نے ــــــــ جو اسلامی مملکت کے تیسرے سربراہ اور حضورؐ کے جانشین تھے؛ فرمایا تھا کہ

اگر دجلہ کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مر جائے تو عمر رض سے اس کی بھی بازپرس ہو گی۔
(توفیق الرحمان، مطبوعہ مصر)

ایک جامع حقیقت

اس مملکت کی ذمہ داری کی انتہا وہ تھی جسے حضرت عمر رض نے اُن الفاظ میں بیان کر دیا جن سے زیادہ جامع الفاظ اس باب میں کہیں نہیں مل سکتے۔ آپ نے ایک خطبۂ عام میں فرمایا:-

لوگو! مجھے اللہ نے اس بات کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے کہ میں تمہاری دعاؤں کو اس تک پہنچنے سے روک دوں۔ (قواعد الاحکام فی مصالح الانام "ابو محمد عزالدین)

یہ بات بڑی بلند اور لطیف ہے اس لئے ذرا وضاحت طلب ہے۔ مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ ایسا انتظام کرے کہ کسی فرد کی کوئی ضرورت رکی نہ رہے تاکہ اسے اپنی اس ضرورت کے لئے خدا سے دعا کرنی نہ پڑے۔ ظاہر ہے کہ جب کسی شخص کی کوئی ضرورت رکی نہیں رہے گی تو اسے اپنی ضرورت کے لئے خدا کو پکارنے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ بالفاظِ دیگر اگر کسی شخص کو اپنی کسی ضرورت کے لئے خدا سے کچھ مانگنے کی ضرورت پڑ جائے تو یہ گویا مملکت کے خلاف شکایت ہو گی کہ وہ اپنی اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے سے قاصر رہ گئی ہے۔ چنانچہ اس کی تفصیل میں طبری

میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ

تمہارے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان میں ہوں اور میرے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی نہیں۔ اللہ نے میرے لئے ضروری قرار دیا ہے کہ میں اس کے حضور جانے والی دعاؤں کو روکوں۔ لہٰذا تم لوگ اپنی شکایتیں میرے پاس بھیجو۔ جو خود ایسا نہ کر سکے وہ کسی دوسرے آدمی تک اپنی بات پہنچا دے تاکہ وہ اسے مجھ تک پہنچا دے۔ اس کی شکایت پہنچنے پر ہم اس کا حق بغیر کسی تامل و تذبذب کے وصول کرا دیں گے۔ (طبری بحوادث ۱۴ھ)

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اسلامی مملکت کا رقبہ ساڑھے ۲۲ لاکھ مربع میل پر پھیل چکا تھا اور ایک عراق کی مال گذاری ساڑھے گیارہ کروڑ درہم تھی۔ لیکن اسی نسبت سے افرادِ مملکت کی تعداد میں بھی اضافہ ہو گیا تھا اور مملکت کی ذمہ داریاں بھی بڑھ گئی تھیں۔ انہی ذمہ داریوں کا نتیجہ تھا کہ حضرت عمرؓ سے ایک دن کسی نے پوچھا کہ مملکت کی آمدنی میں سے آپ کے لئے کس قدر لینا جائز ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ

خلیفہ کا حصہ

کپڑوں کے دو جوڑے، ایک جاڑے کا دوسرا گرمی کا۔ حج اور عمرہ کے لئے ایک احرام۔ اور میرے اور میرے اہل و عیال کے لئے فی کس اتنا کھانا جو قریش کے ایک آدمی کی خوراک ہے، نہ اس سے زیادہ نہ اس سے کم۔ اس کے بعد، میں مسلمانوں کا ایک فرد ہوں، جو ان کا حال سو میرا حال۔ (عمر فاروقؓ۔ از محمد حسنین ہیکل)

وہ فرمایا کرتے تھے کہ

اللہ کا مال میرے لئے ایسا ہے جیسے کسی یتیم کا مال۔ ضرورت نہیں ہوتی تو اسے ہاتھ نہیں لگاتا اور حاجتمند ہوتا ہوں تو بقدرِ احتیاج لے لیتا ہوں۔ (ایضاً)

ترکِ دنیا نہیں

اس مقام پر میں اس حقیقت کو پھر دہرانا چاہتا ہوں کہ یہ دو جوڑے کپڑے اور روکھا سوکھا کھانا اس لئے نہیں تھا کہ آپ ایک تارک الدنیا زاہد کی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے۔ اس قسم کے زہد و تورع کے متعلق تو ان کا ردِ عمل یہ تھا کہ

ایک دن انہوں نے کسی زاہد مرتاض کو دیکھا۔ اس کے پاس گئے اور ایک دُرّہ مار کر بولے "خدا تجھے موت دے، ہمارے دین کا کیوں گلا گھونٹتا ہے"۔ (ایضاً)

اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے اپنا اصول یہ بنا لیا تھا کہ مملکت کا سربراہ اپنا معیارِ زندگی ایسا رکھے جو اُمت کے

ہر فرد کو میسّر آسکتا ہو۔ جوں جوں اُمّت کے عام معیار کی سطح بلند ہوتی جائے سربراہِ مملکت کا معیار بھی اونچا ہوتا چلا جائے۔ چنانچہ تاریخ میں ہمیں یہ واقعہ بھی ملتا ہے کہ ایک دفعہ مصر کا گورنر آیا تو حضرت عمرؓ کھانا کھا رہے تھے۔ اس نے دیکھا کہ کھانے میں جَو کی روٹی ہے۔

جَو کی روٹی کیوں؟

اس نے کہا کہ اب تو مصر سے کافی مقدار میں گیہوں آرہا ہے۔ آپ گیہوں کی روٹی کیوں نہیں کھاتے؟ آپ نے فرمایا کہ اس کا مجھے یقین ہے کہ اس وقت مملکت میں ہر فرد کو جَو کی روٹی میسّر آرہی ہے۔ جس دن آپ مجھے اس کا یقین دلادیں گے کہ ہر فرد کو گیہوں کی روٹی مل رہی ہے اس دن میں بھی گیہوں کی روٹی کھالوں گا۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ مملکت میں ایک فرد بھی ایسا ہو جسے گیہوں کی روٹی میسّر نہ آتی ہو اور سربراہِ مملکت گیہوں کی روٹی کھائے۔ جب آپ سے کہا گیا کہ آپ اس قدر عسرت کی زندگی بسر کرکے اپنے آپ کو مشقّت میں کیوں ڈالتے ہیں تو آپ نے اس کا جو جواب دیا وہ ایک اسلامی مملکت کے سربراہ کے احساسِ ذمّہ داری کا صحیح آئینہ ہے۔ آپؓ نے فرمایا کہ

میں رعایا کی دیکھ بھال کیسے کرسکتا ہوں جب تک مجھ پہ وہی کچھ نہ بیتے جو رعایا پر بیتتی ہے۔

(ہیکل)

قحط کے زمانے میں

حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب ملک میں قحط پڑا تو ارد گرد کی تمام آبادی ہجوم کرکے مدینہ میں جمع ہوگئی۔ آپ نے سب سے پہلے یہ حکم دیا کہ مدینہ میں کسی کے گھر میں الگ الگ کھانا نہیں پکے گا۔ سب کچھ شہر سے باہر ایک جگہ جمع ہوگا اور اسے سب مل کر بانٹ کھائیں گے۔ چنانچہ خود رئیسِ مملکت حضرت عمرؓ بھی سب کے ساتھ ایک ہی دسترخوان پر کھانے میں شریک ہوتے تھے۔ ایک دن آپ کے سامنے گھی میں چوری ہوئی روٹی آئی ایک بدوی آپ کے ساتھ شریکِ طعام تھا جس طرف گھی زیادہ تھا وہ بدوی اس طرف سے بڑے بڑے لقمے مارنے لگا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا معلوم ہوتا ہے کہ تم نے کبھی گھی نہیں کھایا۔ اس نے کہا ہاں! میں نے فلاں دن سے آج تک گھی یا تیل نہیں چکھا اور ایک میں ہی کیا کسی کو بھی یہ کچھ میسّر نہیں آیا۔ حضرت عمرؓ نے اسی وقت قسم کھائی کہ جب تک لوگ قحط میں مبتلا ہیں وہ گوشت اور گھی کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔

چنانچہ انہوں نے گوشت اور گھی جو ان کی معمول کی غذا بھی چھوڑ دیئے اس سے ان کی صحت پر سخت مضر اثر پڑا۔

رنگت سیاہ پڑ گئی۔ پیٹ میں شکایت پیدا ہو گئی۔ لیکن انہوں نے گوشت اور گھی کو ہاتھ نہیں لگایا۔ پاس بیٹھنے والے اصرار کرتے تو آپ ان سے کہتے کہ لوگوں کو خشک روٹی تک میسّر نہیں آتی۔ اور تم کہتے ہو کہ عمرؓ گھی اور گوشت کھائے۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ چنانچہ جن لوگوں نے آپ کی یہ حالت دیکھی تھی وہ کہتے تھے کہ

اگر اللہ اس قحط کو دُور نہ کر دیتا تو ہمیں اندیشہ تھا کہ حضرت عمرؓ لوگوں کے غم میں جان دے دیتے۔[1]

اسی قحط کا ذکر ہے کہ ایک دن حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ ان کا پوتا ککڑی یا خربوزہ کھا رہا تھا۔ آپ نے اپنے بیٹے کو بلایا اور کہا کہ یہ کیا ہے کہ لوگوں کے بچّوں کو سوکھی روٹی نہیں ملتی اور عمرؓ کا پوتا پھل کھا رہا ہے۔ یہ اسے کیسے مل گیا۔ بیٹے نے کہا کہ صبح تمام بچّوں کو کھجور کے ستّو ناشتے میں ملے تھے اس نے اپنے حصّے کے ستّو ایک بدّو لڑکے کو دے کر اس کے بدلے میں ککڑی لے لی ہے۔ یہ ہے وہ پھل جو حضرت عمرؓ کا پوتا کھا رہا ہے۔ اسے دوسرے بچّوں کے مقابلے میں کچھ بھی زیادہ نہیں ملتا۔ آپ مطمئن رہیئے۔

خلافت سے مفہوم

یہ تو پھر بھی قحط کا زمانہ تھا۔ ان کے لئے نئی نئی فتوحات کی خبریں بھی محض اس لئے مسرّت کا باعث ہوتی تھیں کہ اس سے لوگوں کا معیارِ زندگی اور بلند ہو جائے گا۔ چنانچہ قادسیہ کی فتح کی خوشخبری سننے کے بعد آپ نے جو خطبہ ارشاد فرمایا اس میں کہا کہ

مجھے اس بات کی بڑی فکر رہتی ہے کہ جہاں بھی کسی کو ضرورت مند دیکھوں اس کی ضرورت پوری کر دوں۔ جب تک ایک دوسرے کی (انفرادی طور پر) مدد کرنے سے ایسا ہو سکے ہمیں ایسا کرنا چاہیئے۔ جب معاملہ اس سے آگے بڑھ جائے تو ہمیں سب کو مل کر گزرا وقات کرنی چاہیئے، یہاں تک کہ سب کا معیارِ زندگی ایک جیسا ہو جائے۔ کاش! تم جان سکتے کہ میرے دل میں تمہارا کس قدر خیال ہے۔ لیکن یہ چیز میرے زبانی سمجھانے کی نہیں عمل سے کر کے دکھانے کی ہے۔ خدا کی قسم! میں بادشاہ نہیں کہ تم لوگوں کو اپنا محکوم اور غلام بنا کر رکھوں۔ میں تو خود خدا کا محکوم اور غلام ہوں۔ حکمرانی کی یہ امانت میرے سپرد کی گئی ہے۔ اب اگر میں اسے اپنی ذاتی ملکیت نہ سمجھ لوں بلکہ تمہاری چیز تمہاری طرف لوٹا دوں اور تمہارے پیچھے تمہاری خدمت کے لئے چلوں، یہاں تک کہ تم اپنے گھروں میں سیر ہو کر کھا پی سکو تو یہ وہ سعادت ہو گی جو تمہارے ذریعہ مجھے میسّر آجائے گی۔ لیکن اگر میں اس امانت کو اپنا لوں

[1] ہیکل عمر فاروقؓ

اور تمہیں اپنے پیچھے پیچھے چلنے اور اپنے گھر پر آنے کے لئے مجبور کر دوں تو یہ وہ بد بختی ہو گی جو تمہارے ذریعہ میرے سر پر مسلط ہو جائے گی [۱] (خدا مجھے اس سے محفوظ رکھے)۔

"مملکت کا ایسا انتظام کیا جائے کہ سب کا معیارِ زیست ایک ہو جائے"۔ یہ تھا وہ نصب العین جو ان حضرات کے سامنے رہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جہاں دیکھتے کہ افسر اور ماتحت کے معیار میں فرق آنے لگا ہے، اس کا فوراً تدارک کر دیتے۔ اس باب میں ان کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ جب عراق کے

سب کا معیار ایک

بعض جاگیرداروں نے حضرت ابو عبیدہؓ سے صلح کی تو اس خوشی میں طرح طرح کے لذیذ اور پُر تکلف ایرانی کھانے لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت ابو عبیدہؓ نے ان سے پوچھا کہ کیا تمام لشکر کے لئے ایسے ہی کھانوں کا انتظام کیا گیا ہے یا یہ امیرِ لشکر کی خصوصی دعوت ہے۔ جب انہوں نے کہا کہ یہ صرف آپ کے لئے ہیں تو انہوں نے کھانے سے انکار کر دیا اور اُن سے کہا کہ جب تک سارے لشکر کے لئے اسی قسم کے کھانے کا انتظام نہیں ہو گا میں اسے کبھی نہیں کھاؤں گا۔[۲]

اسلامی مملکت کے سربراہ کی ان ذمہ داریوں کو سامنے رکھیئے اور پھر اس حقیقت پر غور کیجئے کہ..... نبی اکرمؐ اس قدر فقر و فاقے اور عسرت کی زندگی کیوں بسر کرتے تھے۔ بات نکھر کر سامنے آ جائے گی۔ عوام کا معیارِ زیست بہت پست تھا۔ ان کی ضروریات زیادہ اور سامانِ رزق نسبتاً کم۔ جب تک ان کی ضروریات

ضرورت سے زائد سب کچھ دے دے

پوری نہ ہو جاتیں حضورؐ کس طرح مرفہ الحالی کی زندگی بسر کر سکتے تھے۔ اس وقت تو ضروریات کا تقاضا یہ تھا کہ ہر شخص کم از کم اپنے پاس رکھے اور باقی سب دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے دے۔ اور یہ قرآنِ کریم کے اس ارشاد کے عین مطابق ہے کہ یَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ ؕ (۲/۲۱۹) "تجھ سے یہ پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر مال دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے دیں۔ ان سے کہدو کہ جس قدر تمہاری اپنی ضروریات سے زائد ہے وہ سب ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے ہے۔ مسلم کی یہ روایت اسی ارشادِ خداوندی کی عملی تفسیر ہے کہ

حضرت ابو سعیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ کے ساتھ سفر میں تھے۔ ایک شخص آیا اور

---

[۱] ابنِ کثیر' البدایہ والنہایہ' نیز تاریخِ طبری۔ [۲] ہیکل۔ (عمر فاروقِ اعظمؓ)۔

دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ آپؐ نے فرمایا کہ جس کے پاس سواری ضرورت سے زائد ہو وہ اس آدمی کو کو دے دے جسے اس کی ضرورت ہو۔ جس کے پاس زادِ راہ زیادہ ہو وہ اسے دے دے جس کے پاس زادِ راہ نہ ہو۔ اسی طرح آپ نے بہت سی چیزوں کا ذکر فرمایا حتّٰی کہ ہم نے سمجھ لیا کہ ہم میں سے کسی کو بھی ضرورت سے زائد کوئی چیز رکھنے کا حق نہیں۔

مسلمؒ کی ایک اور روایت ہے:۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ بندہ، میرا مال، میرا مال کہتا رہتا ہے، حالانکہ مال میں اس کا حصہ صرف تین چیزیں ہوتی ہیں۔ (۱) جو کچھ وہ کھا کر ہضم کر لیتا ہے۔ (۲) جسے وہ پہن کر پرانا کر دیتا ہے۔ اور (۳) جو کچھ وہ دوسروں کی پرورش کے لئے دے کر اپنے لئے ذخیرۂ آخرت کر لیتا ہے۔ ان تین چیزوں کے علاوہ جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ یا تو چلا جاتا ہے یا وہ دوسروں کے لئے چھوڑ کر مر جاتا ہے۔

یہیں سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن کریم نے جو مال و دولت کے جمع کرنے کو سختی سے روکا ہے تو یہ اصول اسلامی مملکت کے نظام میں کس طرح فِٹ بیٹھتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے:۔

مال و دولت جمع نہیں کئے جا سکتے

وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (۹/۳۴)

جو لوگ چاندی، سونا (مال و دولت) جمع کر کے رکھتے ہیں اور اسے اللہ تعالیٰ کے راستے میں (ضرورت مندوں کی ضروریات رفع کرنے کے لئے) کھلا نہیں رکھتے تو انہیں الم انگیز عذاب سے آگاہ کر دے۔

اسلامی مملکت میں:۔

۱۔ تمام افرادِ مملکت کی ضروریاتِ زندگی کا پورا کرنا مملکت کا فریضہ ہوتا ہے۔

۲۔ مملکت کا یہ فریضہ اس طرح پورا ہوتا ہے کہ ہر فرد کا سب (یعنی جو کمانے کے قابل ہو) پوری پوری محنت سے کمائے اس میں سے اپنی ضرورت کے مطابق رکھ کر باقی مملکت کے لئے کھلا چھوڑ دے تاکہ وہ اُسے ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کے کام میں لائے۔

۳۔ اس اصول پر سب سے پہلے خود رئیسِ مملکت کاربند ہوتا ہے اور اس کا طرزِ عمل دوسروں کے لئے

نمونہ بنتا ہے۔

ان ضروریات کا تعین کس طرح ہوتا ہے اس کا اندازہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ایک واقعہ سے لگائیے۔ ایک دن آپ نے کھانے کے بعد بیوی سے کہا کہ کوئی میٹھی چیز ہو تو دیجئے۔ اس نے کہا کہ بیت المال سے جو راشن آتا ہے اس میں میٹھی چیز شامل نہیں۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ ہفتہ عشرہ کے بعد آپ نے دیکھا کہ کھانے کے ساتھ تھوڑا سا حلوہ بھی ہے۔ آپؓ نے بیوی سے کہا کہ تم نے تو کہا تھا کہ راشن میں میٹھی چیز نہیں آتی، یہ حلوہ کیسے پک گیا؟ اس نے کہا کہ میں ان دنوں مٹھی بھر آٹا الگ رکھتی گئی۔ جب وہ کافی ہو گیا تو اس کے عوض بازار سے کھجور کا شیرہ منگا لیا اور حلوہ پکا لیا۔ آپ کھانے سے فارغ ہو کر سیدھے بیت المال میں گئے اور راشن بانٹنے والے سے کہا کہ ہمارے ہاں جس قدر روزانہ آٹا جاتا ہے اس میں ایک مٹھی کی کمی کر دی جائے، کیونکہ تجربے نے بتایا ہے کہ آٹے کی موجودہ مقدار ہماری روزانہ ضرورت سے بقدر ایک مٹھی کے زیادہ ہے۔

ہمیں یہ باتیں آج افسانہ سی نظر آتی ہیں۔ لیکن یہ افسانے نہیں حقیقتیں ہیں۔ جو شخص متاعِ ملّت کو امانت سمجھے اور اپنے آپ کو اس کا امین اور اس کا ایمان ہو کہ اسے اس امانت کے ایک ایک ذرّے کا حساب دینا ہوگا، وہ اپنی ضروریات کے تعین میں ایسا ہی محتاط ہوگا۔ اسی احتیاط کا نتیجہ تھا کہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی وفات کے وقت بیٹے سے کہا تھا کہ معلوم نہیں کہ میں نے قوم کے مال میں سے جس قدر اپنی ضروریات کے لئے لیا ہے، اتنا قوم کا کام کر سکا ہوں یا نہیں؟ بہتر یہی ہے کہ تم حساب کر کے اتنا روپیہ قرض لے کر بیت المال میں داخل کر دو تاکہ میں اس ذمہ داری سے سبکدوش ہو کر خدا کے حضور جاؤں۔ چنانچہ ایسا کر دیا گیا۔

حضورؐ کا ترکہ

اسی سے ایک اور حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے اور وہ یہ کہ جب اصول یہ ٹھہرا کہ کوئی شخص اپنی ضروریات سے زیادہ اپنے پاس رکھ نہیں سکتا تو ایسے معاشرہ میں جائدادیں کھڑی کرنے اور انہیں ترکہ میں چھوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اسی لئے حضورؐ نے واضح الفاظ میں فرما دیا تھا کہ

> میرے ورثا میں ایک دینار بھی بطور ترکہ تقسیم نہیں ہوگا۔ میری بیویوں کی ضروریات اور منتظم کی ضروریات کے بعد جو کچھ بھی بچے صدقہ ہوگا۔ (بخاریؒ)

اسی سلسلہ کی اگلی کڑی وہ روایت ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

مرض الموت کے ایام میں حضورؐ کے پاس سات دینار تھے اور حضورؐ فرماتے تھے کہ انہیں صدقہ کر دو۔ لیکن اس کے بعد حضورؐ پر غشی طاری ہو گئی اور سب لوگ آپ کی تیمار داری میں مصروف ہو گئے۔ آپ کو ہوش آیا تو فرمایا، وہ دینار لے آؤ۔ دینار کو حضورؐ نے اپنے ہاتھ پر رکھ کر کہا کہ محمدؐ کا اپنے رب پر کیا گمان ہو گا، جبکہ وہ اپنے رب سے ملے اور اس کے پاس یہ ہوں۔ پھر حضورؐ نے انہیں خود صدقہ کر دیا۔[1]

مسلم کی ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عائشہ رضؓ نے فرمایا کہ

آنحضرتؐ نے درہم چھوڑا نہ دینا، نہ بکری نہ اونٹ اور نہ کسی چیز کی وصیت کی۔

اسی طرح بخاریؒ کی ایک روایت میں ہے کہ

رسولؐ اللہ نے اپنی وفات کے وقت نہ دینار چھوڑا نہ درہم، نہ غلام نہ لونڈی، نہ کوئی اور چیز سوائے ایک خچر کے اور اپنے ہتھیار کے اور اس زمین کے جسے آپ نے صدقہ کر دیا تھا۔

مولانا شبلیؒ نے سیرۃ النبیؐ میں "متروکات" کے عنوان کا آغاز ہی ان الفاظ سے کیا ہے۔

آنحضرتؐ نے جب انتقال فرمایا تو اپنے مقبوضات اور جائداد میں سے کیا کیا چیزیں ترکہ میں چھوڑیں، اس سوال کا اصل جواب تو یہ ہے کہ آپؐ اپنی زندگی میں اپنے پاس کیا رکھتے تھے جو مرنے کے بعد چھوڑ جاتے۔ اگر کچھ تھا بھی تو اس کے متعلق عام اعلان فرما چکے تھے کہ لَا نُوْرِثُ مَا تَرَكْنَاهُ صَدَقَةٌ۔ ہمارا کوئی وارث نہیں۔ جو چھوڑا وہ عام مسلمانوں کا حق ہے۔

صدقہ کے معنی

"صدقہ" کا لفظ ہمارے ہاں تو خیرات کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے (جب دین اجتماعی نظام کے بجائے انفرادی رہ جائے ـــ جسے مذہب کہتے ہیں ـــ تو اس میں "خیرات" سے بلند کوئی تصور ہو نہیں سکتا) لیکن دین میں اس اصطلاح سے مفہوم یہ ہوتا ہے کہ وہ شے کسی کی ذاتی ملکیت نہ رہے بلکہ ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کا ذریعہ بن جائے۔ ہم نے بخاریؒ کی روایت میں (اوپر) دیکھا ہے کہ حضورؐ کے پاس وفات کے وقت کچھ زمین بھی تھی جس کے متعلق آپؐ

---

[1] اصح السیر، حکیم دانا پوری۔

نے فرمایا کہ وہ بھی صدقہ ہے۔ قرآنی نظام میں زمین کی یہی پوزیشن ہوتی ہے۔ جن چیزوں پر نوعِ انسانی کی

زمین کی پوزیشن

زندگی کا بنیادی طور پر دارو مدار ہے، وہ اللہ کی طرف سے بلامزد و معاوضہ عطا ہوتی ہیں۔ مثلاً ہوا، پانی، روشنی، وغیرہ، ان پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ یہی پوزیشن زمین کی ہے۔ یہ تمام نوعِ انسان کی پرورش کا ذریعہ ہے اور خدا کی طرف سے مُفت ملی ہے۔ وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ (۵۵/۱۰) "اور ہم نے زمین کو تمام مخلوق کے فائدے کے لئے پیدا کیا ہے"۔ اس لئے اسے سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ۔ (۴۱/۱۰) رہنا چاہیئے، یعنی تمام ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنے کے لئے یکساں طور پر کھلی (AVAILABLE) حضورؐ نے دین کا جو نظام قائم کیا تھا اور جس کی عملی تکمیل رفتہ رفتہ حضورؐ کے سچے جانشینوںؓ کے دور میں ہوئی تھی اس میں رزق کے اس اوّلین سرچشمہ کی یہی پوزیشن تھی۔ "زمینداری" کا رواج دنیا میں بہت قدیم زمانے سے چلا آرہا ہے ——— یعنی زمین کو ذاتی ملکیت سمجھنا اور اسے کاشتکاروں کو کرائے پر دے دینا۔ عربوں کی بنیادی معیشت زراعت نہیں تھی۔ لیکن جہاں جہاں یہ کیفیت تھی وہاں زمینداری کا بھی رواج تھا حضورؐ نے اس سے منع فرمادیا۔ چنانچہ مسلمؒ کی ایک روایت میں ہے۔

> حضرت رافع بن خدیجؓ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہؐ کے زمانے میں زراعت کے لئے تہائی، چوتھائی یا غلّہ کی کوئی خاص مقدار متعین کر کے زمینیں بٹائی پر دیتے تھے۔ ایک روز میرے ایک چچا میرے پاس آئے اور کہا کہ رسول اللہؐ نے ہمیں ایک ایسے کام سے روکا ہے جو ہمارے لئے نفع بخش تھا۔ مگر اللہ اور اس کے رسولؐ کی فرماں برداری زیادہ نفع بخش ہے۔ حضورؐ نے ہمیں اس بات سے منع کر دیا ہے کہ ہم زمینوں میں مزارعت کا معاملہ کریں، یعنی تہائی، چوتھائی یا مقرّرہ مقدار کے غلّہ کے عوض زمین کو کرایہ پر دے دیں۔ آپؐ نے حکم دیا ہے کہ مالکِ زمین خود کاشت کرے یا کسی دوسرے بھائی کو کاشت پر دے دے اور آپؐ نے زمین کے کرائے کو اور اس کے علاوہ دوسری صورتوں کو ناپسند فرمایا ہے۔

یہ عملی حکم اس اصول کی تشریح تھا جسے حضورؐ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا تھا کہ

> زمین اللہ کی ہے اور بندے بھی اللہ کے ہیں۔ اس لئے اللہ کی زمین، اللہ کے بندوں کے لئے رہنی چاہیئے۔
>
> (ابوداؤد)

اور جب آپؐ نے اس قطعۂ زمین کے متعلق جو آپؐ کے ذاتی اخراجات کے لئے آپؐ کی تحویل میں تھا فرمایا کہ وہ صدقہ

ہے تو وہ بھی اسی اصول کی عملی تفسیر تھی۔ اس لئے کہ رسولؐ سب سے پہلے خود احکامِ خداوندی پر عمل کرتا ہے اور اس طرح اس کا عمل دوسروں کے لئے نمونہ بنتا ہے۔ یہی حیثیت اسلامی مملکت کے ہر سربراہ کی ہوتی ہے۔ وہ خود ان قوانین پر عمل کر کے دوسروں کے لئے مثال بنتا ہے۔ حضورؐ کی ذاتِ گرامی میں چونکہ یہ دونوں حیثیتیں یکجا تھیں، اس لئے حضورؐ نے دنیا کو دکھا دیا کہ قرآن کا پیش کردہ نظام کس طرح قابلِ عمل ہے اور اسلامی مملکت کے سربراہ کی زندگی کس قسم کی ہونی چاہیئے۔

زمین، مملکت کی تحویل میں

زمین کے متعلق قاعدہ یہ تھا کہ مفتوحہ علاقوں کی زرعی زمینیں مالِ غنیمت کی طرح فوج کے سپاہیوں میں تقسیم کر دی جاتی تھیں شروع شروع میں یہ زمینیں کچھ زیادہ نہ تھیں۔ لیکن جب عراق فتح ہوا تو زرعی زمینوں کا وسیع رقبہ مسلمانوں کے ہاتھ آ گیا۔ اس وقت اس سوال نے اہمیت اختیار کر لی کہ ان زمینوں کی تقسیم کس طرح کی جائے۔ پہلے حضرت عمرؓ بعض صحابہؓ کے مشورہ سے اس پر آمادہ ہو گئے کہ یہ زمینیں حسبِ معمول فوجیوں میں تقسیم کر دی جائیں لیکن جب اس سوال پر مزید غور کیا گیا تو آپ نے یہ رائے بدل دی۔ چنانچہ کتاب الاموال (ابو عبیدہ) میں ہے کہ

> جب حضرت عمرؓ جابیہ آئے تو آپ نے زمین کو مسلمانوں کے درمیان تقسیم کرنے کا ارادہ کیا۔ حضرت معاذؓ نے آپ سے کہا کہ خدا کی قسم اس طرح تو وہی کچھ ہوگا جو آپ کو ناپسند ہے۔ اگر آپ نے زمین کو تقسیم کر دیا تو بڑے بڑے علاقے ان (موجودہ) لوگوں کو مل جائیں گے۔ پھر یہ مر جائیں گے تو یہ زمینیں (وراثت کے ذریعہ) کسی ایک آدمی یا عورت کے ہاتھ میں آجائیں گی۔ پھر ان کے بعد دوسرے لوگ آئیں گے جو اسلام کا دفاع کریں گے تو ان کو کچھ نہیں مل سکے گا۔ آپ غور و فکر کے بعد کوئی ایسا طریقہ اختیار کیجئے جو آج کے مسلمانوں کے لئے بھی موزوں ہو اور بعد میں آنے والوں کے لئے بھی مفید۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے حضرت معاذؓ کی بات سے اتفاق کیا (اور زمینیں مملکت کی تحویل میں رہنے دیں)۔

اس کے بعد یہ اصول وضع فرمایا کہ لنا رقاب الارض۔ (کتاب الاموال) زمین کے رقبے انفرادی ملکیت میں رہنے کے بجائے مملکت کی تحویل میں رہیں گے تاکہ یہ تمام ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کا ذریعہ بنے رہیں۔

ہم نے شروع میں یہ اصول بیان کیا ہے کہ تمام افرادِ مملکت کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کا بہم پہنچانا اسلامی مملکت

کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ حضورؐ کے یہ تمام ارشاداتِ گرامی اور ان پر (خود حضورؐ کا اور حضورؐ کے سچے جانشینوں کا) عمل اس اہم ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے تھا۔ حضرت سلمان فارسیؓ کے الفاظ میں (خلیفۃ المسلمین) کی تعریف (DEFINITION) ہی یہ ہے کہ

اپنے عیال کی طرح شفقت

خلیفہ وہ ہے جو کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرے اور رعایا پر اس طرح شفقت کرے جس طرح آدمی اپنے اہل وعیال پر شفقت کرتا ہے۔ (ابوعبیدہؒ کتاب الاموال)

اس شفقت اور عالمگیری کا یہ عالم تھا کہ قحط کے زمانے میں جب لوگوں کو کھانا کھلایا جاتا تو اس کی نگرانی حضرت عمرؓ خود کرتے تھے۔ ایک دن اسی نگرانی کے وقت آپ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ بائیں ہاتھ سے کھا رہا ہے۔ آپ نے اس سے کہا "بندہ خدا! دائیں ہاتھ سے کھا"۔ اس نے کہا بندۂ خدا، وہ ہاتھ مشغول ہے۔ آپ آگے بڑھ گئے۔ دوبارہ ادھر سے گزر ہوا تو دیکھا کہ وہ پھر سے بائیں ہاتھ سے کھا رہا تھا۔ آپ نے اسے پھر کہا کہ دائیں ہاتھ سے کھاؤ اور اس نے پھر وہی جواب دیا تو آپ نے پوچھا کہ وہ ہاتھ کس کام میں مشغول ہے۔ اس نے کہا کہ وہ ہاتھ میدانِ جہاد میں کام آگیا تھا۔

یہ سُن کر حضرت عمرؓ اس کے پاس بیٹھ گئے اور رونے لگے۔ اس سے پوچھنے لگے کہ تمہیں وضو کون کراتا ہے۔ تمہارا سر کون دھوتا ہے۔ کپڑے کون دھوتا ہے۔ فلاں فلاں کام کون کرتا ہے۔

چنانچہ آپ نے اس کے لئے ایک ملازم کا انتظام کر دیا اور اسے سواری بھی دلوائی۔[1] اسی ذمہ داری کا احساس تھا جس کی وجہ سے صدرِ مملکت دن بھر امورِ مملکت کی سرانجام دہی میں مصروف رہنے کے بعد، راتوں کو تنہا گشت کرتا تھا اور براہِ راست یہ معلومات حاصل کرتا تھا کہ رعایا کس حال میں ہے اور کسی کو کوئی شکایت تو نہیں۔ اور

راتوں کو خبر گیری

شکایات کے رفع کرنے کی کیفیت یہ تھی کہ جب آدھی رات کے وقت معلوم ہوا کہ ایک خیمہ میں ایک عورت دردِ زِہ میں مُبتلا ہے اور دایہ کا کوئی انتظام نہیں تو گھر سے اپنی بیوی کو لے گئے کہ وہ تکلیف زدہ بہن کی مدد کرے۔ کیسا عجیب تھا وہ منظر کہ خیمہ کے اندر "مملکت کی خاتونِ اوّل" ایک دیہاتی عورت کی دایہ گیری کی خدمت سرانجام دے رہی ہے اور خیمہ کے باہر

---

[1] کتاب الآثار۔ امام شیبانی۔

صدرِ مملکت اس عورت کے خاوند سے مصروفِ گفتگو ہے اور ان دونوں میاں بیوی پر یہ راز (کہ یہ کون ہیں) اُس وقت کھلتا ہے جب اندر سے بے ساختہ یہ خوش خبری آتی ہے کہ امیرالمؤمنین مبارک ہو آپ کے بھائی کو اللہ نے بیٹا عطا فرمایا ہے۔

افرادِ مملکت کے احوال و کوائف کی ذمہ داری کا دائرہ کہاں تک وسیع تھا اُس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے جو حضرت عمرؓ کو اپنے شام کے سفر کے دوران پیش آیا تھا۔ ایک شب کسی میدان میں آپ کا قیام تھا حسبِ معمول گشت کے لئے نکلے۔ دیکھا کہ ایک خیمے میں ایک ضعیف بڑھیا بیٹھی ہے۔ پوچھا کہ مائی! کوئی شکایت تو نہیں۔ اس نے کہا کہ جب خلیفہ کو اس کا خیال نہیں کہ وہ رعایا کی شکایات رفع کرے تو کسی اور کو شکایات بتانے سے کیا حاصل ہے۔ آپ نے کہا کہ تم نے خلیفہ تک اپنی شکایات پہنچائی ہیں؛ اس نے کہا کہ یہ خلیفہ کا فرض ہے کہ وہ معلوم کرے کہ رعایا کو کیا شکایات ہیں یا میرا فرض ہے کہ میں اپنی شکایات اس تک پہنچاؤں؟

حضرت عمرؓ اس واقعہ کو ہمیشہ دہرایا کرتے اور باچشمِ نم کہا کرتے تھے کہ مجھے اس بڑھیا نے بتایا کہ خلافت کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟ یعنی جو شخص خدا کے نام پر حکومت کرتا ہے اسے اس قدر خدائی صفات اپنے اندر پیدا کرنی چاہئیں۔ اسے ایسا خبیر و علیم ہونا چاہیئے کہ اسے ہر وقت معلوم ہو کہ افرادِ مملکت کس حال میں ہیں۔ اسی ذمہ داری کا احساس تھا جس کی بنا پر آپ نے کہا تھا کہ

> اگر میں زندہ رہا تو ایک سال تک اپنی رعایا کے درمیان دورہ کروں گا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ عوام کی بعض ضروریات ایسی ہیں جن کی مجھ تک خبر نہیں پہنچ پاتی۔ میں پہلے شام جاؤں گا اور وہاں دو ماہ ٹھہروں گا۔ پھر الجزیرہ جاؤں گا وہاں دو ماہ قیام کروں گا۔ پھر بحرین جاؤں گا اور وہاں بھی دو ماہ قیام کروں گا، پھر بصرہ جاؤں گا وہاں بھی دو ماہ ٹھہروں گا۔ پھر مصر جاؤں گا اور وہاں بھی دو ماہ قیام کروں گا۔ پھر کوفہ جاؤں گا ——— اور وہاں بھی دو ماہ ٹھہروں گا۔ خدا کی قسم! یہ سال کتنا اچھا ہو گا۔[1]

لیکن آپ کی بے وقت شہادت نے آپ کو اس پروگرام پر عمل کرنے کا موقع نہ دیا۔

---

[1] تاریخ طبری

حضرت عثمانؓ کے متعلق حضرت موسیٰ بن طلحہؓ کی روایت ہے کہ میں نے حضرت عثمانؓ کو منبر پر بیٹھ کر جب کہ مؤذن نماز کے لئے اقامت کہہ رہا تھا لوگوں سے ان کے حالات، خبریں اور اشیاء کے نرخ دریافت کرتے سنا۔[1]

یہ حالات اس لئے دریافت کئے جاتے تھے کہ افرادِ مملکت کی ضروریات کا پورا کرنا اور ان کی شکایات کا رفع کرنا رئیسِ مملکت اپنی ذاتی ذمہ داری سمجھتا تھا۔ ان کی ضروریات پوری کرنے کی ابتدائی شکل تو وہ تھی جس کی طرف نبیٔ اکرمؐ نے یہ کہہ کر اشارہ فرمایا تھا کہ میں قبیلۂ اشعری میں سے ہوں جن کا مسلک یہ ہے کہ عُسرت کے زمانے میں تمام افراد اپنا اپنا کھانا ایک جگہ جمع کر لیتے ہیں اور سب مل کر کھا لیتے ہیں۔ اس کے بعد جب حالات بہتر ہو گئے تو افرادِ مملکت کے وظائف مقرر کئے گئے۔ حتّیٰ کہ حضرت عمرؓ نے فیصلہ کیا کہ ہر بچے کا وظیفہ اس کی پیدائش کے ساتھ ہی لگ جایا کرے۔ نبیٔ اکرمؐ اور ابوبکرؓ صدیق کے زمانے میں یہ وظائف ضرورت کے اعتبار سے یکساں طور پر ملتے رہے۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اس میں فرق مدارج کر دیا۔ یعنی جن حضرات نے اسلام کی خدمت میں سبقت کی تھی انہیں دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ دیا۔ کچھ عرصے بعد حضرت عمرؓ نے خود ہی محسوس کر لیا کہ اس طرح ان لوگوں کے پاس جنہیں ان کی ضروریات سے زیادہ ملتا ہے، فاضلہ دولت جمع ہو جاتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس پر نظرِ ثانی کا ارادہ کر لیا۔

امیروں سے دولت لے کر

طبری میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "(وظائف کے سلسلے میں) جو امور پہلے میں طے کر چکا ہوں، اگر مجھے آئندہ ان کے طے کرنے کا موقعہ ملا تو میں امیروں سے ان کی فاضلہ دولت لے کر مہاجرین کے ضرورت مندوں کے درمیان تقسیم کر دوں گا۔"

دوسرے مقام پر ہے، آپ نے فرمایا کہ

اگر میں ایک سال اور زندہ رہا تو (وظائف میں) سب سے نیچے کے لوگوں کو سب سے اوپر کے لوگوں کے ساتھ ملا دوں گا۔ (طبقاتِ ابن سعد)

اور آپ کا یہ فیصلہ قرآنِ کریم کے اس حکم کے عین مطابق تھا جس میں کہا گیا ہے کہ

---

[1] مسند امام احمدؒ۔

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ ۚ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ (۱۶/۷۱)

جہاں تک روزی کمانے کا تعلّق ہے، خدا نے مختلف افراد کو مختلف صلاحیتیں دی ہیں۔ سو جو لوگ زیادہ رزق کما لیتے ہیں وہ فاضلہ رزق کو ان لوگوں کی طرف لوٹا کیوں نہیں دیتے جو ان کے زیردست ہیں، تاکہ اس طرح (ضروریات پوری ہونے کی جہت سے) سب مساوی ہو جائیں۔ جو لوگ ایسا نہیں کرتے وہ درحقیقت خدا کی عطا کردہ نعمتوں کا انکار کرتے ہیں۔

فقر و فاقہ کی وجہ

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت آپ پر واضح ہو گئی ہو گی کہ روایات میں جو یہ آتا ہے کہ حضورؐ کس قدر فقر و فاقہ اور عسرت اور تنگدستی کی زندگی بسر کرتے تھے تو اس کی وجہ کیا تھی۔ (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) اس کی وجہ وہ نہیں تھی جو ہماری وعظ کی مجلسوں اور سیرت کے جلسوں میں بالعموم بیان کی جاتی ہے۔ وعظ کی محفل میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ واعظ حضورؐ کی عسرت اور تنگدستی اور ان کی وجہ سے پیدا شدہ مصائب و آلام کی داستانیں نہایت سوز و گداز سے بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ خدا اپنے مقرب بندوں کی اس طرح آزمائش کرتا ہے۔ ایسا کہہ کر خود بھی روتا ہے اور سامعین کو بھی رُلاتا ہے۔ لیکن حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کی یہ صحیح تصویر نہیں۔ یہ فقر و فاقہ، خدا کی طرف سے ابتلاء و آزمائش نہیں تھا، نہ ہی یہ (معاذ اللہ) کوئی ایسی مصیبت تھی جس کے ذکر پر ہم خون کے آنسو بہائیں۔

یا (جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے) یہ کہا جاتا ہے کہ حضورؐ کے سامنے دنیا اور آخرت دونوں پیش کر دی گئی تھیں۔ آپ نے دنیا پر آخرت کو ترجیح دی اور اس لئے ساری عمر عسرت اور تنگدستی میں گزار دی۔ حضورؐ کی سیرتِ اقدس کی یہ تعبیر بھی درست نہیں۔ آپ دنیا کو رہبانیت کی تعلیم دینے کے لئے نہیں آئے تھے۔ آپ اسلام کی تعلیم عام کرنے اور اس پر عمل کر کے دکھانے کے لئے مبعوث ہوئے تھے اور اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ دنیا کی نعمتوں اور قوتوں کو زیادہ سے زیادہ حاصل کیا جائے اور پھر انہیں احکامِ خداوندی کے مطابق نوعِ انسان کی بہبود کے لئے عام کر دیا جائے۔

یا جب یہ روایات بیان کی جاتی ہیں کہ حضورؐ نے اپنے ترکہ میں کوئی مال و دولت نہیں چھوڑا اور اس کے

متعلق فرمایا کہ ان کا وارث کوئی نہیں یہ تمام مسلمانوں کے مفاد کے لئے عام ہیں تو اس کے متعلق یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ حضورؐ کے لئے خصوصی احکام تھے، عام مسلمانوں کے لئے نہیں تھے۔ حالانکہ یہ بھی غلط ہے۔ حضورؐ کے لئے دوسرے مسلمانوں سے الگ جو خصوصی احکام تھے ان کی صراحت خود قرآن نے کر دی ہے۔ (مثلاً حضورؐ کی ازواجِ مطہرات کا اُمہات المؤمنینؓ ہونا)۔ جن احکام کے متعلق قرآن نے ایسی تصریح نہیں کی وہ سب کے لئے عام تھے۔ اس لئے حضورؐ نے جس نہج کی زندگی گزاری اور ترکہ اور وراثت کے متعلق جو کچھ فرمایا وہ اسلام کے عام منشا کے مطابق تھا۔

واضح رہے کہ قرآنِ کریم میں وراثت وغیرہ کے متعلق جو احکام ہیں وہ اُس زمانے سے متعلق ہیں جب ہنوز اسلام کا مملکتی نظام اپنی اصلی شکل میں متشکل نہ ہوا ہو، یا وہ نظام بعض اشیاء کو افراد کی ملکیت میں رہنے دے۔ اسلامی نظام میں کیفیت وہی ہوگی جس کا نقشہ ہمارے سامنے سیرتِ محمدیہ میں آتا ہے، یعنی ہر زائد از ضرورت چیز ملت کی تحویل میں چلی جائے گی تاکہ اس سے ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کی جائیں۔ یہ نہجِ زندگی رسول اللہؐ کے لئے خاص نہیں تھا۔ قرآن کی رُو سے عام اسلامی نہجِ زندگی ایسا ہی ہے۔

اور جن لوگوں کو کوئی اور دلیل نہیں ملتی، وہ یہ کہہ کر مطمئن ہو جاتے اور دوسروں کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ بھائی! وہ تو خدا کے رسُول تھے۔ اس قسم کی زندگی بسر کرنا کیا میرے تمہارے بس کی بات ہو سکتی ہے؛ وہ کون ہے جو اس کا دعویٰ کر سکے کہ میں حضورؐ جیسی زندگی بسر کر سکتا ہوں۔ توبہ توبہ! معاذ اللہ! یہ بہت بڑی گستاخی ہے۔

وہ تو رسُول تھے

لیکن یہ کہتے ہوئے وہ اتنا نہیں سوچتے کہ اگر ایسی زندگی صرف ایک رسول ہی بسر کر سکتا تھا اور اس کے علاوہ کسی اور انسان کے لئے ایسی زندگی بسر کرنا ممکن نہیں تھا تو اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کی سیرت کو تمام مسلمانوں کے لئے اسوۂ حسنہ کیوں قرار دیا؟ اُسوہ (نمونہ) تو وہی ہو سکتا ہے جس کے مطابق بن جانا دوسروں کے لئے ممکن ہو۔ اگر ہم زندگی کی گزرگاہوں پر حضورؐ کے نقوشِ قدم پر چل ہی نہیں سکتے، اگر اس راستہ پر چلنا نبیؐ کے سوا کسی اور کے لئے ممکن نہیں، تو حضورؐ کی سیرتِ طیبہ ہمارے لئے نمونہ کس طرح بن سکتی ہے اور اس کے مطالعہ اور تذکرہ سے ہمیں فائدہ کیا پہنچ سکتا ہے بجز اس کے کہ (معاف فرمائیے) اسے وعظ کی محفلوں میں بیان کر کے سامعین سے دادِ سخن لی جائے۔ یاد رکھیئے! حضورؐ کی سیرتِ طیبہ ہمارے ہی لئے نہیں، ساری دنیا کے انسانوں کے لئے بہترین نمونہ (اسوۂ حسنہ ہے) جس پر ہر زمانے میں عمل کیا جا سکتا ہے اور اس سے وہی خوشگوار نتائج پیدا کئے جا سکتے ہیں جنہیں حضورؐ نے پیدا کر کے دکھایا تھا۔

اُسوۂ حسنہ

یہاں یہ اہم سوال سامنے آتا ہے کہ حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کے اس اہم گوشے کے متعلق اس قسم کی تاویلات اور توجیہات کیوں کی جاتی ہیں؟ اس کی وجہ اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے۔ ہمارے ارباب شریعت ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ

یہ تاویلات کیوں؟

۱- اسلام کی رُو سے یہ بالکل جائز ہے کہ انسان جس قدر جی چاہے دولت کے انبار جمع کرتا رہے، جتنی جائداد جی چاہے کھڑی کرے اور ان سے آمدنی پیدا کرتا جائے۔ جس قدر جی چاہے زمین خریدتا جائے اور اسے پٹہ یا بٹائی پر کاشتکاروں کو دیتا جائے۔ جس کاروبار میں جی چاہے اپنا سرمایہ لگا کر بغیر محنت کئے نفع حاصل کرتا جائے۔ اسلام دولت جمع کرنے اور جائداد بنانے پر کسی قسم کی حدبندی قائم نہیں کرتا۔

۲- رزق کی تقسیم خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے وہ جسے چاہے کروڑ پتی بنا دے، جسے چاہے غریب و نادار رکھے۔ امیروں کے لئے اتنا ہی ضروری ہے کہ وہ اپنی دولت میں سے ڈھائی فی صد زکوٰۃ دیتے جائیں، یا غریبوں اور محتاجوں کی جھولی میں بھیک کے ٹکڑے بطورِ خیرات ڈال دیا کریں۔ اس سے زیادہ ان پر کوئی فریضہ عائد نہیں ہوتا۔

ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ یہی اسلام کا صحیح نقشہ ہے لیکن جب وہ دیکھتے ہیں کہ حضورؐ کی سیرتِ طیبہ اس نقشے میں فِٹ نہیں بیٹھتی تو بجائے اس کے کہ یہ سوچیں کہ اسلام کا جو نقشہ وہ پیش کر رہے ہیں، کہیں وہ تو غلط نہیں، وہ حضورؐ کی سیرت کی ایسی تاویلات شروع کر دیتے ہیں جس سے یہ بھی اپنے مقام پر صحیح رہے اور وہ نقشہ بھی عین مطابقِ اسلام سمجھا جائے جسے وہ پیش کرتے ہیں۔ یہ ہے ان کی تاویلات و توجیہات کی کوششوں کا جذبۂ محرکہ —— اگر ہمارے سامنے اسلام کا وہ نقشہ ہوتا جسے قرآنِ کریم پیش کرتا ہے تو حضورؐ کی سیرت کے اس گوشے کے متعلق کسی تاویل و توجیہہ کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ یہ اس نقشے میں بالکل فٹ بیٹھ جاتا اور دُنیا دیکھ لیتی کہ قرآنِ کریم انسان کی معاشرتی اور معاشی زندگی کا جو تصوّر پیش کرتا ہے، حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کس طرح اس کی عملی تفسیر ہے۔ اُس وقت یہ حقیقت بھی دنیا کے سامنے آجاتی کہ حضورؐ کی فقر و فاقہ کی زندگی ان ذمہ داریوں کا صحیح عکس ہے جو نوعِ انسانی کی مصیبتوں اور پریشانیوں کا بوجھ اٹھانے والے اسلامی مملکت کے سربراہ کے سر پر عائد ہوتی ہیں اور جن کے احساس سے وہ نہ دن کو آرام کرتا ہے نہ رات کو چین سے سوتا ہے تا آنکہ اسے یقین نہ ہو جائے کہ مملکت کا ہر فرد آرام اور چین کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ انہی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے —— جن کے متعلق

کمر توڑ دینے والی ذمہ داریاں

قرآن کہتا ہے کہ انہوں نے حضورؐ کی کمر توڑ دی تھی۔ (وَوَضَعْنَا عَنكَ وِزْرَكَ الَّذِي أَنقَضَ ظَهْرَكَ ۹۴/۲-۳) ۔ وہ اپنا معیارِ زیست ایسا رکھتا ہے جو اس مملکت کے غریب ترین فرد کا ہو۔ پھر وہ ان غریبوں کے معیار کو بلند کرنا شروع کرتا ہے تاکہ اس سے خود اس کا اپنا معیارِ زیست بلند ہو جائے۔ اس طرح پوری ملّت کے معیار کی سطح بلند ہوتی چلی جاتی ہے اور اس بلندی کے سامنے کوئی روک نہیں ہوتی جہاں پہنچ کر یہ کہہ دیا جائے کہ اس سے زیادہ بلند معیار کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

سب سے ادنیٰ معیار

اسلامی نظام انسانی زندگی کے معیار کو تا بہ کہکشاں پہنچانا چاہتا ہے لیکن وہ ایسا ہرگز نہیں کر سکتا کہ نوعِ انسانی کا ایک طبقہ تو ثریا کی بلندیوں تک پہنچ رہا ہو اور دوسرا طبقہ تحت الثریٰ کی پستیوں میں رینگ رہا ہو۔ اس میں پوری کی پوری اُمّت اوپر کو اُبھرتی ہے اور ان اُبھرنے والوں میں اُمّت کا سربراہ سب سے نیچے ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ پوری اُمّت کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوتا ہے۔ اگر وہ نیچے سے نکل کر اوپر آ جائے تو یہ ساری عمارت خود اپنے بوجھ سے دب کر نیچے آگرے۔ چنانچہ جن قوموں اور تمدّنوں میں ذمّہ دار افراد خود اوپر پہنچ جاتے ہیں اور قوم نیچے رہتی ہے وہ قومیں اور ایسا تمدّن تباہی اور بربادی کے جہنّم کے گڑھے میں جا گرتے ہیں۔

سیرتِ محمدیہؐ

سیرتِ محمدیہؐ ساری دنیا کے اربابِ فکر و عمل کو پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ اگر تم انسانیت کی سطح کو بلند کرنا چاہتے ہو تو اس کا طریق یہ ہے کہ تم انسانیت کے بوجھ کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر کھڑے ہو جاؤ اور اپنی سیرت و کردار کو بلند کرتے جاؤ۔ اس طرح جس قدر تم خود بلند ہوتے جاؤ گے اسی نسبت سے انسانیت اوپر کو اٹھتی چلی جائے گی۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف اقبالؒ نے یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ

بوریا ممنونِ خوابِ راحتش ؎ تختِ کسریٰ زیرِ پائے اُمّتش ؎

اس شاہنشاہِ بوریا نشینؐ کی حیاتِ طیبہ کا ایک ایک درخشندہ نقش، جہانِ کشور کشائی و فرمانروائی کے اس عظیم راز کی پردہ کشائی کرتا ہے کہ جو صاحبِ ہمّت اس بارِ امانت کو اٹھائے وہ خود تخت کے اوپر نہ بیٹھے تخت کے اوپر قوم کو بٹھائے اور اس کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا کر اس کی سطح کو بلند کرتا جائے۔ لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ قرآن کی بخشش کردہ مستقل اقدار پر انسان کا اٹل ایمان ہو اور وہ زندگی کے اس نقشہ کو اپنا نصب العین قرار دے جسے محمدؐ رسول اللہ والذین معہٗ کے مقدّس

ہاتھوں نے عملاً مرتب کر کے دکھا دیا تھا۔ جس دن دنیا نے اس راز کو پا لیا اور اس نقشے کو اپنا مقصود و مطلوب قرار دے لیا یہ جہنم جس میں اس وقت ساری دنیا مبتلائے عذاب ہے، جنتِ ارضی سے بدل جائے گا اور زمین سر اٹھا کر آسمان سے کہہ سکے گی کہ

دیدۂ آغازم ——— انجامم نگر!

اور عالمِ ملکوت کی نور پاش فضاؤں سے، تبریک و تہنیت کے یہ نغماتِ جاں فزا، ساکنانِ ارض کے لئے فردوسِ گوش بنیں گے کہ

إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ ۚ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ـ (۳۳/۵۶)

اس ضمن میں اس حقیقت کو بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ اسلامی مملکت کی یہ ذمہ داری صرف اپنی مملکت کے افراد تک محدود نہیں، اس کا دائرہ بڑا وسیع ہے اور تمام عالمِ انسانیت کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہے۔ اپنی "مملکت" تو وہ معمل (لیبارٹری) ہوتی ہے جس میں سب سے پہلے اس نظام کو عمل میں لایا جاتا ہے۔ جوں جوں ان افرادِ مملکت کی ضروریات پوری ہوتی چلی جاتی ہیں، عالمگیر ربوبیت کے اس دائرے کی حدیں آگے بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ اس کا منتہیٰ

عالمگیر ربوبیت

پوری کی پوری نوعِ انسانی کی پرورش اور نشوونما ہے۔ اس سلسلے میں انسان اور انسان میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ یہ فرق تو دورِ حاضر کی قومیت پرستی ——— (نیشنلزم) کی لعنت کا پیدا کردہ ہے جس نے انسانوں کو، خود ساختہ معیاروں کے مطابق مختلف ٹکڑوں میں تقسیم کر کے دنیا کو بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ [۲۴] کا الم انگیز جہنم بنا رکھا ہے۔ اسلامی نظام اس تفریق کو مٹانے کے لئے وجود میں آتا ہے۔ جس نظام کے سربراہ کا یہ اعلان ہو کہ "اگر دجلہ کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مر گیا تو اس کی ذمہ داری عمرؓ کے سر ہو گی"، کیا اس نظام میں یہ دیکھا جائے گا کہ جو شخص بھوک سے کراہ رہا ہے وہ اپنی مملکت کا باشندہ ہے یا کسی دوسری مملکت کا، وہ اپنی قوم کا فرد ہے یا غیر قوم کا، وہ کالا ہے یا گورا، وہ عربی ہے یا عجمی؟

نوعِ انسان کی طرف رسولؐ

مسلمان ہے یا کافر۔ اس نظام میں اس کی قطعاً تمیز نہیں کی جائے گی۔ اس میں انسان اور انسان میں کوئی فرق نہیں کیا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظام کے لانے والے رسولؐ کا خطاب نہ کسی خاص خطۂ زمین کے لوگوں سے تھا نہ کسی خاص قبیلہ،

نسل یا قوم کے افراد سے۔ اس کا خطاب پوری نوعِ انسانی سے تھا۔ جب اس نے کہا تھا کہ

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا ــــــ (۷/۱۵۸)

اے نوعِ انسان! میں تم سب کی طرف، خدا کا پیامبر ہوں۔

اسی جہت سے اس رسُول کو بھیجنے والے خدا نے اعلان کر دیا تھا کہ

وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ ــــــ (۲۱/۱۰۷)

ہم نے تجھے تمام اقوامِ عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

رحمت کے معنی ہیں سامانِ نشوونما جو بلامزد و معاوضہ دیا جائے۔ اور "نشوونما" میں انسان کی جسمانی پرورش اور اس کی انسانی صلاحیتوں کی تربیت اور ارتقا رسب آجاتے ہیں۔ لہٰذا حضورؐ کے ظہورِ قدسی کا مقصد یہ تھا کہ عالمگیر انسانیت کی اس طرح نشوونما ہوتی جائے کہ صحنِ عالم میں کوئی غنچہ بن کھلے مُرجھا جائے ــــ اسی رحمۃ للعالمینی کا تقاضا تھا جس کی وجہ سے آپؐ نے روم کے شاہنشاہ کو لکھا کہ

"اگر تم نے صحیح راستہ اختیار نہ کیا تو تیری مملکت میں مظلوم کاشتکاروں پر جو زیادتیاں ہو رہی ہیں اس کا سارا بار تیری گردن پر ہوگا اور ہم پر یہ فرض ہو جائے گا کہ ان مظلوموں کو اس ظلم سے بچائیں۔"

سیرتِ محمدیہ کا ایک ایک گوشہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اسلامی مملکت کے سربراہ کی ذمہ داری یہ ہے کہ دنیا میں جہاں بھی ظلم ہو رہا ہو وہ مظلوم کی فریاد کو سُنے اور اس کی مدد کو پہنچے۔

ہزار ہزار سلام و رحمت ہو نوعِ انسان کے اس محسنِ اعظمؐ پر جس نے اپنی عدیم النظیر تعلیم اور فقید المثال عمل سے دنیا کو بتا دیا کہ جو شخص انسانوں کے معاملات سنوارنے کی ذمہ داری اپنے اوپر لے اس کی اپنی زندگی کیسی ہونی چاہیئے۔ یہی وہ حیاتِ طیبہ ہے جس کے نقوش، زندگی کی شاہراہ پر تابندہ ستاروں کی طرح جگمگ جگمگ کرتے اور کاروانِ انسانیت کو اس کی منزلِ مقصود کا سراغ دیتے ہیں۔ زمانے کی ریگِ رواں پر اگر یہ نقوشِ قدم نہ ہوں تو کوئی راہرو اپنی منزل تک نہ پہنچ سکے۔

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو　　چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو خُم بھی نہ ہو　　بزمِ توحید بھی دنیا میں نہ ہو تم بھی نہ ہو

خیمۂ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

ــــــــــــ　ــــــــــــ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اسلامی آئین کے بنیادی اصول

قرآنِ کریم نے، ایمان اور اعمالِ صالحہ کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض قرار دیا ہے۔ (۲۴/۵۵) — یعنی دنیا میں مملکت اور حکومت۔ اس کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ وہ انسانی زندگی کے ہر شعبے میں راہ نمائی عطا کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے اس دعویٰ کے مطابق اس نے اس مملکت کے لئے بھی راہ نمائی دی ہو گی جسے اس نے جماعتِ مومنین کے ایمان و عمل کا فطری نتیجہ کہا ہے۔ اس نے یہ راہ نمائی دی ہے اور بڑے واضح انداز میں دی ہے۔ اس کا طریق یہ ہے کہ وہ ان امور کے لئے اصولی راہ نمائی دیتا ہے اور اسے جماعتِ مومنین پر چھوڑ دیتا ہے کہ وہ ان اصولوں کی روشنی میں اپنے اپنے حالات کے مطابق جزئیات خود مرتب کریں۔ ذیل میں ہم اسلامی مملکت کے آئین کے متعلق وہ اصول بیان کرتے ہیں جنہیں قرآنِ کریم نے ہماری راہ نمائی کے لئے عطا کیا ہے۔ جو آئین ان اصولوں کے مطابق مرتب ہو گا اسے اسلامی آئین کہا جائے گا اور جس مملکت کا وہ آئین ہو گا وہ مملکتِ اسلامی کہلائے گی۔ یہ اصول ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے لیکن ان کی روشنی میں مرتب کردہ جزئیات زمانے کے تقاضوں کے مطابق بدلتی رہیں گی۔

باب اوّل

اقتدارِ اعلیٰ

۱۔ قرآنی اصطلاح

اصطلاحات ہر دور میں بدلتی رہتی ہیں۔ ہمارے زمانے میں نظامِ مملکت، ضابطہ، قانون، آئین وغیرہ عام سیاسی اصطلاحات رائج ہیں۔ قرآنِ کریم میں ان سب کے لئے ایک جامع اصطلاح آئی ہے اور وہ ہے "الدّین"۔ یہ لفظ ان تمام قوانین وضوابط اور نظام وآئین کو محیط ہے جو انسانی زندگی کو ایک خاص منہج پر چلاتے ہیں۔ لہٰذا الدّین وہ آئینِ مملکت اور نظامِ حکومت ہے جس کے اصول خدا نے اپنی کتاب میں دیئے ہیں۔

۲۔ آئینی زندگی

قرآنِ کریم فوضویت (ANARCHY) کی زندگی پسند نہیں کرتا۔ وہ آئین ونظام کے تابع زندگی بسر کرنا سکھاتا ہے۔ وہ دور جس میں انسان خدا کے عطا کردہ (الدّین) کے مطابق زندگی بسر کریں، قرآن کی اصطلاح میں "یومُ الدّین" کہلاتا ہے۔ یعنی وہ دور جس میں الدّین (آئینِ خداوندی) کا دور دورہ ہو۔[1]

۳۔ اقتدارِ اعلیٰ

یوں تو لفظ اللہ کے معنی بھی (جس کے پہلے الف۔ لام لگ کر اللہ بنا ہے) صاحبِ اقتدار واختیار کے ہیں، یعنی اللہ کے معنی ہیں وہ ہستی جو تمام اقتدارات واختیارات کی مالک ہے۔ لیکن اس خاص صفت کے لئے قرآنِ کریم میں لفظ مالک آیا ہے۔

قرآنِ کریم کی سب سے پہلی سورۃ (سورۂ فاتحہ) میں، خدا کی ربوبیّت اور رحیمیّت (یعنی نشوونما دینے) کی

---

[1] الدّین کے معنی ظہورِ نتائج کے بھی ہیں یعنی وہ دور جس میں عمل کا نتیجہ مرتّب ہو کر سامنے آجائے یا یوں کہیئے کہ آخری فیصلوں کا دور۔ یہ اس دنیا میں بھی ہوگا اور آخرت میں بھی۔

صفات کے بعد کہا گیا ہے مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ (۱/۴) یعنی انسان کی صحیح آئینی زندگی میں اقتدار و اختیار صرف خدا کا ہوگا۔

اس مفہوم کی وضاحت قرآنِ کریم نے دوسرے مقام پر ان الفاظ میں کردی کہ مَآ اَدْرٰكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ۔ لا تجھے کیا معلوم ہے کہ یوم الدین کسے کہتے ہیں۔ ثُمَّ مَآ اَدْرٰكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ۔ تم کیا سمجھو کہ یوم الدین سے مراد کیا ہے؟ یہ کہنے کے بعد خود ہی جواب دیا کہ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا ۔ وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ۔ (۸۲/۱۷-۱۹) "جس دور میں کوئی شخص کسی دوسرے شخص پر کسی قسم کا اقتدار اور اختیار نہیں رکھے گا اور اس میں حکم صرف خدا کا ہوگا۔"[1]

اس کے معنی یہ ہیں کہ آئینِ خداوندی کی رُو سے اقتدارِ اعلیٰ صرف اللہ کو حاصل ہوگا۔ اسی لئے دوسری جگہ اسے مٰلِكَ الْمُلْكِ (۳/۲۵) کہا گیا ہے یعنی وہ ہستی جسے خارجی کائنات اور انسانوں کی مملکت میں اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہے۔ وہ اپنے اس اقتدارِ مطلق میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ وَلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (۱۸/۲۶)۔ "وہ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔" سورۃ التین میں ہے کہ فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ۔ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ (۹۵/۷-۸)۔ "اس کے بعد وہ کونسی چیز ہے جو تجھے الدین کے بارے میں جھٹلا سکتی ہے۔ کیا اللہ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں؟"

اسلامی آئین کی شقِ اوّل

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ اسلامی آئین کی شقِ اوّل یہ ہوگی کہ

مملکت میں اقتدارِ اعلیٰ خدا کو حاصل ہوگا۔ اس کے علاوہ کسی کو اقتدار و اختیار حاصل نہیں ہوگا۔

۴۔ مُسلم

جو شخص اسلامی آئین کی اس بنیادی شق کو تسلیم کرے گا اسے "مسلم" کہا جائے گا۔ اس شرط کے پورا کرنے سے وہ

---

[1] مرنے کے بعد کی زندگی میں اس دور سے کیا مراد ہے؟ اس کے متعلق قرآنِ کریم نے الگ تصریحات دی ہیں۔ اس دنیا میں یہ دور قرآنی حکومت کا قدر ہوگا۔

فرد اس مملکت کا شہری بن سکے گا۔ سورۂ انبیاء میں ہے :-

قُلْ اِنَّمَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰـهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (۲۱/۱۰۸)

ان سے کہہ دو کہ میری طرف یہ وحی ہوئی ہے کہ تمہارا صاحبِ اقتدار صرف خدائے واحد ہے۔ (اس کے بعد بتاؤ کہ) کیا تم اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہو؟

اسی کو لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا اقرار کہتے ہیں، یعنی اس امر کا اقرار کہ اللہ کے سوا کوئی اور صاحبِ اقتدار نہیں۔ اس بنیادی اصول کو ماننے والے وہ افراد ہیں جو مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کے بعد کہتے ہیں۔ اِيَّاكَ نَعْبُدُ (۱/۴) "ہم صرف تیری اطاعت اور فرمانبرداری اختیار کرتے ہیں"

یہی وہ حقیقت ہے جسے سورۂ یوسف میں ان جامع الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ۔ "حکومت اللہ کے سوا کسی اور کی نہیں ہو سکتی" اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ۔ اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی اور کی فرمانبرداری اختیار نہ کرو۔ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ۔ "یہی صحیح، سیدھا اور توازن بدوش آئینِ حیات ہے" وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ــــــ (۱۲/۴۰) لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو جانتے نہیں" اور کبھی اقتدارِ اعلیٰ کسی ایک فرد (بادشاہ یا ڈکٹیٹر) کے سپرد کر دیتے ہیں اور کبھی عوام کے متعلق سمجھتے ہیں کہ اقتدارِ اعلیٰ انہیں حاصل ہے۔ یاد رکھیئے :-

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ..... (۳/۷۸)

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ اللہ اُسے کتاب و حکومت و نبوت عطا کرے اور وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میرے فرماں پذیر بن جاؤ۔

حکومت صرف خدا کی جائز ہے ــــــ حکمراں ہے اک وہی، باقی بتانِ آذری۔

باب دوم

عملی اقتدار

تصریحات بالا سے یہ حقیقت واضح ہے کہ اسلامی آئین کی رُو سے اقتدارِ اعلیٰ صرف خدا کو حاصل ہے اور کسی

کو نہیں۔ لیکن خدا تو ایک بسیط حقیقت (ABSTRACT REALITY) ہے جو نہ کسی انسان کے سامنے آتا ہے نہ کسی سے بات کرتا ہے۔ نہ اسے کوئی دیکھ سکتا ہے۔ اس لئے اس کے اقتدار کی عملی شکل کیا ہے؟ یعنی اس کا یہ اقتدار، مملکت کے اندر نفاذ پذیر کس طرح سے ہوتا ہے۔ اس کے لئے اس نے خود ہی بتا دیا کہ اِتَّبِعُوا مَآ اُنزِلَ اِلَيْكُمْ مِّن رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِن دُونِهِۦٓ اَوْلِيَآءَ ...... (۷/۳)

"جو کچھ تمہارے رب نے تمہاری طرف نازل کیا ہے اس کا اتباع کرو اور اس کے علاوہ دیگر کارفرماؤں کا اتباع مت کرو"۔ یعنی خدا کا یہ اقتدارِ اعلیٰ اس کتاب (قرآنِ کریم) کی رُو سے نافذالعمل ہوتا ہے جسے اس نے نوعِ انسان کی راہ نمائی کے لئے نازل کیا ہے۔ اس حقیقت کو دوسرے مقام پر ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ

اِنَّآ اَنزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ...... (۴/۱۰۵)

یقیناً ہم نے تیری طرف یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی ہے تاکہ تو لوگوں میں اس کے مطابق حکومت قائم کرے جس کا اللہ نے تجھے علم دیا ہے۔

یہی چیز مومن اور کافر میں مابہ الامتیاز ہے۔ سورۂ مائدہ میں ہے۔ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَآ اَنزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُونَ (۵/۴۴) "اور جو قوم خدا کی نازل کردہ کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتی، تو یہی لوگ کافر ہیں"۔ یعنی سیکولر اور اسلامی مملکت میں فرق یہ ہے کہ اسلامی مملکت میں حکومت قرآنِ کریم کے مطابق قائم ہوتی ہے اور سیکولر حکومت میں انسانوں کی مرضی کے مطابق۔ جو لوگ قرآنِ کریم کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہ مسلمان نہیں ہو سکتے "کافر ہوتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم کرنے کا نام الاسلام ہے۔

ان تصریحات سے یہ بھی واضح ہے کہ جس ملک کے باشندے مسلمان ہوں، اس کے لئے یہ سوال فیصلہ طلب نہیں ہوتا کہ وہاں کا آئینِ مملکت قرآنِ کریم کے مطابق ہونا چاہیئے یا کوئی اور۔ جو شخص مسلمان ہوتا ہے وہ اس بنیادی حقیقت کا اقرار کرتا ہے کہ وہ اپنی زندگی قرآن کے تابع بسر کرے گا۔ اگر وہ قرآن کے سوا کوئی اور آئین چاہتا ہے، تو اس کے لئے کھلا ہوا راستہ یہ ہے کہ وہ اسلام کو چھوڑ کر کوئی اور مذہب اختیار کر لے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ مسلمان ہوتے ہوئے اپنے لئے غیر قرآنی آئین تجویز کرے۔ مسلم اور قرآنی آئین لازم و ملزوم ہیں۔

لہٰذا

اِسلامی آئین کی دوسری شق یہ ہو گی کہ

اِس مملکت میں عملاً اقتدارِ اعلیٰ قرآنِ کریم کو حاصل ہو گا جس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت قرآن کے مطابق قائم کی جائے گی اور اس کے خلاف کوئی فیصلہ قابلِ قبول نہیں ہوگا۔

۲۔ صاف اور واضح کتاب

یہ کتاب صاف اور واضح ہے، اپنے مطالب کو کھول کر بیان کرتی ہے (اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّ قُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ۳۶/۶۹) بڑی آسان ہے۔ (وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ۔ ۵۴/۳۲)۔ اس میں کوئی پیچیدگی نہیں۔ (وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۔ ۱۸/۱) اس کے منجانب اللہ ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ۔ (۴/۸۲)

کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے۔ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت سے اختلافات پاتے۔

لہٰذا یہ سمجھنا غلط ہے کہ قرآن کو ضابطۂ مملکت بنانے سے اُمّت میں اختلاف پیدا ہو جائے گا۔ یہ کتاب نوعِ انسان کے اختلافات مٹانے کے لئے آئی ہے۔ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ (۲/۲۱۳) "تاکہ یہ لوگوں میں ان امور کا فیصلہ کرے جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں"۔ اس لئے اسے مملکت کا آئین تسلیم کرنے سے تمام اختلافات مٹ جائیں گے۔

***

باب سوم

کتاب کی عملی تنقید

۱۔ وراثتِ کتاب

کتاب (خواہ کوئی بھی ہو) بہر حال حروف و الفاظ کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اسے عملاً نافذ کرنے کے لئے کسی زندہ اتھارٹی

(نظام) کی ضرورت لاینفک ہے۔ اسلامی آئین کی رُو سے، یہ اتھارٹی کسی فرد، کسی گروہ یا کسی خاص جماعت کو تفویض نہیں کی جاتی۔ یہ فریضہ پوری کی پوری اُمّت کے سپرد ہوتا ہے جسے اس کتاب کا وارث ٹھہرایا گیا ہے۔ ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ... (۳۵/۳۲) "پھر ہم نے اس کتاب کا وارث انہیں بنایا، جنہیں ہم نے اپنے بندوں میں سے (اس مقصد کے لئے) چن لیا"۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، اسلامی مملکت کا فریضہ قرآن کے اصول و قوانین کے مطابق حکومت قائم کرنا ہے۔ اسے قرآن کی اصطلاح میں "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کہتے ہیں، یعنی جس بات کو قرآن صحیح قرار دیتا ہے اس کا حکم دینا اور جو اس کی رُو سے ناپسندیدہ ہے اس سے روکنا۔ یہ فریضہ پوری کی پوری اُمّت کا قرار دیا گیا ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے:-

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ـــ (۳/۱۰۹)

تم بہترین اُمّت ہو جسے نوعِ انسان کی بھلائی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ تم معروف کا حکم دیتے ہو اور منکر سے روکتے ہو۔

۲۔ مشاورت

اُمّت یہ فرائض باہمی مشاورت سے سرانجام دے گی۔ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ - (۴۲/۳۸) "اُن کے امورِ مملکت باہمی مشورہ سے طے پائیں گے"۔

واضح رہے کہ (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) امورِ مملکت کے بارے میں قرآن اصولی راہ نمائی دیتا ہے، ان اصولوں کی جزئیات خود متعین نہیں کرتا۔ اس لئے اس نے یہ تو کہہ دیا کہ امورِ مملکت باہمی مشاورت سے طے ہوں گے، لیکن اس مشاورت کی مشینری خود متعین نہیں کی۔ اسے اُمّت پر چھوڑ دیا کہ وہ اپنے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق خود تجویز کرے کہ اس مشاورت کے لئے عملی اسکیم کونسی اختیار کرنی چاہیئے۔

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس کی روشنی میں اسلامی آئین کی تیسری شق یہ ہوگی۔

قرآنِ کریم کے مطابق حکومت کا قیام، ملّتِ اسلامیہ کا مشترکہ فریضہ ہوگا اور یہ فریضہ ان کے باہمی مشورہ سے سرانجام پائے گا۔

اس اعتبار سے یہ نظام "جمہوریہ شورائیہ" کہلا سکے گا لیکن اس شرط کے ساتھ کہ جمہور کے جملہ اختیارات قرآنِ کریم کی حدود کے اندر ہوں گے۔ وہ نہ تو ان حدود میں کمی بیشی کر سکیں گے اور نہ ان سے تجاوز۔ اس میں "مخفیا کریسی" کا شائبہ نہیں

ہوگا۔ اس لئے کہ اس مملکت میں کسی کو خدائی اختیارات حاصل نہیں ہوں گے۔ یہ صرف احکامِ خداوندی کو نافذ کرنے کا ذریعہ ہوگی۔ (تفصیل اس کی ذرا آگے چل کر ملے گی جہاں مملکت کے "قانون سازی کے اختیارات پر" بحث کی جائے گی)۔

۳۔ پارٹی سسٹم

قرآنِ کریم کی رُو سے پوری کی پوری اُمت ایک پارٹی ہے۔ اس کے اندر پارٹیوں کا وجود (خواہ وہ مذہبی فرقوں کی شکل میں ہو یا سیاسی پارٹیوں کے پیکر میں) شرک ہے۔ سورۂ روم میں ہے: وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (۳۰/۳۱-۳۲) (مسلمانو! دیکھنا تم خدائے واحد پر ایمان لا کر پھر سے کہیں) مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈال دیا اور فرقوں (پارٹیوں) میں تقسیم ہو گئے۔ پھر ہر فرقہ (پارٹی) اپنے اپنے منشور پر اترا رہا ہے"۔ دوسرے مقام پر رسول اللہ سے کہا گیا کہ اِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ ...... (۶/۱۶۰) "وہ لوگ جو اپنے دین میں فرقے پیدا کر دیں اور خود بھی ایک فرقہ یا پارٹی بن جائیں، اے رسولؐ! تمہیں ان سے کوئی سروکار نہیں"۔ وحدتِ اُمت دین کا بنیادی تقاضا ہے۔ خدا کا حکم یہ ہے کہ

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا ...... (۳/۱۰۲)

تم سب کے سب مل کر "حبل اللہ" — کتابِ خداوندی — کو مضبوطی سے تھامے رہو

اور مذہبی فرقوں یا سیاسی پارٹیوں میں مت تقسیم ہو جاؤ۔

فرقوں اور پارٹیوں سے اختلاف پیدا ہوتا ہے اور اختلاف خدا کا عذاب ہے۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ۔ (۳/۱۰۴)

(مسلمانو!) تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو پارٹیوں میں بٹ گئے اور (خدا کی طرف سے) واضح احکام آ جانے کے بعد باہمی اختلافات کرنے لگ گئے۔ ان لوگوں کے لئے سخت عذاب ہے۔

اختلافات کا مٹ جانا خدا کی رحمت ہے۔ وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ...... (۱۱/۱۱۸-۱۱۹)

"لوگ ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے بجز ان کے جن پر تیرے رب کی رحمت ہو۔"

اس مملکت میں تمام افرادِ اُمّت ایک دوسرے کو حق و استقامت کی تلقین کریں گے۔ (وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ــــــ (۱۰۳/۳)۔ اور "بر و تقویٰ" کے کاموں میں سب ایک دوسرے سے تعاون کریں گے (وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۵/۲)۔

لہٰذا اسلامی آئین کی چوتھی شق یہ ہو گی کہ

مملکت میں پوری کی پوری ملت، ایک جماعت کی حیثیت سے حکومت کی تشکیل کرے گی اور ملک میں پارٹیوں اور فرقوں کا وجود قطعاً ممنوع ہو گا۔

چونکہ مذہبی فرقوں کا مٹانا ایک دن کا کام نہیں، اس لئے اس شق میں اس امر کی تصریح کی جا سکتی ہے کہ مذہبی فرقوں کا وجود عبوری دور تک مجبوراً برداشت کیا جائے گا۔ لیکن اس دوران میں ایسے قرآنی اقدامات کئے جائیں گے جن سے کچھ وقت کے بعد، پوری ملت، امتِ واحدہ بن جائے۔

بابِ چہارم

تقسیمِ کار

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، مملکت کے اندر بسنے والی ملتِ اسلامیہ ایک اُمّت ہو گی۔ لیکن امورِ مملکت کی سرانجام دہی کے لئے تقسیمِ کار ضروری ہو گا اور مختلف کاموں کے لئے مختلف صلاحیتوں کے افراد کا انتخاب عمل میں آئے گا۔

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَآ اٰتٰكُمْ ... (۶/۱۶۶)

اللہ وہ ہے جس نے تمہیں زمین میں حکومت عطا کی اور تم میں سے بعض کو بعض پر درجوں میں بلند کیا تاکہ یہ دیکھا جائے کہ جو کچھ تمہارے سپرد کیا گیا ہے اس میں تم کیا کرتے ہو۔

قرآنِ کریم میں افرادِ اُمّت کو مختلف ناموں سے پکارا گیا ہے، مثلاً مسلمین، مومنین، صالحین یا متقین وغیرہ۔ عام طور پر یہ الفاظ مرادف معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ لیکن بعض مقامات میں ان میں اس قسم کا فرق کیا گیا ہے جس سے یہ حقیقت سامنے آ جاتی ہے کہ اگر افرادِ اُمّت کی تقسیم، جوہرِ ذاتی اور اعمال کی رو سے کی جائے تو یہ

نام اس کے مختلف طبقات کے قرار پا جائیں گے۔ اس تقسیم کی رُو سے سب سے نچلا طبقہ "مسلمین" کا ہوگا یعنی ان کا جنہوں نے بعض وجوہات کی بنا پر اسلامی آئین و مملکت کو تسلیم کر لیا ہے، لیکن ابھی تک ان کی تعلیم و تربیت ایسی نہیں ہوئی کہ ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں اُتر گیا ہو۔ سورۂ حجرات میں ہے کہ

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ۔ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا ۔ وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ... (۴۹/۱۴)

یہ بدو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ ان سے کہو کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ تمہیں یہ کہنا چاہیئے کہ ہم نے (اسلامی مملکت کی) فرمانبرداری اختیار کر لی ہے (اس لئے کہ) ابھی تک ایمان تمہارے دلوں کے اندر داخل نہیں ہوا۔

ان کے مقابلہ میں:-

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ... (۴۹/۱۵)

مومن صرف وہ ہیں جو (دل کی گہرائیوں سے) اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاتے ہیں پھر ان کے دل میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں گزرتا اور وہ اللہ کی راہ میں (نظامِ خداوندی کے لئے) اپنے مال و جان سے مسلسل جدّ و جہد کرتے ہیں۔ یہ لوگ ہیں جو اپنے دعوائے ایمان میں سچے ہیں۔

یہ حلقۂ مومنین جوں جوں اعمالِ صالحہ میں آگے بڑھتا ہے، صالحین کے زمرہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصّٰلِحِيْنَ (۲۹/۹) " اور جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور اعمالِ صالحہ کرتے ہیں، ہم ضرور انہیں طبقۂ صالحین میں داخل کریں گے"۔ "صالحین" کے معنی یہ ہیں کہ ان کی مضمر صلاحیتیں اس حد تک نشو و نما پا لیتی ہیں کہ وہ مملکتِ خداوندی کا نظم و نسق سنبھالنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ انہی کے متعلق کہا گیا ہے کہ وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ــــ (۲۱/۱۰۵)۔ "اور ہم نے زبور (یا ہر آسمانی کتاب) میں قوانین دے دینے کے بعد یہ لکھ دیا تھا کہ وراثتِ ارض (مملکت کا نظم و نسق) میرے صالح بندوں کو ملے گی"۔ اسے دورِ حاضر کی اصطلاح میں اجرائیہ یا نافذہ (EXECTIVE) کہا جا سکتا ہے۔ ان کے اوپر وہ طبقہ آتا ہے جسے مقنّنہ (LEGISLATURE) کہا جاتا

ہے۔ یہ "متقین" کا حلقہ ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے:-

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ... أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ - (۲/۱۷۷)۔

کشادگی راہ (نیکی) یہ نہیں کہ تم اپنا رخ مشرق کی سمت کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔ کشادگی راہ اس کے لئے ہے جو اللہ، آخرت، ملائکہ، کتب اور انبیاء پر ایمان لاتا ہے اور مال و دولت کو، اس کی محبت کے علی الرغم قریبیوں کو، یتیموں اور مسکینوں کو اور بے زادِ سفر مسافروں کو، محتاجوں کو اور ان کو جو دوسروں کی محکومی میں جکڑے ہوں، دیتا ہے اور وہ لوگ کہ جب وہ کسی سے عہد کریں تو اس عہد کو پورا کرتے ہیں، جو ہر مشقت اور مصیبت میں اور جنگ میں (دشمن کا مقابلہ) بڑی ثابت قدمی سے کرتے ہیں۔ یہ ہیں وہ جو اپنے دعوائے ایمان کو سچ کر دکھاتے ہیں۔ انہیں کو متقین کہتے ہیں اور جو ان میں سب سے زیادہ تقویٰ شعار (یعنی قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرنے والا) ہو، وہ سب سے زیادہ واجب التکریم ہوتا ہے۔ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ - (۴۹/۱۳) "تم میں سے جو سب سے زیادہ تقویٰ شعار ہو وہ اللہ کے ہاں سب سے زیادہ واجب التکریم ہوتا ہے۔" یہ اس مملکت کا صدرِ اعظم ہو گا۔

قرآنِ کریم کی ان آیات سے واضح ہے کہ وہ افرادِ امت میں عام مساوات کے ساتھ ساتھ تقسیم عمل کے اصول کے مطابق، مختلف مدارج کو تسلیم کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اسلامی مملکت میں ہر کام اس کے سپرد کیا جائے جو اس کا اہل ہو۔ "اہلیت" کی شرط یہ ہے کہ اس میں اس فریضہ کے سرانجام دینے کی صلاحیت ہو اور اس کی زندگی قرآنِ کریم کے مطابق ہو۔ لیکن اس تفریقِ مدارج کے یہ معنی نہیں کہ اوپر کے طبقے والوں کو نچلے طبقہ والوں پر حکومت کرنے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) اسلامی مملکت میں کسی فرد کو دوسرے فرد پر حکومت کرنے کا حق نہیں ہوتا۔ یہ تفریق و تمیز محض ذمہ داریوں کی تقسیم کے لئے ہے۔

۲۔ اُمیدوار

جو شخص اپنے آپ کو کسی خاص ذمہ داری کا اہل سمجھے، وہ اس کے لئے اپنے آپ کو بطور امیدوار پیش کر سکتا ہے۔ قرآنِ کریم نے مومنین کو یہ دعا سکھائی ہے کہ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا - (۲۵/۷۴) "تو ہمیں متقین کا امام بنا دے۔" متقین کی امامت بلند ترین مقام ہے جو اسلامی مملکت میں حاصل ہو سکتا ہے جب اس مقام کی آرزو کی

جا سکتی ہے تو دوسری ذمہ داریوں کے مقامات کی تمنا کیوں نہیں کی جا سکتی؛ اور بہ ظاہر ہے کہ جس آرزو کا دل میں پیدا ہونا معیوب نہیں اس کا زبان پر لانا کس طرح معیوب ہو سکتا ہے؛ یہی وجہ تھی کہ جب حضرت یوسفؑ نے دیکھا کہ وہ ملک کی حالت سدھارنے کی صلاحیت رکھتے ہیں تو انہوں نے بادشاہ سے کہہ دیا کہ قَالَ اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ (۱۲/۵۵) مجھے خزائنِ ارضی کا انچارج بنا دو۔ میں ان کی حفاظت کر سکتا ہوں (کیونکہ) میں اس شعبہ کا واقف کار ہوں۔

لہٰذا اسلامی آئین کی اگلی شق یہ ہوگی کہ

یوں تو افرادِ ملّت میں مساوات ہوگی لیکن تقسیمِ عمل کے اصول کے مطابق امورِ مملکت ان لوگوں کو تفویض کئے جائیں گے جن میں ان کے سرانجام دینے کی اہلیّت ہوگی۔ "اہلیّت" کے لئے یہ دیکھا جائے گا کہ ان میں متعلقہ امور کی سرانجام دہی کی صلاحیّت کس قدر ہے اور ان کی زندگی کس حد تک قرآنِ کریم کے مطابق ہے۔ اس باب میں معیارِ انتخاب جوہرِ ذاتی اور بلندیٔ کردار ہوگا؛ یعنی ہر شخص کو اس کی صلاحیّت کے مطابق کام دیا جائے گا۔

بابِ پنجم

تشکیلِ حکومت

۱۔ مرکز

اسلامی مملکت کا پورا نظام اس محور کے گرد گھومتا ہے کہ اس میں حکومت کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے؛ جو اس کی کتاب (قرآنِ کریم) کے ذریعہ نافذ العمل ہوتا ہے۔ اس نظام کو سب سے پہلے رسول اللہؐ نے متشکل فرمایا۔ اس لئے اسے قرآن میں "اللہ اور رسول" کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے؛ یعنی وہ نظامِ خداوندی جسے اس کے رسولؐ نے قائم کیا۔ رسول اللہؐ اس نظام کی مرکزی اتھارٹی تھے۔ حضورؐ کی وفات کے بعد، یہی مرکزی حیثیت آپؐ کے جانشینوں کو حاصل ہوگئی؛ یعنی امورِ مملکت کے متعلق جو فرائض رسول اللہؐ سرانجام دیتے تھے وہی فرائض آپ کی وفات کے بعد، (مثلاً) حضرت ابوبکر صدیقؓ سرانجام دیتے تھے۔

۲۔ اولوالامر (عمّالِ حکومت۔ افسرانِ ماتحت)

نظم و نسقِ حکومت کے لئے، مرکز اپنے ماتحت عمّال مقرر کرے گا۔ انہیں قرآنِ کریم نے اولوالامر (یعنی صاحبانِ حکم) کہہ کر پکارا ہے۔ ان "صاحبانِ حکم" کے فیصلوں کے خلاف مرکز میں اپیل ہو سکتی ہے، لیکن مرکز کا فیصلہ آخری ہوتا ہے۔ سورۂ نساء میں ہے:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ...... (۴/۵۹)

اے ایمان والو! تم اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اپنے میں سے "صاحبِ حکم" لوگوں کی۔ پھر اگر کسی معاملہ میں تمہارا باہمی تنازعہ ہو جائے تو اسے "اللہ اور رسول" (مرکز) کی طرف لے جاؤ۔

مرکز، اس متنازعہ فیہ معاملہ کا فیصلہ قرآنِ کریم کے مطابق کرے گا۔ وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ (۴۲/۱۰) "جس بات میں تم اختلاف کرو اس کا فیصلہ اللہ کی طرف ہے" یعنی یوں تو افسرانِ ماتحت بھی تمام اُمور کے فیصلے قرآنی احکام کے مطابق کریں گے لیکن اگر کسی معاملے میں کسی کو ان کی تعبیر سے اختلاف ہو تو اس کی اپیل مرکز کے پاس جائے گی اور مرکز کی تعبیر آخری اور قطعی سمجھی جائے گی۔ مرکز بھی کسی ایک فرد کا نام نہیں ہوگا بلکہ صدرِ مملکت کی ایک مشاورتی کونسل ہوگی۔ چنانچہ خود نبیِ اکرمؐ سے کہا گیا تھا کہ

وَشَاوِرْھُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَي اللّٰهِ ۭ (۳/۱۵۸)

اور امورِ مملکت میں ان سے مشورہ کیا کرو۔ پھر جب تم (کسی معاملہ میں) پختہ فیصلہ کر لو تو پھر قانونِ خداوندی کی محکمیت کے بھروسے پر، (اسے استقامت سے نافذ کر دیا کرو)۔

۳۔ عمّال کے لئے شرائط

عمّالِ حکومت کے لئے بھی سب سے پہلی شرط "اہلیت" ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَھْلِھَا ۙ...... (۴/۵۸) "اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ جو اختیارات تمہیں بطورِ امانت دیئے گئے ہیں، انہیں ان کے سپرد کرو جو اس کے اہل ہوں۔"

دوسری شرط علم اور صحت کی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت طالوتؑ کو بنی اسرائیل کا کمانڈر مقرر کیا تو اس

انتخاب کی وجہ یہ بتائی تھی کہ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ط (۲/۲۴۷) اللہ نے اسے تم پر (حکمرانی کرنے کے لئے) منتخب کیا ہے اور اسے علم اور جسمانی صحت سے حصّہ وافر دیا ہے۔
تیسری شرط عاقل اور بالغ ہونے کی ہے۔ سورۂ نساء میں ہے کہ تم یتیموں کے مال کی نگرانی کیا کرو حتّیٰ اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ (۴/۶) "یہاں تک کہ جب وہ نکاح کی عمر تک پہنچ جائیں اور تم ان میں عقل کی پختگی پاؤ تو ان کے مال ان کے حوالے کر دیا کرو"۔ اہم فرائض کی سرانجام دہی کے لئے چالیس سال کی عمر کی شرط بھی عائد کی جا سکتی ہے قرآن میں ہے: حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۙ ...... (۴۶/۱۵) "حتّیٰ کہ جب وہ اپنی پوری قوّت کو پہنچتا ہے اور چالیس سال کی عمر کا ہو جاتا ہے"۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ انسان میں صلاحیتوں کی پختگی بڑی عمر میں جا کر آتی ہے۔

چوتھی اور سب سے اہم شرط یہ ہے کہ جو لوگ

(i) قوانینِ خداوندی سے بے خبر ہوں۔

(ii) اپنے جذبات (انفرادی مفاد پرستیوں) کے پیچھے لگ جائیں۔ اور

(iii) جن کے معاملات حد سے گزر جائیں۔

اُن کے سپرد امورِ مملکت کبھی نہیں کرنے چاہئیں۔ قرآن کریم نے کہہ دیا ہے کہ ایسے لوگوں کا حکم کبھی نہیں مانا جائیگا۔

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا (۱۸/۲۸)

اور تو اس کا حکم مت مان جس کا دل قوانینِ خداوندی سے بے خبر ہے اور جو اپنی خواہشات کا اتباع کرتا ہے اور جس کا معاملہ حد سے گزر چکا ہے۔

۴ ۔ نااہلی

جس "صاحبِ حکم" کے اعمال (کام، معاملات) "غیر صالح" ہو جائیں، اس سے اختیارات واپس لے لینے ہوں گے، کیونکہ وہ ان کا اہل نہیں رہتا۔ حضرت نوحؑ کے بیٹے کو اس کے "غیر صالح" اعمال کی وجہ سے حضرت نوحؑ کے اہل میں سے نکال دیا گیا تھا۔ (اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ۖ (۱۱/۴۶))۔

واضح رہے کہ یہ شرائط، یا کسی کو نااہل قرار دینے کی وجوہات، عمّالِ حکومت (افسرانِ ماتحت) تک محدود

نہیں۔ ان کا اطلاق ان تمام افرادِ مملکت پر یکساں ہوگا جو کاروبارِ مملکت سے کسی نہج سے بھی متعلق ہوں — مثلاً رائے دہندگی، پارلیمان یا مجلسِ شوریٰ کی رکنیت، کابینہ کی وزارت، حتیٰ کہ مملکت کی صدارتِ عظمیٰ — یہ تمام مناصب، اہلیّت اور صالحیت کی شرائط سے مشروط ہوں گے۔

لہذا، اسلامی آئین کی اگلی شق یہ ہوگی کہ

امورِ مملکت کی سرانجام دہی کے لئے صدرِ مملکت اور اس کی مجلسِ شوریٰ پر مشتمل مرکز ہوگا۔ اس مرکز کے ماتحت عمّال ہوں گے جنہیں مرکز کی طرف سے اختیارات تفویض کئے جائیں گے۔ ماتحت عمّال کے فیصلوں کے خلاف افرادِ ملّت کو اپیل کا حق ہوگا۔ لیکن مرکز کا فیصلہ آخری اور قطعی سمجھا جائیگا۔

صدرِ مملکت، اس کی مجلسِ شوریٰ کے ارکان (یعنی وزرائے کابینہ) ارکانِ مجلسِ مقنّنہ (پارلیمان) متعلّقین ہیئتِ اجرائیہ (اربابِ حکومت) اور افسرانِ ماتحت پر اور ان دیگر افراد پر جو کسی نہ کسی انداز سے امورِ مملکت کی سرانجام دہی سے متعلّق ہوں حسبِ ذیل شرائط کا اطلاق ہوگا۔

(۱) قرآنِ کریم کے اصول و احکام سے واقفیت۔

(۲) متعلقہ امور کے سرانجام دینے کی اہلیّت۔ اس میں علومِ حاضرہ بھی شامل ہیں۔

(۳) صالحیت، یعنی سیرت و کردار کی پاکیزگی۔

(۴) ذاتی جذبات و مفاد سے بلند ہو کر، معاملات کی سرانجام دہی کی صلاحیت۔

(۵) عاقل، بالغ اور تندرست ہونا۔

اگر کوئی شخص کسی وقت ان شرائط میں سے کسی شرط پر پورا نہ اترے تو جس طریق سے اس کا انتخاب یا تقرر عمل میں آیا تھا، اسی طریق سے اسے معطّل یا برطرف کیا جا سکتا ہے۔

بابِ ششم

مقنّنہ کے اختیارات

اسے پھر دہرا دیا جائے کہ قرآنِ کریم نے انسانی زندگی کے لئے اصولی راہ نمائی دی ہے اور (بجز چند مستثنیات)

ان کی جزئیات خود متعین نہیں کیں جس کتابِ عظیم کو ہر زمانے کے انسانوں کے لئے ضابطۂ حیات بننا ہو، اسے ایسا ہی ہونا چاہیے۔ اس لئے کہ انسانی زندگی سے متعلق اصول تو غیر متبدل ہوتے ہیں لیکن ان کی جزئیات غیر متبدل نہیں رہ سکتیں۔ انہیں زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق قابلِ تغیر و تبدل ہونا چاہیے جس وقت قرآن نازل ہو رہا تھا، بعض لوگوں نے چاہا کہ قرآنی اصولوں کی جزئی تفاصیل بھی قرآن میں بیان کردی جائیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسے سوالات سے سختی سے روک دیا اور کہا کہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ وَإِنْ تَسْأَلُوا عَنْهَا حِينَ يُنَزَّلُ الْقُرْآنُ تُبْدَ لَكُمْ ۖ عَفَا اللَّهُ عَنْهَا ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ ۔ قَدْ سَأَلَهَا قَوْمٌ مِنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ أَصْبَحُوا بِهَا كَافِرِينَ (۵/۱۰۱-۱۰۲ نیز ۲/۱۰۸)

اے ایمان والو! ان چیزوں کے متعلق (جو قرآن میں بیان نہیں کی گئیں) سوال نہ کیا کرو۔ اگر انہیں تمہارے لئے ظاہر (بیان) کردیا جائے تو وہ باعثِ تکلیف ہو جائیں گی۔ اور اگر تم ان کے متعلق ایسے وقت دریافت کرو جب کہ قرآن نازل ہو رہا ہے تو انہیں تمہارے لئے بیان کردیا جائے گا۔ (جو سوالات تم اس وقت تک کر چکے ہو) اللہ اس سے درگزر کرتا ہے۔ وہ غفور و حلیم ہے۔ تم سے پہلے ایک قوم نے (اس قسم کے) سوالات پوچھے تھے (اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ) انہوں نے (بعد ازاں) ان کے ماننے سے انکار کردیا۔

قرآنِ کریم کے غیر متبدل اصولوں کی جزئیات متعین کرنا، اسلامی مملکت کی مجلسِ مقننہ کا کام ہوگا۔ یہ اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے، لیکن ان کی جزئیات میں عند الضرورت تغیر و تبدل یا حک و اضافہ ہوتا رہے گا۔ ان اصولوں کے متعلق فرمایا۔

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (۶/۱۱۶)

اور تیرے رب کی بات صدق اور عدل کے ساتھ مکمل ہوگئی۔ اس کی باتوں کو بدلنے والا کوئی نہیں۔ (اس لئے کہ یہ اس خدا کی متعین کردہ باتیں ہیں) جو سب کچھ سننے والا، جاننے والا ہے۔

اس میں نہ کسی سے کسی قسم کی مفاہمت (COMPROMISE) کی جا سکتی ہے، نہ کسی کی رعایت کی جا سکتی ہے۔

سورۂ یونس میں ہے:۔

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ ۙ قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا ائْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَٰذَا أَوْ بَدِّلْهُ ۚ قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِي ۖ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ ۖ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ (۱۰/۱۵)

اور جب ان کے سامنے ہمارے واضح قوانین پیش کئے جاتے ہیں تو وہ لوگ جو ہمارے سامنے آنے کی آرزو نہیں رکھتے، کہتے ہیں کہ اس قرآن کے بجائے کوئی دوسرا قرآن (ضابطۂ قوانین) لاؤ (تو ہم تمہارے ہمنوا ہوں گے یا کم از کم) اس میں (ہماری منشاء کے مطابق) تبدیلی کر دو۔ ان سے کہہ دو کہ مجھے کیا اختیار ہے جو میں اپنی طرف سے اس میں کوئی ردّ و بدل کر سکوں؟ میں تو صرف اپنی وحی کی پیروی کرنے (کے لئے بھیجا گیا ہوں) اگر میں اس باب میں اپنے ربّ کی نافرمانی کروں تو میں ایک سخت مصیبت انگیز عذاب سے ڈرتا ہوں۔

لہٰذا اسلامی آئین کی اگلی شق یہ ہوگی کہ

مملکت کی مجلسِ مقننہ، قرآنِ کریم کے غیر متبدّل اصولوں کی چاردیواری کے اندر رہتے ہوئے اپنے زمانے کی ضرورتوں کے مطابق، جزئی قوانین مرتب کرنے کا اختیار رکھے گی۔ ان اصولوں میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی جائے گی۔ البتہ ان کی حدود کے اندر جو جزئی قوانین باہمی مشاورت سے مرتّب ہوں گے، عندالضّرورت ان میں ترمیم و تنسیخ یا حک و اضافہ ہو سکے گا۔ ملک میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں ہوگا جو قرآنی حدود سے ٹکرائے۔

بابِ ہفتم

اسلامی مملکت کا پورا نظام، عدل کے محور کے گرد گردش کرتا ہے۔ عدل کے معنی یہ ہیں کہ

(۱) تمام انسانوں کو پیدائش کے اعتبار سے یکساں واجب التّکریم سمجھا جائے۔

(۲) ہر ایک کی صلاحیتوں کی نشو و نما کے لئے یکساں ذرائع اور مواقع بہم پہنچائے جائیں۔

(۳) معاشرہ میں ان کی پوزیشن ذاتی صلاحیتوں کی رُو سے متعیّن کی جائے۔

(۴) ہر ایک کو اس کی صلاحیت کے مطابق کام دیا جائے۔

(۵) کسی کو بنیادی حقوقِ انسانیت سے محروم نہ کیا جائے۔

(۶) متنازعہ فیہ معاملات کے فیصلے اُسی قانون کی رُو سے کئے جائیں جو قرآن کے اصولوں پر متفرع ہو اور جس کا اطلاق ہر ایک پر یکساں طور پہ کیا جائے۔

عدل کے لئے قرآنِ کریم نے خاص طور پہ کہا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ...... (۱۶/۹۰) یقیناً اللہ عدل کا حکم دیتا ہے۔ یہ ایک ایسا مطلق حکم ہے جس میں کسی حالت میں استثناء نہیں ہو سکتا حتّٰی کہ جو لوگ ہم سے دشمنی کریں ان سے بھی عدل کرنا ضروری ہوگا۔ سورۂ مائدہ میں ہے: وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی (۵/۸) "کسی قوم کی دشمنی بھی تمہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم ان سے عدل نہ کرو۔ بہرحال عدل کرو۔ یہ روش تقویٰ سے قریب تر ہے"۔

عدل کا تقاضا یہ بھی ہے کہ مجرم کو اس کے کئے کی سزا ملے۔ اس سلسلہ میں قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ وَلَکُمْ فِی الْقِصَاصِ حَیٰوۃٌ یّٰاُولِی الْاَلْبَابِ.... (۲/۱۷۹) "اے صاحبانِ عقل و بصیرت! تمہارے لئے قانونِ قصاص میں زندگی کا راز پوشیدہ ہے۔ لیکن سزا ہمیشہ باندازۂ جرم ہونی چاہیئے۔ جَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ بِمِثْلِھَا ـــ (۱۰/۲۷) اور جہاں دیکھا جائے کہ مجرم اپنے کئے پر نادم ہے اور اس میں اصلاح کا امکان ہے اسے معاف بھی کیا جا سکتا ہے۔ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُہٗ عَلَی اللّٰہِ (۴۲/۴۰) جو شخص (مجرم کو) معاف کر دے اور اس طرح اس کی اصلاح کر دے تو اس حسنِ عمل کا بدلہ اللہ سے ملے گا۔

عدل کا تقاضا یہ بھی ہے کہ جرم کی سزا صرف مجرم کو ملے۔ وَلَا تَکْسِبُ کُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَیْھَا۔ (۶/۱۶۵) اور جو جرم کرے گا اس کا وبال اسی پر پڑے گا۔ نیز یہ بھی کہ ہر شخص اپنی ذمہ داری آپ اُٹھائے۔ لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ـــ (۶/۱۶۵) "کوئی بوجھ اُٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا"۔

قرآنِ کریم نے نظامِ عدل کی تمام تفاصیل کو دو لفظوں میں بیان کر دیا ہے جہاں کہا ہے کہ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ (۲/۲۷۹) "نہ تم کسی پر زیادتی کرو اور نہ تم پر زیادتی ہو"۔

ظاہر ہے کہ اس نظامِ عدل کو ایسے افراد ہی قائم رکھ سکتے ہیں جو نہ اپنے میلانات اور عواطف سے اثر پذیر ہوں اور نہ ہی جن پر کسی قسم کا کوئی خارجی دباؤ ہو۔ عدل کے معاملے میں مفاہمت (COMPROMISE) کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ـــ نہ اپنی ذات کے ساتھ اور نہ ہی کسی خارجی قوت کے ساتھ ـــ یہی وہ حقیقت ہے جس کی

طرف قرآن نے یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ (۶۸/۹) یہ چاہتے ہیں کہ تو مداہنت اختیار کرے تو یہ بھی مداہنت اختیار کرلیں۔ تو تھوڑا سا اپنے مقام سے ہٹ جائے تو یہ تم سے مفاہمت کرلیں۔ نظامِ عدل میں ایسا نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے اسلامی مملکت میں عدلیہ کو خارجی اثرات سے قاطبۃً آزاد رکھنا چاہیئے۔

لہٰذا اسلامی آئین کی ایک شق یہ ہونی چاہیئے کہ

مملکت کا پورا کاروبار عدل کے بنیادی اصول کے مطابق طے پائے گا۔ عدل سے مختصراً مراد یہ ہے کہ

(i) تمام انسانوں کو پیدائش کے لحاظ سے یکساں واجب التکریم سمجھا جائے

(ii) ہر ایک کی صلاحیتوں کے لئے یکساں ذرائع اور مواقع بہم پہنچائے جائیں۔

(iii) معاشرہ میں ہر ایک کی پوزیشن اس کی ذاتی صلاحیت اور کردار کی رُو سے متعیّن کی جائے۔

(iv) ہر ایک کو اس کی صلاحیت کے مطابق کام دیا جائے۔

(v) کسی کو بنیادی حقوق سے محروم نہ کیا جائے۔

(vi) مجرم کو اس کے جرم کی سزا ملے اور سزا باندازۂ جرم ہو اور جہاں اصلاح کا امکان ہو وہاں سزا سے معافی دے دی جائے۔

(vii) ہر شخص اپنا اپنا بوجھ خود اٹھائے

(viii) نہ کوئی تم پر زیادتی کرے۔ نہ تم کسی پر زیادتی کرو۔ اور

(ix) تمام متنازعہ فیہ امور کے فیصلے اس قانون کی رُو سے طے پائیں جو قرآن کے اصولوں پر متفرع ہو۔

عدلیہ، نظامِ عدل کے قیام کا ذمّہ دار ہوگا۔ وہ ہر قسم کے خارجی اثر یا دباؤ سے آزاد ہوگا۔ عدالتِ عالیہ کے قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کا تقرّر پارلیمان کی تصویب سے ہوگا۔

(x) عدل کا حصول بلا معاوضہ ہوگا اور حکومت کی طرف سے مفتی مقرر ہوں گے جو لوگوں کو بتائیں گے کہ قانون کی رُو سے ان کے دعوے یا مطالبہ کی پوزیشن کیا ہے۔

باب ہشتم
مملکت کے مقاصد

قرآن کریم کی رُو سے مملکت مقصود بالذات نہیں مقصود بالذات فرد ہے اور مملکت فرد کی انفرادیت کے تحفظ اور اس کی ذات کی نشوونما اور استحکام کا ذریعہ ہے۔ قرآن نے مملکت کے سامنے جو پروگرام رکھا ہے وہ اسی بلند مقصد کے حصول کے لئے ہے۔ اسے اس نے مختلف مقامات پر مختلف انداز سے بیان کیا ہے۔ مثلاً سورۂ نور میں ہے:۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ......
وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔ (۲۴/۵۵)۔

اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لاتے ہیں اور اعمالِ صالحہ کرتے ہیں، یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ انہیں زمین میں حکومت عطا کرے گا جیسی کہ اس نے ان قوموں کو حکومت عطا کی جو ان سے پہلے ہو گزری ہیں۔ (حکومت عطا کرنے سے مقصد یہ ہے کہ) وہ ان کے لئے ان کے اس دین کو جو اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے مستحکم کر دے اور اُن کے خوف کو امن سے بدل دے۔ (اور اس طرح انہیں اس قابل بنا دے کہ) وہ صرف میری محکومیت اختیار کریں اور میری محکومیت میں کسی اور کو شریک نہ کریں جو اس کے بعد بھی اس دین سے انکار کرے تو یہی لوگ ہیں جو فاسق ہیں۔

اس کے بعد ہے:۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۔ (۲۴/۵۶)

اور تم نظامِ صلوٰۃ قائم کرو اور ایتائے زکوٰۃ کا انتظام کرو، اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تمہاری نشوونما ہوتی رہے۔

ان آیات میں مجمل طور پر اسلامی مملکت کے مقاصد کو بیان کیا گیا ہے، یعنی مملکت سے مقصود یہ ہے کہ

(۱) الدین کے نظام کا استحکام ہو۔ (۲) افرادِ مملکت کو کسی قسم کا خوف و حزن نہ ہو۔

(۳) اطاعت صرف قوانینِ خداوندی کی ہو۔

(۴) ایسا معاشرہ قائم کیا جائے جس میں ہر فرد از خود پوری دلجمعی سے قوانینِ خداوندی کے پیچھے پیچھے چلے (اسے نظامِ صلوٰۃ کہتے ہیں) اور

(۵) پہلے افرادِ مملکت کو، اور اس کے بعد تمام نوعِ انسان کو سامانِ نشوونما ملتا رہے۔

افرادِ مملکت، اس نظام کے مرکز کی اطاعت انہی مقاصد کے بروئے کار لانے کے لئے کریں گے اور اسی سے اُن کی

اپنی ذات کی نشوونما ہوگی۔

اس جگہ قرآنِ کریم نے ان مقاصد کو ذرا تفصیل سے بیان کیا ہے۔ دوسرے مقامات پر انہیں "اقامتِ صلوٰۃ" اور "ایتائے زکوٰۃ" کی جامع اصطلاحات میں سمٹا کر رکھ دیا ہے۔ مثلاً سورۂ حج میں ہے۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ۔ (۲۲/۴۱)

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر انہیں ملک میں حکومت مل جائے گی تو یہ "اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ" کریں گے اور معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے اور تمام امور اللہ کے لئے سرانجام پائیں گے۔

لہٰذا اسلامی مملکت کا بنیادی مقصد، افرادِ مملکت کو قوانینِ خداوندی کے مطابق چلانا اور ان کی نشوونما کا سامان بہم پہنچانا ہے۔ نشوونما میں، افراد کی تمام طبیعی ضروریات بھی شامل ہیں اور ان کی ذات کی مضمر صلاحیتوں کی برومندی بھی۔

اللہ کی ذمہ داریاں

قبل اس کے کہ ہم اس اجمال کی تفصیل تک پہنچیں، ایک بنیادی نکتہ کی وضاحت ضروری ہے۔ جب اسلامی مملکت انسانوں سے خدا کے قوانین کی اطاعت کراتی ہے تو انسانوں کے متعلق جو ذمہ داریاں خدا نے اپنے اوپر لے رکھی ہیں، مملکت ان ذمہ داریوں کو بھی پورا کرتی ہے۔ ان ذمہ داریوں کا پورا کرنا اسلامی مملکت کا بنیادی فریضہ ہے۔

ان ذمہ داریوں میں سب سے اہم اور بنیادی ذمہ داری سامانِ رزق کا بہم پہنچانا ہے۔ "رزق" میں وہ سامانِ زیست آجاتا ہے جس سے انسان کے جسم کی پرورش اور اس کی ذات کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی ہے۔ سورۂ ہود میں ہے:۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِى الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا ــــ (۱۱/۶)

اور زمین میں کوئی متنفس (چلنے والا) ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو۔

یہی وہ ذمہ داری ہے جس کے پیشِ نظر اسلامی مملکت، افرادِ مملکت کو مخاطب کر کے کہتی ہے کہ

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ (۶/۱۵۲)

ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی۔

جہاں تک انسان کی جسمانی ضروریات کا تعلق ہے قرآن نے روٹی، کپڑا، مکان وغیرہ کو ان میں شامل کیا ہے۔ (دیکھئے ۲۰/۱۱۸)

لہٰذا اسلامی آئین کی اگلی شق یہ ہوگی۔

مملکت مقصود بالذات نہیں، مقصود بالذات فرد ہے۔ مملکت فرد کی انفرادیت کے تحفظ اور اس کی

ذات کے استحکام کا ذریعہ ہے اس مقصد کے حصول کیلئے مملکت ان تمام ذمہ داریوں کو پورا کرے گی جنہیں انسانوں کے ضمن میں خدا نے اپنے اوپر لے رکھا ہے. ان میں رزق (سامانِ زیست) کی بہم رسانی سب سے مقدم ذمہ داری ہے۔ اس کے لئے مملکت ایسا انتظام کرے گی جس سے تمام افرادِ مملکت کو (ان کی اور ان کے بیوی بچوں کی) بنیادی ضروریاتِ زندگی باطمینان ملتی رہیں اور کوئی فرد ان سے محروم نہ رہے۔ نیز مملکت وہ تمام اسباب و ذرائع بہم پہنچائے گی جن سے ہر فرد کی ذات کی مضمر صلاحیتیں نشوونما پا سکیں۔

وسائلِ پیداوار

ظاہر ہے کہ مملکت ان عظیم ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتی جب تک وسائلِ پیداوار مملکت کی تحویل میں نہ ہوں۔ قرآنِ کریم نے وسائلِ پیداوار (ارض) کو تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رکھنے کے لئے کہا ہے (سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ ۔ ۴۱/۱۰) اور (مَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ ۔ ۵۶/۷۳) "بھوکوں کے لئے متاعِ حیات" قرار دیا ہے۔ وسائلِ پیداوار کے علاوہ فاضلہ دولت بھی اصلاً مملکت کی تحویل میں رہتی ہے۔ (اصلاً سے مراد یہ ہے کہ اساسی طور پر وہ مملکت کی تحویل میں ہوتی ہے لیکن مملکت اپنی انتظامی سہولتوں کے لئے چاہے تو اسے افراد کے پاس بطور امانت رکھ سکتی ہے) فاضلہ دولت کے ضمن میں سورۂ بقرہ میں ہے: يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ط قُلِ الْعَفْوَ ط ــــــ (۲/۲۱۹) "تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم (دوسروں کے لئے) کس قدر دولت کھلی رکھیں۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضروریات سے زیادہ ہے سب۔" اسلامی مملکت میں نہ وسائلِ رزق کسی کی ذاتی ملکیت میں رہتے ہیں اور نہ فاضلہ دولت۔ مملکت کے پاس بھی یہ چیزیں بطورِ امانت رہتی ہیں تاکہ وہ انہیں قرآنی اصولوں کے مطابق صرف کرے۔

لہٰذا اسلامی آئین کی اگلی شق یہ ہو گی کہ

مذکورہ صدر ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ضروری ہے کہ مملکت کے ذرائع پیداوار مملکت کی تحویل میں ہوں اور فاضلہ دولت افراد کی ملکیت متصور نہ ہو۔ یہ سب بطور امانت مملکت کی تحویل میں رہیں تاکہ مملکت انہیں نوعِ انسانی کی نشوونما کے کام میں لائے بالفاظِ دیگر مملکت میں قرآنِ کریم کا نظامِ ربوبیت نافذ ہو۔[1]

---

[1] اس اجمال کی تفصیل کے لئے میری کتاب "نظامِ ربوبیت" دیکھئے۔

باب نہم

افراد اور مملکت کا تعلّق

چونکہ مملکت کا فریضہ ان تمام ذمّہ داریوں کا پورا کرنا ہے جو انسانوں کے سلسلے میں خدا نے اپنے اوپر لے رکھی ہیں، اس لئے افرادِ مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ خدا نے جو واجبات ان پر عائد کر رکھے ہیں، وہ مملکت کو ادا کریں۔ اس سلسلہ میں قرآن نے، مملکت اور افراد کا تعلّق ایک معاہدہ کی رُو سے قائم کیا ہے جو بڑا جامع ہے۔ سورۂ توبہ میں ہے:-

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ۔ (۹/۱۱۱)

یقیناً اللہ نے مومنین سے اُن کے نفوس اور اموال جنّت کے عوض خرید لئے ہیں۔

یعنی افرادِ مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنی جان اور مال، حکومتِ خداوندی کی امانت سمجھیں اور مملکت کی ذمّہ داری یہ ہے کہ ان کے لئے ایسا انتظام کرے کہ انہیں یہاں بھی جنّتی زندگی میسّر ہو اور آخرت میں بھی۔ اس معاہدہ کو اسلامی آئین کے اندر شامل ہونا چاہیئے۔

لہٰذا اس آئین کی اگلی شق یہ ہوگی کہ

افرادِ مملکت، اپنی جان اور مال کو مملکت کی امانت سمجھیں گے کہ وہ انہیں عند الضرورت احکامِ خداوندی کے مطابق طلب کرے اور مملکت ایسا انتظام کرے گی جس سے انہیں اس دنیا اور آخرت دونوں میں جنّت کی زندگی میسّر ہو جائے۔ یہ معاہدہ جانبین کی طرف سے مساوی ہوگا۔

باب دہم

بُنیادی حقوق

مملکت میں افراد کو کون سے بنیادی حقوق حاصل ہوتے ہیں؛ اس سوال نے ہمارے زمانے میں بڑی اہمیّت حاصل کر رکھی ہے۔ اس ضمن میں، مختلف آئینی مملکتوں کے دساتیر میں بنیادی حقوق کی فہرست شامل

ہوتی ہے۔ اقوامِ متحدہ نے اپنے خاص منشور میں ان حقوق کی تصریح کر رکھی ہے۔ لیکن کسی مملکت کا آئین ہو یا اقوامِ متحدہ کا منشور، ان میں تمام بنیادی حقوق مشروط ہوتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں یہ حقوق بہ طورِ اقدار (VALUES) دیئے گئے ہیں۔ ان میں سے بیشتر اقدار مستقل یا مطلق ہیں اور کچھ اضافی۔ مستقل اقدار سے مراد ہیں ایسے حقوق جو غیر مشروط ہیں اور اضافی اقدار سے مفہوم، مشروط حقوق ہیں۔ مثلاً رزق (سامانِ زیست) کا ملنا ایک مستقل قدر ہے۔ یہ فردِ مملکت کو بلا شرط ملے گا۔ کوئی فرد کسی حالت میں بھی اس سے محروم نہیں رکھا جائے گا۔ اس کے برعکس جان کی حفاظت، اضافی قدر ہے۔ اگر کوئی شخص کسی بے گناہ کو قتل کر دے گا تو اس جرم کی پاداش میں اسے سزائے موت دی جا سکے گی۔ اس سے مستقل اقدار اور اضافی اقدار کا فرق سمجھ میں آجائے گا۔ (جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے) قرآنِ کریم میں بیشتر اقدار مستقل ہیں اور کچھ اقدار اضافی۔ اس کی تفصیل اس مقالہ میں دی جا چکی ہے جو "انسان کے بنیادی حقوق" کے عنوان سے، پہلے آپ کی نظروں سے گزر چکا ہے۔

لہٰذا اسلامی مملکت کے آئین کی ایک شق یہ ہوگی کہ

افرادِ مملکت کو وہ تمام بنیادی حقوق حاصل ہوں گے جن کی تفصیل قرآنِ کریم میں دی گئی ہے اور جسے الگ فہرست میں درج کر دیا گیا ہے) ان میں سے جو حقوق مشروط ہیں ان کی شرائط بھی وہی ہوں گی جو قرآنی اصولوں کی روشنی میں متعین کی جائیں گی۔

بابِ یازدہم

غیر مسلموں کی پوزیشن

اسلامی مملکت میں بسنے والے غیر مسلموں کی پوزیشن کا سوال بڑا اہم ہے۔ اس لئے اسے اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔ دنیا کی مروّجہ سیاست میں، قومیت کی تشکیل، وطن یا نسل کے اشتراک سے کی جاتی ہے، بالخصوص وطن کے اشتراک سے، یعنی ایک ملک کے بسنے والے تمام افراد، بلا تمیز مذہب ایک قوم بن جاتے ہیں۔ لیکن قرآن کی رُو سے، قوم کی تشکیل، آئیڈیالوجی کی بنیاد پر ہوتی ہے یعنی جو لوگ اسلامی آئیڈیالوجی کو

تسلیم کریں وہ ایک قوم کے افراد۔ اور جو اس آئیڈیالوجی پر ایمان نہ رکھیں وہ قوم کے دائرہ سے باہر، خواہ وہ اسی ملک میں کیوں نہ بستے ہوں۔ قرآن نے نوعِ انسان کی تفریق اسی معیار کے مطابق کی ہے۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ - (۶۴/۲)

اللہ وہ ہے جس نے تم (انسانوں) کو پیدا کیا۔ سو تم میں سے کچھ کافر ہیں کچھ مومن۔

وہ اپنی آئیڈیالوجی کی دعوت کو عام کرتا ہے، یعنی وہ اس دعوت کو دنیا کے تمام انسانوں کے سامنے بلا لحاظ رنگ، نسل، وطن، زبان، مذہب یکساں طور پر پیش کرتا ہے اور ان سے کہہ دیتا ہے کہ وہ اس آئیڈیالوجی پر خود غور و فکر کریں اور اس کے بعد علیٰ وجہ البصیرت اور بطیب خاطر (یعنی دل اور دماغ کی رضامندی سے) سمجھیں کہ یہ آئیڈیالوجی ان کے لئے قابلِ قبول ہے تو اُسے قبول کریں اور اگر ایسا نہ سمجھیں تو اسے مسترد کر دیں۔ اس میں کسی قسم کا جور و اکراہ نہیں ہوگا۔ (لَآ إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ ۲/۲۵۶) یہ بھی قرآن کی مستقل قدر یا افرادِ مملکت کا بلا مشروط حق ہے۔ اس نے واضح طور پر کہہ دیا کہ

إِنَّا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ ۚ فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَلِنَفْسِهِ ۖ وَمَنْ ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۖ وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيلٍ - (۳۹/۴۱)

ہم نے تجھ پر یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی ہے جو تمام انسانوں کے لئے یکساں طور پر کھلی ہے) سو جو شخص (اسے قبول کر کے) سیدھی راہ پر چلے گا تو اس کا فائدہ خود اُسے پہنچے گا اور جو غلط راستہ اختیار کرے گا تو اس کا نقصان خود بھگتے گا! اے رسول! تو ان کے فیصلے اور عمل کا ذمہ دار نہیں۔ (نہ ہی ان پر داروغہ مقرر کیا گیا ہے کہ انہیں زبردستی صحیح راستے پر لائے)۔

اس سے قرآن نے، اسلامی ملت میں شامل ہونے اور اسلامی مملکت میں شریکِ کار بننے کے لئے دروازہ کھلا چھوڑ دیا ہے کہ جس کا جی چاہے اندر داخل ہو جائے۔ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا - (۷۳/۱۹) "جس کا جی چاہے اپنے ربّ کی طرف جانے کا راستہ اختیار کر لے"۔ اس "اذنِ عام" کے بعد اگر کوئی شخص اس کے اندر نہیں آنا چاہتا تو وہ اپنے عمل کا آپ ذمہ دار ہے۔ سورۂ فاطر میں اس حقیقت کو واضح الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے جہاں کہا ہے کہ هُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ ۚ "اللہ وہ ہے جس نے تمہیں زمین میں حکومت عطا کی ہے۔ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ ۖ "اگر کوئی شخص اس آئین و دستور کو نہیں مانتا جس پر اس حکومت کی عمارت اُستوار ہے تو اس کے لئے وہ خود ذمہ دار ہے"۔ اس آئینِ مملکت (اسلامی آئیڈیالوجی) کو تسلیم نہ کرنے سے اگر وہ کسی

قسم کے نقصان میں رہتا ہے تو اُسے اس کی شکایت نہیں کرنی چاہیئے۔ اس لئے کہ خود کردہ را علاجے نیست ــــ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ ۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ایک شخص کسی آئیڈیالوجی کو تسلیم نہ کرے لیکن اسے تسلیم کرنے والوں کو جو مفاد حاصل ہیں ان میں برابر کا شریک ہونا چاہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ اگر اس کے انکار سے اسے کچھ نقصان ہوتا ہے تو اسے اس نقصان کو برداشت کرنا ہوگا۔ وَلَا يَزِيْدُ الْكٰفِرِيْنَ كُفْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ اِلَّا مَقْتًا ۔ وَلَا يَزِيْدُ الْكٰفِرِيْنَ كُفْرُهُمْ اِلَّا خَسَارًا۔ (۳۵/۳۹)۔ اس انکار سے انہوں نے خیر و برکت کے جو دروازے اپنے اوپر بند کئے ہیں اس کے نقصان کے وہ خود ذمہ دار ہیں۔ اس کا افسوس ضرور ہے۔ (يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ ۚ ۳۶/۳۰) لیکن اس کا علاج ہمارے پاس نہیں۔ علاج خود ان کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ یہ دروازہ ہر وقت کھلا رہتا ہے وہ جس وقت بھی اپنی غلطی کو محسوس کریں اس کا ازالہ کر لیں۔ اس آئیڈیالوجی کو تسلیم کر لیں اور بلا روک اس کے اندر داخل ہو جائیں۔

انہیں شریکِ راز نہیں کیا جا سکتا

لہٰذا اسلامی مملکت میں بسنے والوں میں سے جو لوگ اسلامی آئیڈیالوجی کو تسلیم نہ کریں انہیں شریکِ حکومت نہیں کیا جا سکتا۔ اس باب میں قرآنِ کریم نے مختلف مقامات پر اس شرح و بسط سے وضاحت کر دی ہے کہ اس کے اس تصور کو سمجھنے میں کسی قسم کی دقت پیش نہیں آسکتی۔ شریکِ حکومت کرنا تو ایک طرف وہ انہیں شریکِ راز بھی نہیں کر سکتا۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ...... اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ۔ (۳/۱۱۷–۱۱۹)

اے ایمان والو! اپنوں کے سوا کسی اور کو اپنا رازدار نہ بناؤ۔ وہ تمہاری تخریب میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔ جس بات سے تمہیں نقصان اور مصیبت پہنچے وہ اُسے دل سے پسند کرتے ہیں۔ ان کے سینے کے اندر چھپے ہوئے جذباتِ بغض و عناد میں سے بعض اوقات کچھ (بے اختیار) ان کی زبان سے ظاہر ہو جاتے ہیں۔ لیکن جو اُن کے سینے کے اندر چھپے رہتے ہیں وہ ان ظاہر ہو جانے والوں کے مقابلہ میں کہیں بڑھ کر ہیں۔ ہم نے تمام باتیں اچھی طرح واضح کر دی ہیں۔ اگر تم عقل و فکر

سے کام لو گے (تو ان کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی)۔ ذرا سوچو تو سہی! کیا تم ان لوگوں سے محبت کرو گے جو تم سے کبھی محبت نہیں کرتے۔ حالانکہ تم (اپنی اور ان کی) تمام کتابوں پر ایمان رکھتے ہو اور جب یہ لوگ تم سے ملنے آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی (تمہاری آئیڈیالوجی کو) صحیح تسلیم کرتے ہیں اور جب علیحدہ ہوتے ہیں تو غصے کے مارے اپنی انگلیاں کاٹتے ہیں۔ ان سے کہو کہ جاؤ اپنے غصے (کی آگ) میں جل مرو۔ اللہ تمہارے سینوں کے اندر چھپے ہوئے جذبات تک سے واقف ہے۔ اگر تمہاری حالت بہتر ہو جائے تو یہ چیز انہیں سخت ناگوار گزرتی ہے۔ اور اگر تمہیں کوئی تکلیف پہنچے تو یہ اُس سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ یاد رکھو! اگر تم استقامت سے رہو گے اور ان مخالفین سے اپنی حفاظت کا سامان کرتے رہو گے تو ان کی کوئی سازش تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔ اللہ ان کے تمام اعمال کو محیط ہے۔

قرآنِ کریم میں اس مضمون کی بہت سی آیات ہیں (مثلاً ۳/۱۲۰، ۶۰/۱-۴، ۹/۲۳-۲۴ وغیرہ)

یہ تنگ نظری نہیں

حیرت ہے کہ بعض حلقوں میں اس نظریہ کو قابلِ اعتراض سمجھا جاتا ہے اور اسے "تنگ نظری" پر محمول کیا جاتا ہے۔ حالانکہ کوئی نظام جو آئیڈیالوجی کی بنیادوں پر استوار ہو، ان لوگوں کو کبھی شریکِ حکومت نہیں کر سکتا جو اس آئیڈیالوجی کے مخالف ہوں۔ آئیڈیالوجی تو خیر بہت بڑی چیز ہے، عام جمہوری حکومتوں میں جو پارٹی برسرِ اقتدار ہو وہ مخالف پارٹی کے افراد کو شریکِ حکومت نہیں کرتی۔ اسلام کے معاملہ میں بات اس سے بھی کہیں آگے بڑھ جاتی ہے۔ اسلامی مملکت کا آئین درحقیقت اس کی آئیڈیالوجی ہوتا ہے۔ جو لوگ آئیڈیالوجی کو نہیں مانتے وہ اس مملکت کے آئین کو تسلیم نہیں کرتے۔ اب سوچئے کہ دنیا میں کوئی مملکت ایسی بھی ہو سکتی ہے جو ان لوگوں کو شریکِ حکومت کرے جو اس کے آئین کو تسلیم نہ کریں؟ کیا یہ عجیب بات نہ ہوگی کہ اسلامی مملکت کا مقصد اور نصب العین تو قوانینِ خداوندی کی عملاً تنفیذ ہو اور اس مقصد کے حصول میں ان لوگوں کو شریک کر لیا جائے جو خود اس مقصد ہی کے خلاف ہوں؟

غیر مسلموں سے حسنِ سلوک

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ غیر مسلموں کو اسلامی مملکت میں کوئی حقوق حاصل نہیں ہوں گے۔ انہیں وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جنہیں قرآنِ کریم انسانوں کے لئے بنیادی حقوق قرار دیتا ہے۔ ان کی جان، مال، عزّت عبادت گاہیں سب محفوظ ہوں گی۔ انہیں شخصی مذہب کی آزادی ہوگی۔ ان سے حسنِ سلوک کیا جائے گا۔ (۶۰/۸) ان سے ہر حال میں عدل کیا جائے گا۔ (۵/۸) حقیقت یہ ہے کہ ایک لحاظ سے یہ مسلمانوں سے بھی زیادہ فائدہ میں رہیں گے کہ گائے کے سینگ مسلمانوں کے سپرد ہوں گے اور اس کے دودھ میں یہ غیر مسلم بھی حصّہ دار ہوں گے۔ دشمن حملہ آور ہوگا تو مسلمان نوجیں اپنے سینوں پر گولیاں کھا کر غیر مسلموں کی پرستش گاہوں کی حفاظت کریں گی۔ (۲۲/۴۰)۔

اگر ترکِ وطن کرنا چاہیں

ان تمام مراعات کے باوجود، اگر غیر مسلم ترکِ وطن کرنا چاہیں تو انہیں ان کے مامن تک بحفاظت پہنچانے کا انتظام اسلامی مملکت کے ذمّہ ہوگا۔ قرآن میں ہے:۔

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ۔ (۹/۶)

اور اگر مشرکین میں سے کوئی تمہارے پاس پناہ لے تو اسے پناہ دو، یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سُن لے۔ پھر (اگر وہ کہیں اور جانا چاہے تو) اسے اس کے امن کی جگہ تک پہنچا دو۔ یہ اس لئے کہ یہ لوگ یہ بات سمجھتے نہیں (کہ قرآنِ کریم کے ماتحت زندگی بسر کرنے سے کیا کیا فوائد حاصل ہوتے ہیں)۔

لیکن اگر وہ اسلامی مملکت میں رہتے ہوئے اس کے آئین سے سرکشی برتیں تو انہیں بغاوت کی سزا ملے گی۔ (۵/۳۳-۳۴) بغاوت کی سزا مسلم اور غیر مسلم سب کے لئے یکساں ہے۔

لہٰذا اسلامی آئین کی ایک شق یہ ہوگی کہ

مملکت میں بسنے والے غیر مسلم، امورِ مملکت میں شریک نہیں کئے جا سکیں گے، کیونکہ وہ اسلامی آئین کو تسلیم نہیں کرتے اور اس وجہ سے مسلم قوم کے افراد نہیں بننا چاہتے لیکن ان لوگوں کو تمام بنیادی

حقوقِ انسانیت حاصل ہوں گے۔ ان کی جان، مال، آبرو، پرستش گاہیں محفوظ رہیں گی۔ انہیں شخصی مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ ان سے عدل و انصاف کرنے میں ان میں اور مسلمانوں میں کوئی تفریق نہیں کی جائے گی۔

اس کے باوجود اگر یہ لوگ کسی ایسی مملکت کی طرف منتقل ہونا چاہیں جو انہیں اپنی طرف لبھانے پر آمادہ ہو تو اسلامی مملکت انہیں ان کے مامن تک بہ حفاظت پہنچانے کا انتظام کرے گی۔ لیکن اگر یہ مملکت کے اندر رہتے ہوئے اس کے آئین و قوانین سے سرکشی برتیں گے تو انہیں اس بغاوت کی وہی سزا دی جائے گی جو مسلمان باغیوں کے لئے مقرر ہوگی۔

باب دوازدہم

بین الاقوامیت

عالم گیر برادری

اسلامی مملکت ابتداءً ایک خاص خطۂ زمین میں قائم ہوتی ہے تاکہ یہ زمین، قوانینِ خداوندی کی عملاً نتیجہ خیزی کے لئے تجربہ گاہ بن سکے۔ اس تجربہ سے جو خوشگوار اور انسانیت ساز نتائج مرتب ہوتے ہیں وہ خطۂ زمین تک محدود نہیں رہتے۔ ان کا دائرہ پھیلتا جاتا ہے۔ اس لئے کہ یہ نظام پوری نوعِ انسان کے لئے آیۂ رحمت ہے۔ اس کا مقصدِ عظیم تمام نوعِ انسان کے باہمی اختلافات مٹا کر اسے ایک عالم گیر برادری بنانا ہے۔ خدا کی طرف سے سلسلہ رشد و ہدایت کی غرض و غایت یہی تھی اور یہی اب قرآن کا مقصود ہے۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ... (۲/۲۱۳)

تمام انسان درحقیقت ایک برادری کے افراد ہیں (لیکن یہ آپس میں اختلاف کرنے کی وجہ سے مختلف گروہوں میں بٹ گئے ہیں ۱۰/۱۹) سو اللہ نے انبیاء کو مبعوث کیا جو انہیں غلط راستوں کی

تباہیوں سے آگاہ کرنے والے اور صحیح راستے کی خوشگواری کی خوشخبری دینے والے تھے اور ان کے ساتھ اللہ نے حق کے ساتھ ضابطہ قوانین بھی بھیجا تاکہ وہ لوگوں کے اختلافی معاملات میں (حق وصداقت کے ساتھ) فیصلہ کرے (اور اس طرح انہیں پھر سے اُمّتِ واحدہ بنا دے)۔

اِنسانی مساوات

اس لئے تمام نوعِ انسان کو واضح الفاظ میں بتا دیا کہ خون، رنگ، نسل وغیرہ کے امتیازات جو اُن کے اُمّتِ واحدہ بننے کی راہ میں بُری طرح حائل ہیں، انسانوں کے خود ساختہ ہیں۔ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ۔ (۴/۱) "ہم نے تم سب کو ایک جرثومۂ حیات سے پیدا کیا" حتیٰ کہ اس میں مرد اور عورت میں بھی کوئی فرق نہیں۔ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً۔ (۴/۱) "اور اس جرثومۂ حیات سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان سے پھر کثیر تعداد میں مرد اور عورت (سطحِ ارض پر) پھیلا دیئے" پیدائش کے اعتبار سے ہر انسانی بچہ یکساں طور پر واجب التکریم ہے۔ (وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ ۱۷/۷۰)۔ اس لئے کہ ہر انسانی بچہ انسانی

احترامِ آدمیت

ذات کا حامل ہے (۳۲/۹) اسلامی مملکت کے قیام کا مقصد، ساری دنیا میں عدل کا قیام ہے۔ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (۵۷/۲۵) "تاکہ نوعِ انسان انصاف پر قائم رہے" اور قیامِ امن بھی (وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ۔ ۲/۶۰۔ دنیا میں فساد پھیلاتے ہوئے حد سے نہ بڑھو)۔ جو جماعت اس مملکت کے قیام کا باعث بنتی ہے اُسے جماعتِ

نظامِ عدل و امن

مومنین کہا گیا ہے جس کے معنی ہیں وہ جماعت جو دنیا میں قیامِ امن کی ضامن ہو۔ اس نظام کے دوام و استمرار کے لئے یہ اصول بتایا گیا کہ

وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ۔ (۱۳/۱۷)

اور جو چیز تمام نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہوتی ہے اسے ہی زمین میں بقا نصیب ہوتی ہے۔

ربوبیتِ عالمینی

اسی لئے "ربوبیتِ عالمینی" — تمام نوعِ انسان کی نشوونما — اس نظامِ خداوندی کا مقصود بتایا گیا۔ (۱/۲)

ان مقاصد کے حصول کے لئے دنیا کی جو قومیں کسی قسم کی کوشش کریں گی، یہ مملکت ان سے تعاون کرے گی۔ اس کے خلاف اقدامات میں وہ کسی سے تعاون نہیں کرے گی۔ (وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۵/۲)۔ یہ مملکت اپنے تجربہ کے درخشندہ

نتائج کی روشنی میں، ان مقاصد کو عام کرتی جائے گی تا آنکہ

وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا ــ (۳۹/۶۹)

زمین اپنے نشو و نما دینے والے کے نور سے جگمگا اُٹھے گی۔

لہٰذا اس آئین کی ایک بنیادی شق یہ ہوگی کہ

اس مملکت کے قیام کا منتہیٰ یہ ہے کہ

۱ نوعِ انسان کے موجودہ اختلافات کو مٹا کر انہیں ایک عالمگیر برادری (امّتِ واحدہ) کی لڑی میں پرو دیا جائے۔ اس کی عملی تشکیل کے لئے ضروری ہے کہ تمام انسانوں کا ضابطۂ حیات اور نظامِ زندگی ایک ہو اور یہ ظاہر ہے کہ یہ ضابطۂ حیات، خدا کے عطا فرمودہ ابدی اصولوں کے سوا اور کون سا ہو سکتا ہے۔

۲ دنیا میں امن اور عدل کا نظام قائم کیا جائے جو انسانی مساوات اور احترامِ آدمیت کے اصولوں پر مشتمل ہو

۳ ساری دنیا میں خدا کے نظامِ ربوبیت کو رائج کیا جائے تاکہ ہر فرد کی جسمانی پرورش اور اس کی ذات کی نشو و نما کا اطمینان بخش انتظام ہو۔

۴ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے، ان کے ماحصل کو نوعِ انسان کی منفعت کے لئے عام کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے پاکستان کی سرزمین کو تجربہ گاہ بنایا جائے تاکہ اسلامی آئین اور نظام کے درخشندہ نتائج دنیا کے سامنے آسکیں اور اس طرح اقوامِ عالم اس نظام کو علیٰ وجہ البصیرت قبول کر لیں۔ جو اقوام ان بلند مقاصد کے حصول میں کوئی عملی اقدامات کریں گی، انہیں مملکتِ پاکستان کا تعاون حاصل ہوگا۔

حرفِ آخر

یہ ہیں اس آئین کے بنیادی اُصول جنہیں قرآنِ کریم، اسلامی مملکت کا اساسی ضابطہ قرار دیتا ہے۔ اس آئین کے سوا کوئی اور آئین میزانِ خداوندی میں قابلِ قبول قرار نہیں پا سکتا۔ اس لئے کہ یہ آئین ان

اصولوں پر مبنی ہے جن کے مطابق کائنات کی یہ کارگہِ عظیم اس حسن و خوبی سے سرگرمِ عمل ہے۔ قرآن میں ہے: اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ۔ کیا یہ لوگ اللہ کے دین کے علاوہ کوئی اور ضابطۂ حیات اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا۔ (۳/۸۲) "کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب طوعاً و کرہاً اس کے قوانین کے سامنے سجدہ ریز ہے"۔ انسان کو اس کا تو اختیار ہے کہ وہ جی چاہے تو خدا کے قوانین کو بطورِ ضابطہ زندگی اختیار کرے اور چاہے تو اپنے خودساختہ قوانین کے تابع زندگی بسر کرے، لیکن اسے اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ

مَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِى الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (۳/۸۴)۔

جو کوئی الاسلام کے علاوہ کوئی اور دین اختیار کرنا چاہتا ہے تو اس کا وہ دین (آئین) میزانِ خداوندی میں قابلِ قبول نہ ہوگا اور وہ آخر الامر دیکھ لے گا کہ وہ کس قدر نقصان میں رہا۔

یہ آئین قرآنِ کریم کی دفتین میں محفوظ ہے۔ لہٰذا اسلامی مملکت کا ضابطۂ حیات، قرآن کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا، نہ ہی اس مملکت میں کوئی ایسا نظریہ، تصوّر یا قانون بار پا سکتا ہے جو قرآنی اصولوں کے خلاف ہو۔

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِىْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِىْۤ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ۗ وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ (۶/۱۱۵)

کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور حاکم تلاش کروں، حالانکہ اس نے تمہاری طرف ایک واضح ضابطۂ قوانین نازل کر دیا ہے۔ جن لوگوں کو ہم نے یہ کتاب دی ہے، وہ جانتے ہیں کہ وہ تیرے ربّ کی طرف سے حق کے ساتھ نازل کی گئی ہے۔ سو تو اس باب میں جھگڑا کرنے والوں میں سے مت ہو۔

اس آئین کے اصول ہر طرح سے مکمل ہیں اور ان میں کوئی تغیّر و تبدّل نہیں ہو سکتا۔

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (۶/۱۱۵)

اور تیرے ربّ کی بات صدق وعدل کے ساتھ مکمل ہو گئی۔ اس کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں۔
وہ سب کچھ سُننے والا اور جاننے والا ہے۔

یہی آئین خدا کی ابدی حقیقتوں پر مبنی ہے۔ اس کے علاوہ، انسانوں نے جو آئین وضوابط بھی مرتّب کئے ہیں وہ ظن وقیاس پر مبنی ہیں؛ خواہ ان کے متبعّین کی تعداد کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو۔ ملّتِ اسلامیہ خدا کے دیئے ہوئے الدّین کے سوا کسی اور کا اتّباع نہیں کر سکتی۔

وَإِنْ تُطِعْ أَكْثَرَ مَنْ فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ ۚ إِنْ يَتَّبِعُونَ
إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ (۶/۱۱۷)

اگر تو ان لوگوں کی بات ماننا جائے جو دنیا میں اکثریّت میں ہیں؛ تو تجھے اللہ کی راہ سے گمراہ کر دیں گے۔ وہ (خود) ظنّ وتخمین کا اتّباع کرتے ہیں اور محض اٹکلیں دوڑاتے ہیں۔
(اس لئے ان کے پیچھے لگنے والے بھی اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہتے ہیں)۔

اس لئے آئینِ خداوندی کو چھوڑ کر دیگر اقوام کے آئین وضوابط کا اتّباع کرنا، مسلمان کا شیوہ نہیں ہو سکتا۔ دوسری اقوام کے تجربوں سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے لیکن ان کے ہاں کی کوئی ایسی چیز قبول نہیں کی جا سکتی جو قرآن کے آئین اور نظام کے خلاف ہو۔ اسلامی آئین کی اصل و بنیاد صرف خدا کی کتاب ہے۔ فَهَلْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ —— (۲۱/۱۰۸)۔